مشاہیر ادبیات مشرقی

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مشاہیر ادبیات مشرقی

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغِ اردو بھون، F.C.33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی ہلی۔110025

پیش لفظ

افراد و اجتماع کی ترقی آگہی اور معلومات سے مشروط ہے اور آگہی کے تمام دروازے کتابوں کے ذریعے ہی کھلتے ہیں۔ کتابیں ہمیں روشنی کی ایک نئی دنیا سے روشناس کراتی ہیں اور ہمارے احساس و اظہار کو تحریک عطا کرتی ہیں۔ مگر صارفی معاشرت نے ہماری ترجیحات بدل دی ہیں۔ کتابوں سے ذہنوں کا رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی وجہ سے متبادل قرأت کی ایک نئی صورت جنم لے رہی ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مطبوعہ کتابوں کی معنویت کم نہیں ہوئی بلکہ کتابیں ہمیشہ زندہ رہیں گی کیونکہ مطبوعہ کتابوں کے لمس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ای بکس نے گو کہ قاری کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا ہے مگر مطبوعہ کتابوں سے آج بھی دنیا کی بڑی آبادی کا رشتہ قائم ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ حسب سابق جاری و ساری ہے۔

علمی اور تہذیبی ورثے کا تحفظ ہمیشہ سے ایک اہم مسئلہ رہا ہے اور ہمارے ارباب نظر نے اس کے تحفظ کے لیے مختلف صورتیں بھی نکالی ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے علمی اور تہذیبی وراثت کے تحفظ کے لیے مختلف علوم و فنون کی نہ صرف کتابیں شائع کی ہیں بلکہ ''ای کتاب'' کے ذریعے بھی اس کے تحفظ کی ایک نئی صورت نکالی ہے۔ قومی اردو کونسل نے جہاں

لسانیات، ادبیات، تکنیکی وسائنسی علوم، ریاضیات، شماریات اور دیگر علوم کی فرہنگ واصطلاحات، کلاسیکی ادب پاروں، نادر ونایاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ قائم رکھا ہے وہیں ''ای کتاب'' اور ''ای لائبریری'' کے ذریعے اہم کتابوں کے تحفظ کی بھی کوشش کی ہے۔ کونسل نے ذولسانی (اردو اور انگریزی) ایپ ''ای کتاب'' تیار کیا ہے جس میں گلوبل لینگویج سپورٹ کے علاوہ انٹریکٹو فہرست کے ذریعے مطلوبہ باب تک رسائی اور الفاظ کے معانی دیکھنے کی سہولت بھی موجود ہے۔ کونسل سے شائع شدہ اہم کتابیں اس کی ویب سائٹ [ای لائبریری] پر موجود ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ کونسل کی اہم مطبوعات سے استفادہ کرسکیں۔ قومی اردو کونسل نے کم قیمت پر اردو زبان وادب کا سرمایہ شائقین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اور کونسل اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہے کہ اس کی کتابیں صرف برصغیر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ کونسل ترجیحی طور پر ان کتابوں کی اشاعت کرتی ہے جس کے ذریعے ہم حیات وکائنات کے رموز واسرار، آداب زندگی اور قرینہ اظہار سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔

یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اساتذہ اور طلبا کے علاوہ عام قارئین کے لیے بھی بے حد مفید ثابت ہوگی۔

شیخ عقیل احمد

ڈائرکٹر

فہرست

●	مقدمہ	XVII
	باب اول: اردو شعرا	1
	موضوع کا تعارف	1
1	امیر خسرو	2
2	محمد قلی قطب شاہ	4
3	ولی دکنی	5
4	سراج اورنگ آبادی	6
5	مرزا محمد رفیع سودا	8
6	خواجہ میر درد	10
7	میر تقی میر	11
8	میر حسن	14
9	نظیر اکبر آبادی	16
10	شیخ غلام حمدانی مصحفی	18

11	انشاءاللہ خان انشاء	20
12	آتش	21
13	ذوق	23
14	امام بخش ناسخ	24
15	مرزا غالب	26
16	مومن خاں مومن	29
17	میر انیس	31
18	مرزا دبیر	33
19	امیر مینائی	34
20	مرزا داغ دہلوی	36
21	حالی	38
22	اکبر الہ بادی	40
23	اسماعیل میرٹھی	42
24	شاد عظیم آبادی	44
25	ریاض خیر آبادی	46
26	صفی لکھنوی	47
27	آرزو لکھنوی	48
28	علامہ اقبال	49
29	مولانا حسرت موہانی	53
30	فانی بدایونی	55
31	اصغر گونڈوی	57
32	جگر مرادآبادی	58
33	جمیل مظہری	60

34	جوش ملیح آبادی	61
35	فراق گورکھپوری	64
36	فیض احمد فیض	66
37	مجروح سلطان پوری	69
38	مخدوم محی الدین	71
39	پرویز شاہدی	72
40	روش صدیقی	74
41	مجاز لکھنوی	75
42	معین احسن جذبی	77
43	احسان دانش	78
44	جانثار اختر	79
45	ساحر لدھیانوی	80
46	ماہر القادری	81
47	نعیم صدیقی	82
48	کلیم احمد عاجز	83
49	حفیظ میرٹھی	85
50	شکیل بدایونی	85
	باب دوم: اردو کے ادیب اور نثر نگار	89
	موضوع کا تعارف	89
51	مرزا غالب	90
52	سرسید احمد خان	91
53	محسن الملک	92
54	چراغ علی	93

55	محمد حسین آزاد	94
56	الطاف حسین حالی	95
57	نذیر احمد	96
58	پریم چند	96
59	ذکاءاللہ	97
60	علامہ شبلی	98
61	سید سلیمان ندوی	99
62	سجاد انصاری	101
63	مہدی افادی	101
64	ظفر علی خاں	102
65	مولانا عبدالماجد دریابادی	103
66	قاضی عبدالغفار	104
67	خواجہ حسن نظامی	105
68	ابوالکلام آزاد	106
69	ڈاکٹر عابد حسین	107
70	مسعود حسن رضوی	108
71	آغا حشر کاشمیری	109
72	امتیاز علی تاج	110
73	پروفیسر محمد مجیب	111
74	قاضی عبدالودود	111
75	مختارالدین آرزو	113
76	مولوی عبدالحق	114
77	نیاز فتح پوری	116

78	مجنوں گورکھپوری	117
79	کلیم الدین احمد	118
80	اختر اورینوی	120
81	خواجہ احمد فاروقی	121
82	احتشام حسین	121
83	آل احمد سرور	123
84	رشید احمد صدیقی	124
85	عبدالحلیم شرر	125
86	عزیز احمد	127
87	قرۃ العین حیدر	129
88	نسیم حجازی	131
89	نعیم صدیقی	134
90	مولانا ماہر القادری	135
	مراجع باب اول و دوم	137
	باب سوم: عربی ادب کے شعرا	139
	موضوع کا تعارف	139
91	امرأ القیس	141
92	حضرت کعب بن زہیر	142
93	لبید بن ربیعہ	144
94	حضرت خنساء	145
95	حضرت حسان بن ثابت	146
96	عمرو بن ربیعہ	149
97	اخطل	150

98	فرزدق	152
99	جریر	154
100	حطیئہ	156
101	بشار بن برد	157
102	ابوالعتاہیہ	158
103	ابونواس	159
104	ابن الرومی	161
105	ابوتمام	162
106	ابوعبادہ بحتری	163
107	متنبّی	164
108	ابوفراس ہمدانی	167
109	ابن المعتز	168
110	شریف رضی	170
111	طغرائی	171
112	ابوالعلاء معری	172
113	ابن زیدون	174
114	ابن الفارض	175
115	محمود سامی بارودی	178
116	امیر الشعرا احمد شوقی	179
117	اسماعیل صبری	181
118	حافظ ابراہیم	182
119	ابوالقاسم الشابی	183
120	جمیل صدقی زہاوی	185

121	معروف الرصافی	187
122	عبدالرحمٰن شکری	188
123	عمر وابوریشہ	189
124	احمد زکی ابوشادی	190
125	عبدالوہاب البیاتی	191
126	الیاس ابوشبکہ	192
127	ایلیا ابوماضی	194
128	بدر شاکر السیاب	195
129	محمود غنیم	197
130	رشید سلیم الخوری	198
131	نزار قبانی	199
132	نازِک الملائکہ	201
	باب چہارم: عربی ادب کے مشہور نثر نگار	203
	موضوع کا تعارف	203
133	سحبان بن وائل	205
134	حجاج بن یوسف	205
135	عبدالحمید بن یحییٰ	207
136	ابن مقفع	207
137	ابوعثمان جاحظ	209
138	صاحب بن عباد	211
139	ابن العمید	212
140	بدیع الزماں ہمدانی	212
141	ابومحمد ابوالقاسم الحریری	214

142	ابوالفرج اصفہانی	214
143	ابن عبدربہ	215
144	جمال الدین افغانی	216
145	شیخ محمد عبدہ	218
146	مصطفیٰ لطفی منفلوطی	219
147	مصطفیٰ صادق الرافعی	221
148	احمد لطفی سید	223
149	محمد کرد علی	224
150	احمد امین	225
151	عباس محمود العقاد	227
152	امیر شکیب ارسلان	228
153	محمد حسین ہیکل	230
154	ڈاکٹر طٰہٰ حسین	231
155	توفیق الحکیم	233
156	نجیب محفوظ	235
مراجع	**باب سوم و چہام**	237
	باب پنجم: فارسی زبان کے شعرا	239
	موضوع کا تعارف	239
157	رودکی سمرقندی	240
158	دقیقی	242
159	عنصری	242
160	فرخی	243
161	منوچہری	245

162	فردوسی	246
163	حکیم سنائی	247
164	فریدالدین عطار	249
165	اسدی	249
166	ناصرخسرو	250
167	قطران	251
168	مسعودسعدسلمان	251
169	عمرخیام	252
170	انوری	255
171	نظامی	256
172	جمال اصفہانی	257
173	خاقانی شیروانی	259
174	سعدی شیرازی	260
175	امیرخسرو	264
176	حافظ شیرازی	265
177	جامی	268
178	عرفی شیرازی	269
179	نظیری نیشاپوری	271
180	طالب آملی	272
181	ابوطالب کلیم	274
182	جلال الدین رومی	275
183	علامہ اقبال	276
184	گلچین گیلانی	278

	باب ششم : فارسی کے ادیب اور نثر نگار	281
	موضوع کا تعارف	281
185	ابوالحسن قزوینی	282
186	شیخ ابوسعید	282
187	شیخ فریدالدین عطار	282
188	ابوسعید عبدالحئ بن ضحاک	283
189	ابوالفضل بیہقی	283
190	ابوالحسن علی بن زید بیہقی	283
191	ابوبکر محمد راوندی	284
192	خواجہ ابوالعلی حسن بن علی نظام الملک طوسی	284
193	امیر کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس	285
194	امام غزالی	285
195	ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید	285
196	ابوالحسن احمد سمرقندی	286
197	رشیدالدین محمد وطواط	286
198	حمیدالدین ابوبکر بن محمود	287
199	منشی سعدالدین وراوینی	287
200	شیخ سعدی شیرازی	287
201	علاءالدین عطا ملک جوینی	288
202	ابوبکر عثمان منہاج الدین	288
203	حکیم نصیرالدین طوسی	288
204	شرف الدین یحییٰ منیری	289

205 شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی 290
206 بزرگ علوی 291
مراجع 292

مقدمہ

کتاب ''مشاہیر ادبیات مشرق'' پیش خدمت ہے، اردو، عربی اور فارسی تین زبانوں کے ادب کے مشاہیر پر یہ کتاب مشتمل ہے، ہر زبان کے ادب کے دو حصے کیے گئے ہیں: شاعری اور نثر۔ عربی لغت میں ادب کے ایک معنی یہ بھی بیان کیے گئے ہیں ''اخذ الشئ من کل طرف''، یعنی کسی چیز کو ہر جانب سے لینا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مشرق کا رہنے والا صرف ایک زبان اور اس کے ادبا و شعرا کو جانتا ہے تو یہ کافی نہیں، اسے دیگر مشرقی زبانوں کے مشہور شاعروں اور ادیبوں سے بھی واقف ہونا چاہیے، یعنی ادب کے مفہوم میں ایک طرح کی جامعیت اور شمول کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے، اس لیے ایک مشرقی ملک کے رہنے والے ادیب اور صاحب قلم کو کم از کم مشرقی زبانوں کے ادب سے تو واقف رہنا ہی چاہیے۔ اسی طرح سے جو شخص انگریزی ادب کا طالب علم اور معلم ہے اسے ادبیات مغربی سے واقف ہونا چاہیے اور ایک کتاب اسی نہج پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی ادب کے بارے میں سامنے آنی چاہیے۔ ادب کے طالب علم کو ادب کے بارے میں وسیع المطالعہ ہونا چاہیے۔

ادب عربی زبان کا لفظ ہے، ''الأدب الکبیر'' اور ''الأدب الصغیر'' مشہور ادیب ابن مقفع کی مشہور کتابیں ہیں، جس نے کلیلہ ودمنہ کا فارسی زبان سے ترجمہ کیا تھا، اسی طرح سے ابن قتیبہ کی

ایک کتاب کا نام ''ادب الکاتب'' ہے، عربی میں ادب کا لفظ پہلے پسندیدہ اخلاقی روش کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، بعد میں یہ لفظ علوم وافکار کے لیے استعمال ہونے لگا، کیونکہ انھیں سے انسان زیور اخلاق سے بھی آراستہ ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ تقریر وتحریر کا فن ادب کا ہم معنی لفظ بن گیا۔

ادب کو انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں، لیکن لفظ ادب میں شرافت واخلاق اور شائستگی کا مفہوم بھی شامل ہے، انگریزی کے لفظ لٹریچر کے اندر یہ بات نہیں ہے، یعنی عربی کے لفظ ادب کے لحاظ سے وہی ادب عظیم ادب کہلانے کا مستحق ہے جس کا مضمون بھی مؤدب ہو اور پیرایۂ اظہار بھی۔ یعنی ادب وہی ہے، جس میں ہر اعتبار سے ادب اور سلیقہ پایا جائے گا۔ آج کے زمانے میں بھی ادب کی شناخت دو چیزوں کے حوالے سے کی جاتی ہے، ایک قدر اور دوسرے سماج اور معاشرہ اور جب ادب کے سلسلہ میں سماج کا لفظ بولا جاتا ہے، تو ایک دوسری بحث بھی چھڑ جاتی ہے کہ ادب کا مقصد کیا ہے، صرف ذاتی خوشی اور تسکین اور تفریح طبع یا اس کے ساتھ معاشرے کو اخلاقی اقدار کا پابند بنانا بھی ادب کا مقصد ہے۔ علامہ اقبال کا میلان معاشرے کو مثالی بنانے کی طرف ہے۔ وہ کہتے ہیں ''شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم'' بہت سے بڑے دانشوروں نے بھی اسی طرح کی باتیں کی ہیں، جیسے کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ بھی ہو اور مستقبل کا اشاریہ بھی ہو۔

ادب کی دو قسمیں کی گئی ہیں، نظم اور نثر۔ کسی زبان کے ادب پاروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ نظم کی تخلیق کسی زبان میں پہلے ہوتی ہے اور نثر کی تخلیق بعد میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری کا تعلق جذبات واحساسات سے ہے اور یہ پہلے سے موجود ہوتے ہیں، احساس جب لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے تو وہ شعر ہوتا ہے کسی شعر میں اگر احساس نہ ہو تو وہ شعر نہیں ہے چاہے وہ وزن اور قافیہ کے اعتبار سے شعر ہو یہی وجہ ہے کہ شعر انسانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے بعض ناقدین اور شعرا نے جذبات کے ساتھ فکر کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے لیکن شعر میں جذبہ کو اساسی حیثیت حاصل ہے اسی لیے شعر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے ''جو جذبات واحساسات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں وہ شعر ہیں'' شعر کی تعریف اس طرح بھی کی گئی ہے جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے انگریزی کا مشہور شاعر ورڈس ورتھ کی رائے بھی یہی

ہے وہ کہتا ہے زوردار جذبات کے باہر نکل آ کر بہنے کو شعر کہتے ہیں شعر میں احساس اور ادراک دونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ شعر عربی زبان کا لفظ ہے یہ جب فعل Verb ہوتا ہے تو اس کا ماضی اور مضارع ''شعر یشعر'' ہوتا ہے جس کا مطلب ہے محسوس کرنا، اس کا مصدر شعور ہے اور شاعر اسم فاعل ہے جس کا مطلب ہے محسوس کرنے والا اور شاعر کو شاعر اس لیے کہتے ہیں اس کے اندر احساس کی صفت دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے، ایک عام انسان پر پھولوں کو، ستاروں کو، طلوع آفتاب کے منظر کو، شفق کے رنگ کو دیکھ کر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی ہے جو ایک شاعر پر طاری ہوتی ہے، شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح انسانی سماج میں جو غم انگیز اور خون ریز حادثات پیش آتے ہیں اس کا سوز غم جس قدر شاعر کو ہوتا ہے وہ دوسروں کو نہیں ہوتا ہے، لیکن شاعر بننے کے لیے اس قدر کافی نہیں، اسے زبان پر قدرت بھی ضروری ہے اسے خیال کو بحر اور وزن کے سانچہ میں ڈھالنے کا ملکہ بھی آنا چاہیے کیونکہ وزن اور قافیہ سے شعر میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تمام صفتیں جس شخص میں پائی جائیں وہ شاعر ہے۔ اس لیے شاعر آسمان کے نیچے غیر معمولی ہستی ہے، وہ دردمند ہوتا ہے، وہ فکرمند ہوتا ہے، اس کے فکر ارجمند میں تخیل کی رعنائی ہوتی ہے اور اس کی زبان ہوشمند کو لفظوں کو موتی کی طرح پرونے کا سلیقہ آتا ہے اور اس کی کاوش کا نتیجہ غزل یا نظم گویا موتیوں کا ہار ہے، اور یہ موتیوں کا ہار ایک حساس فنکار کا شاہکار ہے۔ بندش الفاظ کا درجہ موتی پرونے اور ہیرے جڑنے کی طرح ہے کیونکہ لفظوں کے انتخاب اور ترتیب میں شاعر کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے، اس سے اشعار میں نغمگی پیدا ہوتی ہے، شاعر لفظوں سے رنگ بھی بھرتا ہے مثلاً جب وہ شبنم کے قطروں کو موتی کہتا ہے تو گویا وہ تصویر کشی کرتا ہے جسے امیجری یا پیکر تراشی کہتے ہیں، شاعری بھی مرصع سازی ہے اس میں تاثیر بھی اور صفت تسخیر بھی ہے نغمگی پیکر تراشی استعارہ اور تشبیہ اور صنائع اور بدائع کا استعمال شعر کو آبدار بناتا ہے، اس کے اثرات دور تک اور دیر تک باقی رہتے ہیں۔ اس طرح ایک فنکار شاعر دوسروں کو اپنے احساسات میں شریک کر لیتا ہے، اس کا جذبہ دل پھیل کر کے ہزاروں انسانوں کا جذبہ دل بن جاتا ہے۔ ہزاروں انسان وہی بات محسوس کرنے لگتے ہیں جو شاعر محسوس کرتا ہے، اس کی دل کی دھڑکن ہزاروں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بن جاتی ہے اور اس کا پیغام یا زاویہ نظر کئی نسلوں تک باقی رہتا ہے۔ اس طرح شاعر کو

بقائے دوام کی خلعت مل جاتی ہے۔

اردو شاعری نے بتدریج ترقی کی۔قصیدہ اور غزل اگر چہ ابتدا سے موجود تھی قصیدہ میں جھوٹی خوشامد اور جھوٹی تعریف ہوتی تھی اور غزل میں صرف عشقیہ مضامین، بتدریج شاعری کے موضوعات میں اضافے ہوئے حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھی یہ بھی سرسید کا اثر تھا اور سرسید اسے اپنے لیے باعث نجات سمجھتے تھے کیونکہ ان کی خواہش اور فرمائش پر یہ طویل نظم لکھی گئی تھی اور آج بھی اسکول اور مدرسوں کے طلبہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اسے بار بار پڑھنا چاہیے، اس کے بعد اقبال آئے اور انھوں قوم کو جگانے والی شاعری کی اور شاعری کو ترقی دی۔

شاعری کے مقابلہ میں نثر کا تعلق افکار ونظریات اور خیالات سے زیادہ ہے، نثر میں دلائل بھی ہوتے ہیں، نثر تمدن کی ترقی کے بعد وجود میں آتی ہے، اگر چہ اچھی شاعری کی ہیئت میں بھی فکر وخیال کا لزوم ہوتا ہے، اچھی نثر کے بھی دو اجزا ہیں، خیال اور بیان۔بحیثیت مجموعی ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا، ادب ایک سورج ہے جس میں روشنی بھی ہے اور حرارت بھی ہے، چمک دمک اور حرارت دونوں کا ہونا ادب کے لیے ضروری ہے، چمک دمک کا تعلق فن سے ہے اور صناعی سے ہے اور حرارت کا تعلق ادیب اور شاعر کے دل اور دماغ سے ہے۔ادب دائمی قدروں کے ابلاغ وترسیل کا بہترین ذریعہ ہے۔یہ دائمی قدریں مذہبی اخلاقی اور انسانی بھی ہوسکتی ہیں۔خود دین اسلام عقیدہ وعمل کی جمالیات کا نام ہے۔اس نے حسن وجمال پر زور دیا ہے جس سے ذوق کی پاکیزگی اور نفاست پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ کہا گیا ہے: ''ان اللہ جمیل ویحب الجمال''، یعنی اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، ستاروں کو تابندگی اور چاند اور سورج کو رخشندگی اور پھولوں کو شگفتگی دینے والی ہستی کا انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ ان کے کردار اور گفتار دونوں میں حسن اور سلیقہ پایا جائے ادب گفتار کے اسی سلیقہ کا نام ہے، اس لیے نثری ادب میں صرف مضمون میں نہیں بلکہ ہیئت اور شکل میں بھی مناسب طریقہ سے صنائع اور بدائع کے ذریعہ آرائش اور زیبائش اختیار کی جاسکتی ہے، ہیئت اور اسلوب کو نظر انداز کر دینا ذوق ادب کی خلاف ورزی ہے۔نثر میں وعظ وتذکیر کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن جب تک وہ فن کی شرطیں نہ پوری کرتا ہو وہ ادب نہیں ہوسکتا ہے۔قرآن مجید خود فصاحت وبلاغت کے اعجاز کا نمونہ ہے وہ فن

اورادب کا بہت اونچا معیار ہے، اس لیے نثر نگار ادیب کی ذمہ داری بھی زبان و بیان کی درستی اور فن کی چابک دستی کے اعتبار سے دوسروں سے کہیں زیادہ ہے، جہاں تک موضوع اور مضمون کا تعلق ہے وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ادیب جو لکھے وہ حیات آمیز ہو اور حیات افروز ہو، اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا تذکرہ ہوسکتا ہے اس میں ذکر چاند کا بھی ہوگا ستاروں کا بھی، پھولوں کا بھی چشم غزال کا بھی، حور کا بھی اور شراب طہور کا بھی رنگ ونور کا بھی، آب انگور کا بھی، یوسف کا بھی اور زلیخا کا بھی، خودی کا بھی اور خدا کا بھی، علمی، تحقیقی، تنقیدی، تاریخی دینی، اصلاحی، تفریحی، طنزیہ مزاحیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ تمام اصناف سخن نثری ادب کے دائرہ میں آتے ہیں بس یہ ضروری ہے کہ ان سے معاشرہ میں خیر کے اقدار کا فروغ ہو اور اگر ادب سے شر کے اقدار کا فروغ ہوتا ہو تو اس میں ادب کم اور بے ادبی زیادہ ہے۔ ادب میں موضوع کی کوئی شرط نہیں ہے، ہر تحریر ادب کے دائرہ میں داخل ہوسکتی ہے خواہ اس کا کوئی موضوع ہو بشرطیکہ وہ تحریر ادب کی شرطیں پوری کرتی ہو اور یہ کہ اس میں خدا اور مذہب کے ساتھ شوخیاں نہ ہوں اور اس کے ذریعہ بے حیائی نہ پھیلائی جائے اور کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ادیب کا منصب دل بدست آوری ہے نہ کہ دل آزاری۔ بے حیائی پھیلانے والے ادب کو اگر ادب مان بھی لیا جائے تو وہ تخریب پسند ادب ہوگا۔ ایک تعمیر پسند ادیب کا کام فن کی شرطیں پوری کرنا ہوتا ہے خواہ موضوع کچھ بھی ہو، وہ ناول اور افسانہ بھی لکھے گا تو اس کا کام نظریاتی قبلہ کو درست کرنا ہوگا لیکن زاہد خشک اور محتسب بن کر نہیں وہ اپنی بات کو فن کے لباس حریر میں پیش کرے گا اس میں اسے استاد کا کم اور خیر خواہ دوست کا رول زیادہ ادا کرنا ہوگا اس کے لیے اسے حکیمانہ اور متصوفانہ وسیع النظری بھی درکار ہوگی، اس کی تخلیقات میں قاضی کے فیصلہ کی قطعیت یا مفتی کے فتوی کی یبوست نہ ہوگی۔ تخلیقی ادب میں مثال کے طور پر شعر وافسانہ میں ادیب کے کہنے کا انداز اور اثر انداز ہونے کا طریقہ زاہد خشک اور شیخ دونوں سے الگ ہوتا ہے۔ وہ خاموشی سے دل کو جیتنے کی کوشش کرتا ہے وہ گیسوئے جاناں بن کر شوق کی الجھن کو بڑھاتا اور شمیم گل بن کر مشام جاں کو معطر کرتا ہے، وہ تیز روی سے کام نہیں لیتا ہے وہ تلوار نہیں اٹھاتا ہے وہ سوشل ورکر اور رفارمر کا رول بھی ادا نہیں کرتا ہے بلکہ وہ فن کے ذریعہ تعمیری ذہن اور دل گداختہ پیدا کرتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی اہم ہے کہ ادب کا مقصد کیا ہے؟ ادب برائے ادب ہے، ادب برائے لطف وانبساط ہے، ادب برائے تعمیر ہے، ادب برائے زندگی ہے۔ ادب تنقید حیات ہے، بہت سے زاویہ نظر ہیں جو پیش کیے گئے ہیں۔ میرے خیال سے کسی بامقصد انسان کی توہین ہے کہ وہ کسی چیز کو بے مقصد گردانے یا کسی چیز کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھے اگر ایک زندگی بے معنی اور بے مقصد نہیں ہوسکتی ہے تو ادب بھی بے مقصد نہیں ہوسکتا ہے اور اسے بے مقصد نہیں ہونا چاہیے خاص طور پر اس لیے کہ ادب بہت مؤثر اور طاقتور ہتھیار ہے یہ ایک تلوار ہے جو افکار وخیالات کی کاٹ کرتی ہے۔ چونکہ انسانی زندگی میں تعمیر وتخریب دونوں کے محرکات پائے جاتے ہیں اس لیے ادب کے میدان میں بھی تعمیر کے محرک سے رشتہ قائم کرنا ضروری ہوتا ہے، اچھے اور اخلاقی نظریات سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے یہ تعمیری نظریہ ہے جو زندگی کے طوفان میں اور سمندر کی موجوں میں کشتی کو سلامت رکھتا ہے۔ زندگی ایسا سمندر ہے جس میں مہیب اور خطرناک طوفان اٹھتے ہیں اس میں کشتیاں ڈوبتی بھی ہیں اور سلامتی کے ساتھ ساحل تک پہنچتی بھی ہیں اس میں سفینہ گرداب پھنس کر ڈوبتا بھی ہے اور اس سفینہ کے ذریعہ قعر دریا سے موتی بھی برآمد کیے جاتے ہیں اس میں موافق اور مخالف دونوں طرح کی ہوائیں چلتی ہیں تعمیری اور اخلاقی نظریات زندگی کے سفینہ کو ساحل نجات تک پہنچاتے ہیں اس لیے ادب کو بے مہار نہیں ہونا چاہیے اسے تخریب کا علم بردار نہیں ہونا چاہیے، متضاد عوامل کی کشمکش میں اسے ان قوتوں کا ساتھ دینا چاہیے جو نقصان پہنچانے والی نہ ہوں۔ چونکہ اس دنیا میں تعمیر وتخریب خوب وناخوب دونوں ایک دوسرے سے ستیزہ کار اور برسر پیکار رہتے ہیں۔ ادب اس سنگھرش میں تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا، ادیب اور فنکار جو بھی سپر دقرطاس کرے گا اس کی عمر ادیب کی اپنی عمر سے بھی زیادہ دراز ہوگی، حال اور مستقبل کی نسل کو یہ جائزہ لینے کا حق ہوگا کہ ادیب نے اس کشمکش اور سنگھرش میں حق کا ساتھ دیا تھا یا باطل کا خیر اور حسن کی حمایت کی تھی یا شر اور بدی کی۔

اردو ادب نے عربی اور فارسی ادب سے استفادہ کیا ہے اردو ان دونوں کے تنقیدی نظریات کی وارث ہوئی ہے مغربی ادب سے استفادہ کا زمانہ بعد میں شروع ہوا ہے اس لیے اردو کے طالب علم اور معلم کو عربی اور فارسی ادب (نثر اور شاعری) کے بارے میں واقفیت ہونی چاہیے

عربی اور فارسی میں شعر کی پسند اور ناپسند کے پیمانے وہ نہیں ہیں جو مغربی ادب میں ہیں، مغربی ادب میں شعر کا کام حسن کا احساس پیدا کرنا ہے، کیٹس ایک شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ حسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن۔ یورپ کے بڑے بڑے ادیبوں نے یہ بات کہی ہے کہ حسن مقصود بالذات ہے اور نیکی اور بدی کے حدود سے بالکل باہر ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے یہ بات کہی ہے۔ یہ درحقیقت مذہب کے انکار کا شاخسانہ ہے اور مذہب کا انکار ایک مستقل فلسفہ ہے جس کی نشو ونما یورپ کی فضا میں ہوئی مشرقی ادبیات کی تاریخ میں انکار کا فلسفہ یا تو نہیں ہے یا بہت کمزور رہا ہے، مشرقی ادبیات میں دوسری بحثیں ہیں مشرق کے بہت سے نقاد ہیں جو الفاظ کے حسن اور اس کی ترتیب پر معانی کی بہ نسبت زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ معانی الفاظ کے پردے میں چھپے رہتے ہیں۔ شاعرانہ حسن کا اظہار معنی پر نہیں بلکہ لفظ پر ہوتا ہے اصل حسن الفاظ کے انتخاب میں اور ان کی ترتیب میں ہوتا ہے مشہور ادیب اور ناقد جاحظ کا نقطہ نظر یہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جاحظ نے معنی کو فراموش کر دیا ہے صرف یہ سوال ہے کہ اولیت اور ترجیح کسے حاصل ہے اس کے مقابلہ میں عبد القاہر جرجانی اپنی دونوں مشہور کتابوں اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز میں کہتے ہیں کہ شعری جمالیات کا دارومدار معانی پر ہے کیونکہ الفاظ تو معانی کے خادم ہیں اور مخدوم کی حیثیت معانی کی ہے ابوبکر باقلانی اور ابن رشیق کی رائے دونوں سے زیادہ متوازن ہے ان کا کہنا ہے کہ لفظ اور معنی کا رشتہ ناقابل انفصال ہے اور دونوں کی حیثیت جسم اور روح کی ہے لفظ کو معنی کے مطابق ہونا چاہیے اور معنی کو لفظ کے مطابق۔ ابن معتز نے کہا ہے کہ الفاظ کو آب زلال کی طرح نرم اور شیریں ہونا چاہیے کلام کو غریب اور وحشی الفاظ سے پاک ہونا چاہیے۔ فصاحت اور بلاغت کی بحثیں اور صنائع او بدائع کی بحثیں سب مشرقی ادبیات سے متعلق ہیں ان سب کو جانے بغیر نہ ادب کی تفہیم ممکن ہے اور نہ ادب کی تحسین ممکن ہے، ادبیات مشرقی کے مشاہیر سے واقفیت کے ساتھ مشرقی تنقیدی نظریات سے واقفیت ادب کی تعلیم اور تعلم کے لیے ضروری ہے۔ علامہ شبلی کی کتاب شعر العجم کا مطالعہ اردو ادب کا ذوق رکھنے والے کے لیے بہت مفید ہوگا۔

اردو ادب میں نثر نے بتدریج ترقی کی ہے اور اس کے سفر کے بہت سے اسٹیشن رہے ہیں سرسید اور شبلی اور حالی اس سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید سے پہلے نثر میں

عبارت آرائی اور لفاظی بہت ہوتی تھی قافیہ پیمائی بہت ہوتی تھی انھوں سادہ نگاری کی روایت قائم کی انھوں نے غالب کی سادہ نثر کی ابتدا کو مزید ترقی دی اصل مدعا کو مدلل انداز میں پیش کرنے پر زور دیا اور اپنی تحریروں سے اس کی مثال قائم کی اور مختلف موضوعات پر سادہ لیکن خوبصورت نثر کے نئے نمونے پیش کیے۔ان کے موضوعات اصلاحی نوعیت کے ہیں انھوں معاشرہ کی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق کے نام سے رسالہ بھی نکالا۔

پیش نظر کتاب ''مشاہیر ادبیات مشرقی'' سے اردو عربی اور فارسی تینوں زبانوں کے مشاہیر فن سے واقفیت ہو جاتی ہے۔مشرقی ملکوں کے رہنے والے ادیب اور شاعر کے لیے مستحسن بات ہے کہ وہ کم از کم مشرقی ملکوں کی ادبیات سے واقف ہوں گر چہ یہ واقفیت طائرانہ نظر کی حیثیت رکھتی ہو،اسی لیے اس کتاب کے لیے مشرق کی تین مشہور زبانوں کا انتخاب کیا گیا ہے،اس میں استقصاء کی کوشش نہیں کی گئی ہے یعنی ہر نام کا شامل کر لینا لازمی نہیں ہے،لیکن بحیثیت مجموعی اس کتاب سے مشرقی ادب کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے،ہر زبان کے ادب کے لیے نظم اور نثر دونوں کا تذکرہ اس کتاب میں الگ الگ باب میں کیا گیا ہے،کم از کم اس کتاب سے نظر میں وسعت پیدا ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کسی زبان کے شاعر اور ادیب کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے یہ کتاب مہمیز ثابت ہو،اردو ادب میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں تھی جس میں تینوں زبانوں کا احاطہ کیا گیا ہو۔کتاب کی افادیت اسی حقیقت میں مضمر ہے۔اردو کا کوئی طالب علم اس وقت تک کامیاب طالب علم نہیں ہوسکتا ہے جب تک عربی ادب اور فارسی ادب کا کسی قدر ذوق آشنا نہ ہو، اسے مجمع البحرین اور جامع المشرقین اور فاتح الفرقدین ہونا چاہیے،مولانا آزاد جیسی شخصیت اس کی بہترین مثال اور نمونہ ہے۔

راقم الحروف قلم کا مسافر ہے،قلم کے اس مسافر نے بہت سی جگہوں پر پڑاؤ ڈالا ہے۔ ''نقد شعر و ادب''اور''کلیم عاجز،ایک شاخ نہال غم''اور پیش نظر کتاب''مشاہیر ادبیات مشرقی'' وہ کتابیں ہیں جو خاص ادب کے موضوع پر ہیں،اس کی بعض اور کتابیں جیسے''کتابوں کے درمیان'' اور''ستاروں کے درمیان''اور''دنیا کو خوب دیکھا''اور''تقدیر امم کا رازداں۔مولانا ابوالکلام آزاد'' اور''مصر کی عربی صحافت''اور''اردو کہانی اردو کی زبانی''اور''نجیب محفوظ فی میزان النقد (عربی)''

ادب کے دائرے میں آتی ہیں، اس مسافر قلم کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن کا تعلق اس کے تعلیمی پس منظر سے ہے، جیسے ''مشاہیر علوم اسلامیہ'' اور ''دین کا متوازن تصور'' اور ''دعوت اسلام اقوام عالم اور برادران وطن کے درمیان'' اور ''مطالعہ مذاہب'' اور ''حادثۂ کربلا اور اس کا پس منظر'' اور ''خطبات تعلیم وتربیت'' اور ''اسلام کا نظام سیاست وحکومت'' وغیرہ، ان کتابوں کے علاوہ اس کی بعض وہ کتابیں ہیں، جن کا تعلق حالات حاضرہ سے ہے جیسے ''حالات بدل سکتے ہیں'' اور ''مصر وشام وفلسطین خون سے لالہ زار'' اور ''شام جل رہا ہے'' اور ''شام لہولہو'' اور ''مصر میں اخوان کا قتل عام'' اور ''مصر، سعودی عرب اور اخوان'' اور اب نئی کتاب ''ملک میں حالات کا نیا رخ'' وغیرہ وغیرہ۔ حالات حاضرہ سے متعلق موضوع پر جامعات کے علما اور اساتذہ شاذ ونادر ہی قلم اٹھاتے ہیں، لیکن کیا کیا جائے حالات سے متأثر ہونا اور اظہار خیال کرنا ایک باشعور، درمند صاحب قلم کا فریضہ ہے، حالات سے بیگانہ رہ کر صرف تحقیق کے کام میں مشغول رہنا ایسا ہی ہے جیسے گاؤں میں آگ لگ گئی ہو اور ایک شخص درخت کے نیچے بیٹھ کر بانسری بجاتا رہے۔ جمال الدین افغانی جب مرض الموت میں مبتلا تھے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے تھے، تو انھوں نے کاغذ پر اپنے قلم سے دو لفظ لکھے تھے، ملّتی ملّتی۔ یعنی میری قوم میری قوم، اسی طرح سے دو لفظ اور ہیں ''امتی امتی''، جن کی نسبت پیغمبر اکرم ﷺ کی طرف کی جاتی ہے، کسی انسان کے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اسے اس آتش کدۂ غم کی چنگاری نصیب ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے مادر علمی سے وابستہ جو نامور شخصیتیں رہی ہیں شبلی سے لے کر مولانا ابوالحسن علی ندوی تک سب کے یہاں موضوعات کا ایسا ہی تعدد پایا جاتا ہے اور سب نے اپنے وقت کے حالات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ شاید یہ وہی نسبت ہے جو ملی ہے۔

اپنے بارے میں دراز نفسی کوئی اچھی صفت نہیں، لیکن کسی بھی شخص کی اور خاص طور پر اگر وہ کسی درجہ میں صاحب قلم ہے تو یہ اس کی فطری خواہش ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کی جو رائے ہو وہ غیر متوازن نہ ہو، یہ چند سطریں اسی احساس کے تحت امر واقعہ کے بیان کے لیے زبان قلم پر آ گئی ہیں تا کہ لوگ صحیح رائے قائم کر سکیں۔ تنقید بھی وہی معتبر ہے جو آشنائی اور شناسائی کے بعد ہو۔ کچھ اہل علم کی صحبتوں نے قرطاس وقلم کا میدان سجانا سکھایا ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

یہ راقم السّطور نہ ادیب ہے نہ محقق نہ ماہر اسلامیات اور نہ دانشور اور نہ مفکر اور نہ قائد، بقول اکبر الہ آبادی۔

پکا لیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

محسن عثمانی

28 جولائی 2016

باب۔اول

اردو شعرا

موضوع کا تعارف

اردو شاعری کی مقبول ترین اصناف حمد و نعت، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ ہیں۔ اردو شاعری کے کئی دبستان ہیں اور ہر دبستان کی اپنی خصوصیات ہیں اور ان دبستانوں میں زیادہ مشہور دبستان دہلی، دبستان لکھنو، دبستان عظیم آباد دبستان حیدرآباد اور دبستان رامپور ہیں۔ اردو شاعری کی ابتدا تو بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن اس کی اہمیت اور عظمت امیر خسرو کی شاعری سے اجاگر ہونا شروع ہوگئی اور اس کے بعد حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں اور کئی شاعر پیدا ہوئے، دکن کی فضاؤں میں اردو پروان چڑھی، ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی اور کئی دوسرے شعرا پیدا ہوئے جن سے اردو شاعری کا کارواں منزل بہ منزل آگے بڑھا پھر لگاتار بہت اچھے شعرا سامنے آتے گئے میر تقی میر اور سودا، خواجہ میر درد، انشاء اور مصحفی سے لے کر ذوق اور غالب اور مومن تک، پھر اقبال سے لے کر حسرت، جگر، فانی، اصغر گونڈوی اور فیض احمد فیض سے لے کر مجروح سلطان پوری تک، اتنے نام ہیں کہ سب کا گنوانا مشکل ہے، جب دنیا کے جدید علوم و فنون

سے اہل اردو کو آگاہی ہوئی تو اردو شاعری کے انداز اور اسلوب میں بھی تبدیلی ہوتی گئی، مغربی ادبیات کے زیر اثر بہت سی تحریکیں اٹھیں ان تحریکوں کے بھی اثرات اردو شاعری پر پڑے۔

امیر خسرو (1253 تا 1325)

ابوالحسن یمین الدین خسرو اصل نام تھا، لیکن امیر خسرو کے نام سے شہرت پائی شمالی ہند کے شہر پٹیالی میں ان کی پیدائش ہوئی ان کے والد کا نام امیر سیف الدین محمود تھا، جو شمس الدین التمش کی فوج میں ملازم تھے، یہی وہ زمانہ ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیا کا طوطی بول رہا تھا اور خدا کی مخلوق ان کی گرویدہ ہو رہی تھی اور ان کی خدا ترسی اور آخرت ترسی اور روحانیت کے چرچے خاص و عام میں پھیل چکے تھے، امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قریب اور ان کے عاشق زار ہو گئے تھے، ان کی قبر بھی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی قبر سے متصل ہے، امیر خسرو کا نام اردو زبان کے اولین شعرا میں آتا ہے، اس طرح سے اردو غزل کی عمر سات سو سال شمار کی جا سکتی ہے، امیر خسرو کی یہ غزل بہت سے مشہور گانے والوں نے گائی ہے ۔

زحال مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بتائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر خسرو سرکاری دربار سے بھی وابستہ رہے، جلال الدین خلجی سے بھی ان کی مصاحبت رہی اور اس کے بعد جب قیقبا د تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا تو اس نے بھی خسرو کی صلاحیتوں ں کا اعتراف کیا اور انھیں مصحف دار کے منصب پر فائز کیا اور اپنے ندیموں میں شامل کر کے، ایک ہزار دو سو تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا، حکومت اور دربار سے روابط کے ساتھ ساتھ امیر خسرو نے تصنیف وتالیف پر سب سے زیادہ توجہ دی اور پانچ بیحد اہم رسالے لکھے جن میں غرۃ الکمال، آئینہ سکندری، مطلع انوار، اور ہشت بہشت شامل ہیں اور بعد میں جب دہلی کی حکومت غیاث الدین تغلق کے ہاتھ میں آئی تو خسرو اس کے دربار میں بھی شامل ہو گئے، شہزادہ جونا خان (محمد بن تغلق) کے ساتھ جب وہ دیوگری (دولت آباد۔ مہاراشٹر) گئے، تو وہاں کے خوشنما مناظر سے بے حد متاثر ہوئے

اور انھیں کے مشورے پر شاید محمد تغلق نے اپنا پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کرلیا، غیاث الدین تغلق حضرت نظام الدین اولیاء سے ناخوش رہتا تھا اور بنگال کے مہم پر جانے سے پہلے اس نے حضرت نظام الدین یہ حکم بھجوایا تھا کہ وہ اس کی واپسی سے پہلے دہلی چھوڑ دیں، جب فتح مند سلطان بنگال کی مہم سر کر کے واپس دہلی کے قریب آیا تو اس نے دہلی پہنچنے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاء کو کہلا بھیجا کہ میرے دہلی پہنچنے سے پہلے دہلی چھوڑ دیں۔ امیر خسرو کے شیخ و مرشد نے وہ مشہور جملہ فرمایا: کہ بادشاہ سے کہہ دو کہ ''ہنوز دہلی دور است''، چنانچہ بادشاہ کے دہلی پہنچنے سے پہلے غیاث الدین تغلق کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔

امیر خسرو ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، صاحب سیف بھی تھے صاحب قلم بھی تھے، وہ شاعر بھی تھے، نثر نگار بھی تھے، تاریخ نویس بھی تھے، سپاہی بھی تھے، صوفی بھی تھے اور ماہر موسیقار تھے، ہندوستانی موسیقی کو انھوں نے، ستار اور طبلہ کا تحفہ دیا۔ امیر خسرو کے زمانے میں افغانستان، غزنی، عراق، ایران اور وسط ایشیا سے ارباب کمال اور علما اور ادبا ہجرت کر کے ہندوستان آرہے تھے اور مختلف قوموں کے اختلاط سے ایک نئی زبان کی تشکیل ہو رہی تھی، اس زبان کو امیر خسرو نے ہندوی کا نام دیا، یہ ہندوی بعد میں ریختہ کہلائی اور پھر مستقل طور پر اردو کے نام سے مقبول خاص و عام ہوئی اور انیسویں صدی کے وسط میں دہلی کے قلعہ میں پہنچ کر اردو معلیٰ کہلائی اور جب محمد تغلق نے پایہ تخت تبدیل کیا اور دولت آباد کو اپنا دار السلطنت بنایا تو پھر یہ زبان دکن میں پروان چڑھی اور دکنی کہلائی، دکن میں 1707 میں ولی دکنی جیسا شاعر اردو زبان میں پیدا ہوا اور جب دکن کی اردو غزلیں دہلی پہنچیں تو وہاں فارسی شاعری کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، ولی کی غزلوں نے اردو شعرا کو ایک نیا ولولہ عطا کیا اور پھر میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا جیسے شاعر پیدا ہوئے۔

امیر خسرو کو اردو زبان کا پہلا شاعر یا باوا آدم کہنا چاہیے، ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''خالق باری'' یہ کتاب نظم کی کتاب ہے اور ایک لغت بھی ہے اور ہندی اور فارسی والوں کے لیے ترجمہ کی گائڈ بک بھی ہے، اس کتاب کے بارے میں مختلف حضرات اور محققین نے اظہار خیال کیا ہے، بہت سے لوگوں نے اس میں تحریف کی نشان دہی کی ہے۔ کتاب اس شعر سے شروع ہوتی ہے، جس میں فارسی اردو یا ہندوی میں ترجمہ ہے۔

بیا برادر، آؤرے بھائی
بنشیں مادر، بیٹھ رے مائی

حضرت امیر خسرو فارسی کے بھی شاعر تھے اور اردو یا ہندوی کے بھی شاعر تھے اور انھوں نے دونوں زبانوں کو ملا کر کے بھی بہت خوبصورت اشعار کہے ہیں مثال کے طور پر یہ دو شعر دیکھیے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل برائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

امیر خسرو سے منسوب کچھ پہیلیاں بھی ہیں، چونکہ وہ عوام کی زبان میں گفتگو کرتے تھے تو لوگوں نے بھی ان کے گیت اور راگنیاں خوب خوب گائیں اور صدیاں گذر جانے کے بعد ان کے بول اب بھی دلوں میں محفوظ ہیں اور زبانوں پر جاری ہیں، یہ صوفی شاعر اپنے اشعار کے ذریعہ صدیاں گذر جانے کے باوجود ابھی تک زندہ ہے۔

محمد قلی قطب شاہ (1580 تا 1611)

اردو شاعری کی تاریخ میں امیر خسرو کے بعد جو بلند قامت شاعر سامنے آتا ہے اور جسے قدیم اردو شاعری کا قطب قرار دیا سکتا ہے، محمد قلی قطب شاہ ہے جو دکن میں سلطنت گولکنڈا کا پانچواں فرماں رواں تھا، یہ عہد امن وخوشحالی کا عہد تھا یہی بادشاہ حیدرآباد جیسے خوبصورت شہر کو بنانے والا اور آباد کرنے والا تھا، بادشاہ کو حضرت علی سے بیحد عقیدت تھی، چونکہ حضرت علی کا نام حیدر بھی مشہور ہے، اس لیے شہر کا نام اس نے حیدرآباد رکھا، یہ ایک انسانیت دوست اور منصف مزاج حکمراں تھا، بادشاہ ہونے کی حیثیت سے صاحب علم اور شاعر ہونے کی حیثیت سے صاحب قلم تھا، اس نے ملی جلی مشترکہ تہذیب کو ترقی دینے کے لیے دکنی زبان میں شاعری کی، اس نے ایک پورا دیوان مرتب کیا، جو حمد اور منقبت، غزل اور نظم اور رباعیات پر مشتمل ہے، اس کی شاعری ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے پہلے شاعری مذہبی جذبات کی تسکین کا ذریعہ تھی، محمد قلی قطب شاہ نے واردات قلبی، فکری جذبات، عشق ومحبت اور مناظر قدرت کو بھی اپنی شاعری کا عنوان بنایا، دکن میں

یہ زبان دکنی کہلاتی تھی، جس میں تلنگی یعنی تیلگو اور مراٹھی زبان کے الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے، بعد میں بہت سے الفاظ متروک ہو گئے، حیدرآباد شہر کی آبادکاری اور ترقی کے لیے اس نے ایک منظوم دعا مانگی تھی، جس کا ایک مصرع یہ ہے "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر"۔ محمد علی قطب شاہ نے محبت اور ہجر و فراق کے جذبات کی بھی اپنی غزل میں منظر کشی کی ہے، اس کی غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

پیا باج پیالہ پیا جائے ناں
پیا باج یک تل جیا جائے ناں
کہیئے پیا بن صبوری کروں
کہا جائے اماں کیا جائے ناں
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو چند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے ناں

جنوبی ہندوستان میں دکنی زبان بہمنی سلطنت کے بعد گولکنڈا اور بیجاپور، احمد نگر، بیدر اور برار کی سلطنتوں میں ترقی کرتی رہی، شمالی ہند سے آبادی جنوب کی طرف منتقل ہو رہی تھی، تو علاء الدین خلجی نے 1294 میں مہاراشٹرا، آندھرا اور کرناٹک کو اپنی عمل داری میں شامل کر لیا، تو آبادی کا ایک بڑا حصہ بھی جنوب کی طرف منتقل ہو گیا اور جب 1327 میں محمد بن تغلق نے اپنا دارالسلطنت دلی سے دولت آباد منتقل کیا، تو اس کے بھی واضح اثرات دکنی اردو پر پڑے، اس دکنی اردو سے محمد علی قطب شاہ کی شاعری وجود میں آئی جو حسیاتی لذت سے معمور ہے، یہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا، اس کی کلیات میں نظمیں، غزلیات، قصائد، رباعیات اور مرثیہ اور نوحے بھی شامل ہیں۔

ولی دکنی (1667 تا 1707)

اردو زبان اور علم و ادب کا قافلہ شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہو گیا تھا، یہاں اردو زبان نے دوسری مقامی زبانوں سے ملکر ایک نیا رنگ اور آہنگ اختیار کر لیا تھا اور یہ زبان اپنا خاص مزاج رکھتی تھی اور اس کا اپنا لہجہ تھا، اس زبان اور اس لہجہ کی شاعری میں بہت نمایاں اور ممتاز نام ولی دکنی کا ہے، ولی دکنی کا نام اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، کہ جب اس کا دیوان دہلی اور شمالی ہند میں اہل شعر و ادب کے ہاتھ میں پہنچا تو اسے نہ صرف مقبولیت کا شرف حاصل ہوا،

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس دیوان نے شمالی ہند کی غزل خوانی کو اوج اور عروج بھی عطا کیا یہ واقعہ شمال میں اردو شاعری کی ترقی کا سنگ میل ہے، ولی دکنی کے اشعار میں اخلاق وحکمت اور تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں، ان کی اپنی زندگی درویشانہ زندگی تھی لیکن ان کی غزلوں میں تغزل کی کیفیت بہت زیادہ نمایاں ہے، اس اعتبار سے اردو ادب میں ولی دکنی کی تاریخی اہمیت نا قابل انکار ہے، وہ اصل رہنے والے تو احمد آباد (گجرات) کے تھے اور پھر انھوں نے اہل خاندان کے ساتھ اورنگ آباد کی طرف کوچ کیا اور آخر عمر میں وہ پھر احمد آباد گئے تھے اور پھر 1707 میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے اشعار آج بھی مغنیوں کی زبان سے سننے میں آتے ہیں، ان کے وہ اشعار جو بیحد مقبول ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے
دیکھنا ہر صبح اس رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا
صبح تیرا درس پایا تھا صنم
شوق دل محتاج ہے تکرار کا
چاہتا ہے اس جہاں میں گر بہشت
جا تماشا دیکھ اس رخسار کا
تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزل خواں سے کہوں گا

سراج اورنگ آبادی (1711 تا 1763)

سراج اورنگ آبادی کا پورا نام سید سراج الدین تھا، ان کا سلسلہ نسب خاندان مشائخ حسینی سادات سے جا ملتا ہے اور نگ آباد میں ان کے آبا واجداد سکونت پذیر تھے، وہیں سراج

اورنگ آبادی پیدا ہوئے، سارا ماحول صوفیانہ تھا، حال وقال کی مجلسوں کی گرما گرمی میں سراج نے پرورش پائی، کچھ بڑے ہوئے تو دولت آباد کے ایک صوفی شاہ برہان الدین غریب کے آستانے پر اکثر جانے لگے، عجیب عالم بےخودی میں آستانہ کا طواف کیا کرتے تھے اور مستی کی حالت میں کبھی فارسی اشعار بھی موزوں ہو جایا کرتے تھے، بعد میں حضرت خواجہ سید شاہ عبد الرحمٰن چشتی (متوفی 1747) کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے اور شعری ذوق بھی پروان چڑھتا رہا، انھوں نے چار سال کے عرصے میں مختلف اصناف سخن میں پانچ ہزار اشعار کہے، جو ان کے دیوان میں موجود ہیں، طرز کلام میں ان کو ولی دکنی کا وارث اور قائم مقام سمجھا جاتا ہے، سراج اورنگ آبادی کے کلام میں سادگی اور صفائی ہے، اسی لیے وہ عوام میں بیحد مقبول ہوئے ان کے اشعار خواص اور عوام دونوں حلقوں میں پسند کیے جانے لگے، ان کے یہاں ہر ہفتہ محفل سماع منعقد ہوتی تھی، ساز و آہنگ کے ساتھ جب قوال اور سازندے ان کی غزلوں کو گاتے تو ایک وجد کا عالم طاری ہو جاتا، ان کی یہ مجالس سماع اہل دل اور تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بہت اہم سمجھی جاتی تھی۔

سراج اورنگ آبادی کی غزلوں میں حسن کی شوخیاں اور عشق کی حرارتیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ توحید اور معرفت الٰہی اور عشق حقیقی کے موضوعات بھی موجود ہیں، لیکن کلام کی شگفتگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، ان کا کلام عام طور پر فن کے اعتبار سے اس قدر بلند اور خوبصورت رہا ہے کہ سرزمین دکن میں ان کو استادی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

سراج اورنگ آبادی کی ایک خوبصورت اور مقبول ترین غزل ہے، جو ان کے شعری سرمایہ کا گراں بہا رتن ہے، غزل کے چند اشعار اس طرح ہیں ؎

خبر تحیر عشق سن ، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا جو رہی سو بےخبری رہی
شہ بےخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے ادا کروں
کہ شراب حسرت و آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا، کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم، جسے دل کہیں سو ہری رہی
وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

سراج اورنگ آبادی کا زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا، دہلی کی حکومت کے خلاف بغاوتوں نے سر اٹھایا تھا، 1738 میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور خون کی ندیاں بہا دیں اور سترہ کروڑ کا سامان اور ہندوستان کا بے مثال تخت طاؤس لے کر ایران واپس ہو گیا، مغلیہ سلطنت زوال پذیر تھی، اورنگ زیب عالمگیر کے بعد اس کے تینوں بیٹے، معظم، اعظم اور کام بخش نے تخت کے لیے خانہ جنگی شروع کر دی، آخر میں معظم نے شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے حکومت شروع کی، احمد شاہ کے زمانے میں 1749ء میں احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا، ملک کے کئی صوبے آزاد ہو گئے اور کچھ علاقے مرہٹوں کے قبضہ میں گئے، کچھ حصے پر کمپنی کا قبضہ تھا، پھر وہ زمانہ آیا کہ انگریزوں کی حکومت رفتہ رفتہ مستحکم ہوتی گئی اور اردو زبان کی شاعری اسی انتشار اور افراتفری اور زوال وانحطاط کے زمانے میں کہیں نوابوں کے زیر سایہ اور کہیں زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کے سایہ میں پروان چڑھ رہی تھی۔

مرزا محمد رفیع سودا (1713 تا 1780)

مرزا محمد رفیع سودا کے آباء واجداد کابل سے ہندوستان آئے تھے اور دہلی کے محلے کابلی دروازہ میں رہنے لگے تھے، مرزا محمد رفیع نے ابتدائی تعلیم گھر ہی پر پائی اور دیگر علوم اور عروض کی تعلیم شاہ حاتم سے حاصل کی، سودا کے ایک رفیق اور ہم نشیں سراج الدین علی خاں آرزو تھے، وہ بھی شاعر تھے، دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام سنایا کرتے تھے، سودا پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے، بعد میں اردو میں غزلیں کہنا شروع کیں، ان کی غزلیں اتنی مقبول ہوئیں کہ دہلی کی گلیوں میں لوگ انھیں گاتے پھرتے تھے، اس وقت دہلی میں شاہ عالم کی حکمرانی تھی، جب شاہ عالم کو علم ہوا کہ سودا

اردو میں بہترین غزلیں کہتے ہیں تو بادشاہ نے بھی اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دینا شروع کیا، دہلی کے حالات خراب ہوتے گئے، ملکی انتظام درہم برہم تھا، سودا نے اس صورت حال کی عکاسی اپنی ایک نظم ''شہر آشوب'' میں کی ہے، بعد میں سودا دہلی کی سکونت کو چھوڑ کر اودھ کے پایہ تخت منتقل ہو گئے اور وہاں جب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو انھوں نے سودا کی بہت قدر منزلت کی اور پانچ سو روپے ماہنانہ وظیفہ مقرر کیا۔

دو سو سال سے اس وقت اردو نے فارسی زبان کی جگہ لینی شروع کر دی تھی اردو میں شاعری ہو رہی تھی، نثر لکھی جا رہی تھی، ان حالات میں سودا کی غزلیں جو آسان زبان میں تھیں، مقبول ہونے لگیں، سودا کے چند مشہور اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن ، کچھ تو ادھر بھی

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ظالم میں کہہ رہا تھا کہ اس خو سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

فکر معاش ، عشق بتاں، یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

سودا ایک نہایت پر گو شاعر تھے، انھوں نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، انھوں نے قصیدہ گوئی کی بنیاد ڈالی ہے اور اسے فصاحت و بلاغت کے بلند مرتبہ تک پہنچایا ہے، وہ اس میدان کے پہلے شہ سوار ہیں، دہلی میں عمر عزیز کا بڑا حصہ گذرا، آخر میں وہ لکھنؤ آ گئے، یہاں سودا کو قدر دانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، میر تقی میر بھی دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آ چکے تھے اور دونوں میں چشمک رہتی تھی، اس مقابلہ سے اردو زبان کا بہت فائدہ ہوا، ستر سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے اور لکھنؤ کے آغا باقر کے امام باڑے کے صحن میں مدفون ہوئے۔

خواجہ میر درد (1721 تا 1785)

خواجہ میر درد دہلی کے صوفی منش شاعر تھے، جب دہلی تاراج ہو رہی تھی اور حملہ آوروں کا نشانہ بن رہی تھی اور میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا جیسے شعرا دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ جا رہے تھے، اس وقت بھی خواجہ میر درد نے اپنا آستانہ نہ چھوڑا اور ان کی حال وقال کی محفلیں اور مجلس سماع کی رونقیں قائم اور دائم رہیں، خواجہ میر درد اپنے بزرگوں کے آستانے پر ثابت قدم رہے اور اپنی شاعری کے ذریعہ عشق حقیقی اور معرفت الٰہی کا درس دیتے رہے، وعظ کی محفلیں بھی منعقد ہوتی رہیں اور اردو زبان کی ترقی واشاعت کا کام بھی چلتا رہا اور بلند پایہ مضامین اشعار میں منتقل ہوتے رہے، اس طرح خواجہ میر درد نے اردو زبان کے استحکام کے ساتھ شاعری کی بساط بھی اہل زبان کے لیے پھیلائی، چنانچہ ان کی غزلیں خواص وعوام میں مقبول ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ان کا شمار اردو زبان کے اساتذہ میں ہونے لگا، ان کے اشعار زبان زد عوام وخواص ہو گئے، ان کے چند مشہور اشعار یہ ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جلتا ہے اب پڑا خس وخاشاک میں ملا
وہ گل کہ ایک عمر چمن کا چراغ تھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سوسو طرح سے مر دیکھا

سینہ ودل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

جایئے اے درد کیوں صہبا و پیمانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

خواجہ میر درد کے کلام میں معرفت وعشق اور درد وسوز کا رنگ گہرا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی بہت نمایاں ہے، بحریں عام طور پر چھوٹی اور مترنم ہیں، ان کے کلام میں کوئی خاص بات ہے، جس کی وجہ سے ان کے کلام میں آج بھی پڑھنے والوں کو لذت اور مستی کا احساس ہوتا ہے۔

میر تقی میر (1722 تا 1810)

اردو زبان میں غزل گوئی کی تاریخ بہت قدیم ہے، یہ صنف سخن فارسی سے ہوتی ہوئی اردو تک پہنچی اور غزل گوئی نے اس زبان میں ترقی اور دلکشی کی تمام منزلیں طے کیں، ولی دکنی کے وقت سے لے کر آج تک غزل کی مقبولیت مسلسل چھائی رہی ہے اور اسی کے ساتھ میر تقی میر کے غزل گوئی کا افسوں چھایا رہا ہے، میر کو لوگوں نے دنیائے غزل کا شہنشاہ بھی تسلیم کیا ہے اور اس کے بعد جتنے شعرا ہوئے، جیسے: غالب، ناسخ، حسرت، فراق اور فیض احمد فیض اور داغ، سب میر تقی میر کا کلمہ پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور غالب کو بھی یہ اعتراف ہے کہ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

داغ جیسے شاعر نے بھی برملا اعتراف کیا ہے کہ ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
داغ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر تقی میر کے کلام میں سادگی بھی ہے بے خودی بھی ہے ہوشیاری بھی ہے، کلام ایسا ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل کی آواز ہے۔

میر تقی میر کے دادا سترہویں صدی کے اواخر میں مغل سلطنت کی آگرہ چھاؤنی میں شاہی فوج میں ملازم تھے اور ان کے والد میر علی متقی ایک صوفی منش انسان تھے، آگرہ میں 1722 میں میر تقی میر کی پیدائش ہوئی، 1739 میں جب نادر شاہ کا حملہ ہوا اور دہلی خون سے لالہ زار ہوگئی اس کے بعد میر کا وہ وظیفہ بھی بند ہو گیا جو صمصام الدولہ نے مقرر کیا تھا، میر تقی میر اس کے بعد آگرہ سے دہلی آ گئے، دہلی کی دنیا بدل رہی تھی، سڑکیں اور گلیاں ویران ہو چکی تھیں، شعر و شاعری کا ماحول بھی ختم ہو رہا تھا، دہلی میں مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد ان کے ہم عصر شعرا تھے، میر تقی میر کے لیے دلی میں وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا، طرح طرح کے غموں نے انھیں گھیر رکھا تھا، غم جاناں غم دوراں ہر طرح کے غم تھے، چنانچہ انھوں نے کہا ''کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے''، اسی لیے ان کے اشعار میں واردات قلبی اور محسوسات کا اظہار بہت زیادہ ہے۔ میر تقی میر نے عوام کی زبان میں اور آسان الفاظ اور لہجے میں غزلیں کہیں ہیں، اسی طرح ایک چھوٹی بحر کی غزل میں غم کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے ؎

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے پھر اس کو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ! اس گلی سے ہم

جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
عشق ایک میر بھاری پتھر ہے
بوجھ کب ناتواں سے اٹھتا ہے

میر تقی میر نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، فارسی میں ایک مختصر سا مجموعہ بھی ہے، اردو میں ان کے چھ دیوان ہیں، انھوں نے مناقب بھی لکھے ہیں، مثنویاں بھی لکھی ہیں، شعلۂ عشق، دریائے عشق، معاملات عشق وغیرہ ان کے منظومات ہیں، میر کے بہت سارے اشعار لوگوں کے زبان زد ہیں، کچھ مشہور اشعار اس طرح ہیں۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب ایک سانحہ سا ہوگیا ہے
ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہ شیشہ گری کا

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

سیاسی پرآشوب دور کے دردمند اور ستم رسیدہ دل رکھنے والے شاعر نے شمع کی طرح سوز و گداز میں زندگی کے اٹھاسی برس پورے کیے آخر میں وہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے تھے، ان کی قبر لکھنؤ ریلوے سٹی اسٹیشن کے قریب دریافت کر لی گئی ہے۔

میر حسن (1727 تا 1786)

میر غلام حسن نام تھا اور میر حسن کے نام سے مشہور ہوئے، پیدائش دہلی میں ہوئی، ان کے والد کا نام ظاہر تھا، جو مرزا محمد رفیع سواد کے ہم عصر اور حریف تھے، میر حسن کی عمر کا ایک بڑا حصہ فیض آباد میں گذرا، جب اودھ کے نوابوں کا پایہ تخت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوا تو میر حسن کا آنا جانا لکھنؤ بہت زیادہ ہو گیا، میر حسن نے کئی مثنویاں لکھی ہیں، لیکن ان کی اصلی شہرت مثنوی سحر البیان کی وجہ سے ہے جو اردو زبان کی مثنویوں میں سرتاج کی حیثیت رکھتی ہے، اس مثنوی میں شہزادہ بے نظیر اور اس کی محبوبہ بدر منیر کی داستان بہت خوبصورتی اور روانی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور تقریباً ڈھائی سو برس گذر جانے کے بعد بھی اس زبان کا لطف باقی ہے،۔۔ بڑی شاعری کے بارے میں ناقدین نے کہا ہے کہ یہ وہ شاعری ہے جو کئی دور تک اپنی تاثیر اور دلکشی کو باقی رکھتی ہے، میر حسن کی مثنوی آج بھی اپنی دلکشی اور خوبصورتی میں ممتاز ہے، زبان صاف اور محاورے فصیح ہیں اور بیان ایسا ہے کہ واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے، چاندنی رات کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر
وہ براق سا ہر طرف دشت ودر
وہ اجلا میدان چمکتی سے ریت
اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے
خس وخار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور
گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

مثنوی سحر البیان کا قصہ مختصر یہ ہے، ایک جگہ کا بادشاہ بوڑھا اور لاولد تھا، مگر اس عالم پیری میں ایک نجومی نے یہ خوش خبری دی کہ اس کے تخت کا وارث پیدا ہوگا، شہزادہ کی پیدائش ہوئی، اس کی عمر کا بارہواں سال نہایت نازک تھا، اس پر ایک پری کا سایہ ہوگیا اور وہ پری اس سے محبت کرنے لگی، ایک بار جب وہ پری کے دیے ہوئے طلسمی گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں جا رہا تھا، تو اس نے شہزادی بدر منیر کو دیکھا اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا، شیاطین نے اسے دھوکا دے کر کوہ قاف میں واقع ایک کنویں میں قید کرلیا، سلطنت کے وزیر کی بیٹی نجم النساء کو جب یہ اطلاع ملتی ہے تو وہ جوگن کے بھیس میں جنوں کے بادشاہ کے بیٹوں کو موسیقی سے مسحور کرلیتی ہے اور شہزادہ بے نظیر کو چھڑا لاتی ہے، بے نظیر اور بدر منیر کی شادی ہوجاتی ہے اور نجم النساء کی شادی جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز شاہ سے ہوجاتی ہے اور خوب خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں، یہ ایک سادہ سا قصہ ہے، جو چار ہزار چار سو بیالیس اشعار میں بیان کیا گیا ہے، ہندوستان میں لوک کتھاؤں کا رواج پہلے ہی سے تھا، لیکن میر حسن نے ادب کے صنم خانہ میں ایک حسین پیکر کا اضافہ کیا، انھوں نے الفاظ میں صورت گری کی ہے، اس میں حقیقت اور افسانہ کا بہترین امتزاج ملتا ہے، سارا قصہ اگرچہ خیالی اور من گھڑت ہے لیکن حقیقت کی رعنائیوں سے معمور ہے، اس میں انسانی محسوسات اور واردات قلبی کے ساتھ پند ونصائح کا بیان بھی موجود ہے اور یہ کہانی حقیقت کی طرح معلوم ہوتی ہے، جب ضعیف اور لاولد بادشاہ اپنے وزیروں سے کہتا ہے کہ وہ فقیری اختیار کرلے گا اور اولاد نہ ہونے کے غم میں تخت وتاج سے دست بردار ہوجائے گا، تو وزیر بادشاہ سے کہتے ہیں ؎

وزیروں نے کی عرض اے آفتاب
نہ ہو ذرہ تجھ کو کبھی اضطراب
یہ دنیا جو ہے مزرع آخرت
فقیری میں ضائع کرو اس کو مت
رکھو یاد عدل وسخاوت کی بات
کہ اس فیض سے ہے تمھاری نجات

عجب کیا جو ہووے تمھارے خلف
کرو تم نہ اوقات اپنی تلف
اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نہ ہو اس سے مایوس امید وار

مثنوی میں مناظر قدرت سرسبز سبزہ زار آسمان، تہہ دل تہہ بادل، چاند کی چاندنی، فصل بہار کے رنگ، زیورات اور سجاوٹ کے سامان، شاہانہ لباس اور کنیزوں کی بول چال وغیرہ اس قدر جاندار ہیں، کہ میر حسن کے ذوق مشاہدہ اور باریک بینی کی داد دینی پڑتی ہے۔ مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی میر حسن نے طبع آزمائی کی ہے، لکھنؤ کے شستہ اردو محاورے میں چند اشعار یہ ہیں۔

برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
صدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

لکھنؤ کی آرائش وزیبائش، شائستگی اور تہذیب، ظرافت طبع اور شگفتہ مزاجی یہ سب میر حسن کے یہاں موجود تھی، سر پر بانکی ٹوپی ہوتی تھی، انگرکھا زیب تن کرتے تھے، خاندانی شریفانہ وضع داری کے پابند تھے۔

نظیر اکبرآبادی (1740 تا 1830)

نظیر اکبرآبادی دہلی میں پیدا ہوئے ان کا اصلی نام ولی محمد تھا اور ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا، جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور بعد میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا اور دہلی شہر کے حالات نہایت خراب اور ابتر ہوگئے تو وہ اپنی نانی اور والدہ کے ساتھ آگرہ آگئے، فارسی عربی اور خوش نویسی میں مہارت حاصل تھی، اس لیے کسب روزگار کے لیے ایک اسکول میں مدرس ہوگئے اور پھر انھوں نے آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کی، صوفی منش تھے، بے نیاز اور مستغنی قسم کے آدمی تھے، مشہور ہے کہ انھوں نے دو لاکھ شعر کہے تھے، چونکہ وہ اپنے کلام کی حفاظت نہیں کرتے تھے اس لیے تلف ہوگئے، صرف چھ ہزار اشعار ان کی کلیات میں موجود ہیں، وہ میر تقی میر اور مرزا

محمد رفیع سودا کے ہم عصر تھے، نظیر اکبر آبادی سرکار اور دربار کے شاعر نہیں تھے، رؤسا محلات میں مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے، ان کی حیثیت ایک عوامی شاعر کی تھی، انھوں نے عوام میں رہ کر عوام کی زبان میں اور عوام کے لیے ہی شاعری کی ہے، چونکہ وہ روسا اور امراء کی مجلسوں سے کنارہ کش رہتے تھے، اس لیے ان کے کلام میں قصیدہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے، انھوں نے نوے سال کی عمر پائی تھی، ان کی نظمیں آدمی نامہ، بنجارہ نامہ جاڑے اور برسات کے موسم کے بارے میں ہیں، انھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور اچھی کہی ہیں، مثال کے طور پر غزل کے چند اشعار یہ ہیں ۔

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس پیمانے کو ہم
باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

نظیر اکبر آبادی کی ایک مشہور اور پسندیدہ نظم آدمی نامہ ہے، جو سولہ بندوں پر مشتمل ہے، دو بند نمونہ کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں ۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینہ سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

انھوں نے انسانی زندگی کو بنجارہ کی زندگی سے تشبیہ دی ہے، ایسا بنجارہ جس کا کہیں مستقل ٹھکانا نہیں، وہ بے سروسامانی کے عالم میں زندگی گزارتا ہے، یہ رونقیں صرف ایک دم تک ہیں، جب دم نکل جاتا ہے، تو وہ عزیز جن کے لیے سب ٹھاٹ جمع کیے تھے وہ بھی پاس نہیں آتے، دیکھیے نظیر اکبرآبادی نے اس کا نقشہ کس طرح کھینچا ہے

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
ایک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آئے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جائے گی
دھی پوت جنوائی بٹیا کیا ! بنجارن پاس نہ آئے گی
سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

شیخ غلام ہمدانی مصحفی (1750 تا 1824)

مصحفی کی پیدائش اتر پریش کے ایک شہر امروہہ میں ہوئی، انھوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی، پھر بود و باش کے لیے لکھنؤ آ گئے، دہلی سے لکھنؤ جو شعرا آئے ان کی قیام گاہ یا پناہ گاہ مرزا سلیمان شکوہ کی حویلی تھی، مصحفی بھی وہیں رہنے لگے اور پچیس روپیہ وظیفہ مقرر ہو گیا، لکھنؤ میں اس زمانے میں میر محمد تقی میر بھی موجود تھے، جو لکھنؤ کی مروجہ شاعری سے متأثر ہوئے بغیر اپنی علمی قابلیت اور زبان دانی کا سکہ جما چکے تھے، لکھنؤ اور دہلی دبستانوں کا امتزاج مصحفی کی شاعری میں ملتا ہے، وہ نرم مدھم اور مبہم نقوش اور تصورات کے شاعر ہیں، ان کا ذہن جوش اور شدت جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا، ان کی شاعری کا ماحول دھندلا دھندلا اور خوابناک ہے، ان کے بہت سے اشعار بہت مقبول اور زبان زد عام و خاص ہیں، جیسے یہ اشعار ۔

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نوبہار ٹھیرے گا

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

تیرے کوچے اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

کبھی در کو تک کے کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
تیرے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

حسرت پہ اس مسافر بے کس کی روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

تذکرے کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کسی کے شاگرد نہیں تھے، انھیں کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا، ادب کی کتابیں اور شعرا کے تذکرے اور مذہبی لٹریچر کا وہ مطالعہ کیا کرتے تھے، کسی کے پاس کوئی اہم کتاب ہوتی اور وہ پڑھنے کے لیے نہیں دیتا تو اس کے گھر پر جا کر کتاب کا مطالعہ کرتے، مصحفی کی شاعری میں بے حد نفاست پسندی ہے، ان کے یہاں وہ رنگ رلیاں نہیں ہیں جس کے نقیب انشاء اور جرأت ہوا کرتے تھے، لیکن یہ قسمت کی قلابازی تھی کہ مصحفی کی مالی مدد نواب سلیمان شکوہ نے پچیس روپے سے گھٹا کر پانچ روپے کر دی، وہ عسرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے، نواب سلیمان شکوہ نے مصحفی کی جگہ پر انشاء کو استاذ مقرر کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت انشاء کا طوطی بول رہا تھا، لکھنؤ میں انشاء اور مصحفی کے درمیان مقابلہ آرائی کی بساط بچھا دی گئی تھی، دونوں کے شاگرد تھے اور مقابلہ یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی میں ہوتا تھا، یہ اردو شاعری کا سیاہ باب ہے اور باہمی تہمت طرازی اور عیب جوئی میں فحش باتیں بھی در آئی ہیں، مقابلہ تو لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کے درمیان بھی ہوا کرتا تھا، لیکن وہ ادبی اور سنجیدہ مقابلہ تھا جس سے اردو زبان و ادب کو فروغ ہوا لیکن مصحفی اور انشاء کے درمیان مقابلہ میں ہرزہ سرائی اور سفلہ پن تھا، جو افسوناک اور اندوہناک تھا، مصحفی نے عمر عزیز کے 74 برس گزارنے کے بعد آخرت کے لیے رخت سفر باندھا اور اپنے پیچھے شاگردوں اور مداحوں کی کثیر تعداد چھوڑی۔

انشاءاللہ خان انشاء (1756 تا 1871)

سید انشاء اللہ خاں کے آبا واجداد نجف (عراق) سے ہندوستان تشریف لائے تھے، انشاء کے والد حکیم میر ماشاء اللہ خان مرشد آباد (بنگال) میں نواب سراج الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے اور وہ شاہی طبیب تھے، انشاء اللہ خاں کی پیدائش مرشد آباد میں ہوئی، ان کے والد نے تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا، وہ بہت ذہین لیکن شرارت پسند طبیعت کے مالک تھے، انھوں نے طبابت کا پیشہ اختیار نہیں کیا، کیونکہ یہ ان کی طبیعت کے موافق نہ تھا، سولہ برس کی عمر میں مرشد آباد سے لکھنؤ آ گئے اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے اور نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے اور بادشاہ شاہ عالم کے دربار تک پہنچ گئے، دہلی میں ان کی قدر دانی میں کوئی کمی نہ ہوئی، لیکن ان کا دل لکھنؤ میں لگا ہوا تھا اور وہاں کی صحبتیں ان کو یاد آتی تھیں، چنانچہ وہ لکھنؤ کے لیے پا بہ رکاب ہوئے، وہاں مرزا سلیمان شکوہ نے ان کا پر جوش استقبال کیا، لکھنؤ میں حکومت نواب سعادت علی خاں کی تھی اور وہ شعرا اور اربابِ ادب کی قدر دانی میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے، انشاء اللہ خان انشاء بہت تیز دماغ، حاضر جواب اور بات میں بات پیدا کرنے والے تھے، ان کی زبان سے بے خیالی میں اور زور زبان آوری میں ایسا جملہ نکل گیا جو نواب کی مزاج طبع کے خلاف تھا، نواب نے دی ہوئی مراعات ایک ایک کر کے واپس لے لیں، زبان کی تیزی، زہرناکی اور دل شکنی تک پہنچ گئی تھی، دہلی میں بھی وہ شعرا اور ادبا سے الجھتے رہے اور لکھنؤ میں بھی انھوں نے یہی کام کیا اور اس کام میں بہت نام کیا، لکھنؤ میں ان کی چھیڑ چھاڑ مصحفی سے ہوتی رہی اور اس چشمک سے جو شاعری وجود میں آئی اس میں سطحیت اور عامیانہ پن کا عنصر تھا، وہ اچھے شاعر تھے، لیکن ان کی نثری تصنیفات بھی ہیں، جو اہل ادب کی توجہ کو مرکوز کرتی ہیں جیسے ''رانی کیتکی، دریائے لطافت''، رانی کیتکی ایک عشقیہ داستان ہے جو بہت سادہ اور خوب صورت زبان میں ہے، جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی نہیں ہیں اور ہندی والے اسے ہندی ادب میں شمار کرتے ہیں، دوسری کتاب دریائے لطافت اردو لسانیات کے موضوع پر ہے، جس میں ان کی علمی قابلیت اور زبان دانی کے جوہر کھلتے ہیں، انشاء اللہ خان انشاء کے بہت سے اشعار آج تک ادبی حلقوں میں زبان زد ہیں، جیسے یہ اشعار ؎

نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشاء
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا
یہ عجیب ماجرہ ہے کہ بروز عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

ان کی ایک غزل بھی بہت مشہور ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑے اے نکہتِ باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کے پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

آتش (1778 تا 1846)

آتش حیدر آباد میں پیدا ہوئے، شاعری کے فن کے ساتھ سپہ گری میں بھی کمال حاصل کیا، ان کے کلام کی خصوصیت روز مرہ اور بول چال کی زبان ہے، تصنع اور تکلف بالکل نہیں ہے، آتش تخلص تھا تو کلام میں بھی گرمی تھی، زندگی خودداری اور قناعت کے ساتھ بسر کی، مزاج میں تصوف کی آمیزش تھی اس لیے عشق حقیقی سے متعلق ان کے یہاں اشارے ملتے ہیں، مثال کے طور پر یہ شعر۔

ظہور آدم خاکی سے ہم کو یہ یقیں آیا
تماشہ انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

آتش کے بہت سے اشعار روزمرہ کا محاورہ بن گئے ہیں، جیسے یہ شعر۔

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا

اور یہ شعر۔

اگر بخشے زہ رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سر تسلیم خم ہے جو مزاج یا ر میں آئے

ان کے اور بھی بہت سے اشعار بہت مشہور ہیں، جیسے۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

اور ان کا یہ شعر بھی ہر محفل میں پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اور یہ اشعار۔

فصل بہار آئی پیو سو پیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلی اٹھایئے

اس کے بعد شعر۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتے ہیں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

خواجہ حیدر علی آتش کا وطن دہلی تھا، ان کے والد نے دہلی سے ہجرت فرما کر لکھنؤ میں

سکونت اختیار کر لی تھی، خاندانی سلسلہ پیری مریدی کا تھا، خواجہ آتش نے یہ سلسلہ موقوف کر دیا اور فقیری کے ساتھ آزادی کی زندگی گزاری اور شاعرانہ شغل اختیار کیا، وہ خود نیک، سادہ طبیعت اور بھولے بھالے آدمی تھے، جو کچھ وظیفہ نواب اودھ کی طرف سے ملتا تھا اس میں سے تھوڑا سا لیتے تھے اور باقی سب غربا میں تقسیم کرتے تھے، توکل پہ گزارا تھا، درباروں میں حاضری دینا ان کو پسند نہ تھا، انھوں نے زمانے کی نیرنگیوں کا مقابلہ دلیری سے کیا، وہ درویش صفت اور فطرت پسند شاعر تھے، ان کے کلام میں زبان کی پختگی اور محاوروں کا حسن ہے، ان کی ایک بہترین غزل وہ ہے جس کا شعر ہے ۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

ذوق (1788 تا 1854)

شیخ محمد ابراہیم ذوق کی پیدائش دہلی کی تھی، وہیں ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی، مطالعہ کتاب اور شعر و ادب کا ذوق ابتدا میں ہی پیدا ہو گیا تھا اور اسی شاعری کی بدولت انھوں نے شہزادہ دہلی ولی عہد مرزا ابوبکر تک رسائی حاصل کی، ان کا مطالعہ وسیع ہو چکا تھا، انھوں نے مرزا ابوظفر کے اشعار کی اصلاح کی، بہادر شاہ ظفر کے زمانۂ ولی عہدی سے وہ ان کے استاذ بن چکے تھے اور جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین اورنگ سلطنت ہوئے تو ان کو ملک الشعرا کا خطاب ملا، وہ دربار شاہی سے منسلک رہے اور تاحیات بادشاہ کے کلام پر اصلاح دیتے رہے، لیکن دہلی کے زوال اور انگریزوں کے غلبہ کے وجہ سے تمام اہل شعور اور اہل منصب کی طرح وہ بھی حیران و پریشان تھے، حکومت اور اقتدار سب کا خاتمہ ہو رہا تھا اور اس مایوس کن صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت سے اہل منصب نے طاؤس و رباب کا راستہ اختیار کر لیا تھا، اس لیے شیخ ابراہیم ذوق کے کلام میں یاس اور قنوطیت بہت ہے ان کے یہ اشعار دیکھیے ۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر اسے گذار کہ رو کر گزار دے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے

ذوق کا زمانہ وہی ہے جو غالب کا زمانہ ہے، دونوں بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے، نظام حیدرآباد نے شیخ ابراہیم ذوق کو دیوان راجہ چند کے ذریعہ دکن آنے کی دعوت دی، لیکن ذوق دکن نہ جاسکے اور یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

دلی میں قلعہ معلّٰی کی فصیلوں کے درمیان حضرت ذوق کی شاعری پروان چڑھتی رہی، ذوق کے کلام میں محاوروں اور روزمرہ کا استعمال بیحد خوبصورتی سے کیا گیا ہے، ان کے کلام میں ردیف اور قوافی میں ندرتیں پائی جاتی ہیں، ان کے بہت سے شعر ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں، وہ تصوف پسند اور محرمات سے بچنے والے شاعر تھے، چنانچہ ان کی یہ نصیحت ہے۔

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منھ لگا
چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

امام بخش ناسخ (1772 تا 1838)

شیخ امام بخش ناسخ کے والد کا نام خدا بخش تھا جنھوں نے لاہور سے آکر فیض آباد میں سکونت اختیار کی، بعد میں ناسخ لکھنؤ منتقل ہوئے، یہ زمانہ آصف الدولہ کا تھا، عربی اور دیگر علوم

فرنگی محل میں حاصل کیے، وہ میر تقی میر سے متأثر تھے اور شاعر کے لیے ان کے کلام کو انھوں نے معیار اور نمونہ بنایا تھا، انھوں نے لکھنؤ کی صاف ستھری زبان میں غزلیں کہی ہیں، حیدر علی آتش سے ان کی چشمک رہتی تھی، بہت خوش خوراک تھے اور جسم کسرتی تھا، اس لیے لوگ ان کو پہلوان سخن کہتے تھے، ان کا کلام آج بھی متداول ہے، جیسے یہ اشعار ؎

تمام عمر یوں ہی ہوگئی بسر اپنی
شب فراق گئی روز انتظار آیا

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

دو روز ایک وضع پر رنگ جہاں نہیں
وہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

کسی کا کب کوئی روز سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

ہر روز روز ہجر ہے ہر شب شب فراق
نفرت ہوئی ہے یاں کے سفید وسیاہ سے

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

عمر عزیز کا آخری زمانہ لکھنؤ میں گذرا، ان کے شاگرد بہت تھے اور انھوں نے بہت نام پیدا کیا، ان کے دو دیوان مرتب ہوکر شائع ہوئے، جن میں غزلیات بھی ہیں رباعیات بھی ہیں، انھوں نے کسی کی مدح سرائی میں قصیدے نہیں لکھے، مذکور ہے کہ دکن کے راجہ چندو لال نے دو

مرتبہ دعوت نامے بھیجے اور کثیر رقم بھیجی اور یہ یقین دلایا کہ ان کو دکن آنے کے بعد ملک الشعرا کا خطاب دیا جائے گا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کی پابندی بھی نہ ہوگی، لیکن انھوں نے معذرت کی، مزاج میں استغنا تھا، ایک طویل عمر پانے کے بعد لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے مکان میں مدفون ہوئے۔ آخر میں ناسخ کے دو شعر اور۔

روٹھے ہوئے تھے آپ کئی دن سے من گئے
بگڑے ہوئے تمام مرے کام بن گئے

حرف سخت اس نے کہے مجھ سے لب لعلیں سے
جائے حیرت ہے ہوئے لعل سے پتھر پیدا

مرزا غالب (1797 تا 1869)

مرزا غالب کا اصل نام مرزا اسد اللہ خان تھا، عرفیت مرزا نوشا تھی، تخلص شروع میں اسد تھا، بعد میں غالب ہوگیا، ان کی ولادت آگرہ میں ہوئی تھی، وہ ترک ایبک خاندان سے تعلق رکھتے تھے، غالب کے والد عبداللہ بیگ خان نواب اودھ آصف الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے، بعد میں انھوں نے ریاست حیدرآباد دکن کے آصف جاہ دوم نواب نظام علی خاں کی ملازمت اختیار کرلی تھی، غالب کی عمر پانچ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے جو آگرہ کے صوبہ دار تھے، ان کی پرورش کی اور نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد ان کی پینشن سات سو روپے سالانہ 1857 تک غالب کو بھی ملتی رہی، جب ہندوستان پر انگریز قابض ہوگئے تو تین سال کے لیے یہ پنشن بند ہوگئی، بہادر شاہ ظفر نے ان کو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا، 1854 میں جب حضرت ذوق کا انتقال ہوگیا تو ظفر اپنا کلام غالب کو دکھانے لگے، غدر کے بعد وائی اودھ واجد علی شاہ کے یہاں سے پانچ سو روپے سالانہ جو رقم ملتی تھی وہ بھی موقوف ہوگئی، 1859 میں نواب رامپور نے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا جو ان کی وفات تک ملتا رہا۔ غالب کچھ دن رامپور میں بھی رہے اور پنشن کی واہ گزاری کے لیے براہ بنارس کلکتہ بھی گئے، 1857 کے تمام دلدوز واقعات ان کی نظروں سے گذرے اور انھوں نے دہلی شہر کی تباہی و بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی، بہر حال ان کے زندگی کی شمع 73 برس تک ہر

رنگ میں جلتی رہی، انتقال کے بعد درگاہ نظام الدین اولیاء میں مدفون ہوئے۔

مرزا غالب کا شعری مجموعہ دیوان غالب کے نام سے معروف ہے، یہ دیوان مختصر ہے، لیکن جتنا مختصر ہے اتنا ہی مقبول اور دنیائے شاعری میں معتبر ہے، غالب کی شاعری گنجینۂ معانی ہے، اس میں معنی کی گہرائیاں اس قدر ہیں کہ ناقدوں نے اسے الہامی کتاب قرار دیا ہے، نظم طباطبائی سے لے کر مالک رام تک متعدد اہل دانش وادب نے کلام غالب کی شرحیں لکھی ہیں، گنجینۂ معانی کے طلسم سے ہر شخص مسحور ہو جاتا ہے، گانے والوں نے اور گلوکاروں نے ان کی غزلیں گائی ہیں اور مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے دیوان غالب کو مرقع چغتائی کی شکل میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر شائع کیا ہے اور اشعار کی تشریح مختلف رنگوں اور تصویروں کے ذریعہ کی ہے، غالب نے بچپن سے شاعری کی تھی اور مغلیہ سلطنت کی تاریخ بھی لکھی تھی، لیکن یہ تاریخ مکمل نہ ہو سکی اور مغلیہ سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا، غالب کا کلام آسان بھی ہے اور مشکل بھی ہے، انسان کی عظمت کے بارے میں بھی ان کے اشعار ہیں ۔

جامِ ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

یعنی غالب یہ کہتے ہیں کہ مجھے ساری کائنات کا مرکز بنا دیا گیا ہے اور ساری رونق انسان کے دم سے ہے اور اس کائنات کی ہر چیز میری ضرورت کے لیے ہے، عالم حیوان ہو یا نباتات سب میری وجہ سے ہیں، وہ سوال کرتے ہیں کہ مجھ میں یہ کشش کہاں سے آئی اور آخر میں کس کا دل ہوں اس طرح غالب نے اس ایک شعر کو گنجینۂ معانی بنا دیا ہے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے اور ہر ذرہ انسان کی توجہ کا طلبگار ہے اور ہر مخلوق انسان کی محتاج ہے، غالب کے ایک ایک شعر میں موتی سموئے ہوئے ہیں اور تین صدیوں کے گذرنے کے باوجود اور اقبال جیسے شعرا کے منظر ادب پر آنے کے باوجود غالب کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے اور غالب پر کتابیں اور تحریریں منظر عام پر آرہی ہیں۔

غالب کا دیوان اردو ان کی زندگی ہی میں طبع ہو گیا تھا، انھوں نے بہت سے اشعار خود قلم زد کر دیے تھے، لیکن غالب کا ہر شعر مقبول اور زبان زد عام وخاص ہے، غالب کے چند مشہور

اشعار یہ ہیں۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے
اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
قرض کی پیتے تھے مے لیکن یہ سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
تھی جو اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی سحر ہونے تک
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہر مکرر لب ساقی پہ صلہ میر ے بعد
ہوس کو ہے نشاط کا ر کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

غالب کی طبیعت میں وضع داری اور خودداری بہت تھی، دہلی کالج 1825 میں قائم ہوا تھا، اسلامی علوم کے ساتھ یورپ کے علوم کی بھی اس میں تدریس ہوتی تھی اردو کے بہت مصنفوں

اور ادیبوں نے اس کالج سے تعلیم حاصل کی 1840 میں انگریزی حکومت نے اس کالج کے لیے فارسی کے استاذ کی بھی ضرورت محسوس کی ، غالب کا نام تجویز ہوا ، وہ بلائے گئے غالب پالکی میں سوار ہوکر کالج گئے ، اتر کر کھڑے ہوئے ، انتظار کرنے لگے کہ سیکریٹری صاحب ان کا استقبال کریں گے ، جیسے دو دن پہلے ان کی آمد پر اور اس منصب پر بحالی کے لیے ان کا استقبال کیا گیا تھا ، مگر سکریٹری صاحب اس بار نہیں آئے ، سکریٹری صاحب نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ غالب آئے تھے اور چونکہ ان کا استقبال نہیں کیا گیا اس لیے وہ باہر ہی سے واپس چلے گئے ، سکریٹری صاحب نے کہا غالب کی بحالی ہوچکی اب وہ اساتذہ کی صف میں شامل ہوگئے ، اب انھیں خود سے آنا چاہیے تھا ، غالب کو معلوم ہوا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ نوکری کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ عزت اور بڑھے گی نہ کہ موجودہ وقار میں کمی ہوجائے گی ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

مومن خاں مومن (1800 تا 1851)

مرزا غالب نے جب مومن کا یہ شعر سنا ۔

تم مرے پاس ہوتے ہوگویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب نے یہ شعر سن کر کہا کاش مومن خاں مومن یہ شعر مجھے دے دیتے اور اس کے عوض میں میرا پورا دیوان لے لیتے ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے ، کتنی سادگی ہے اس شعر میں ، روزمرہ کی زبان ہے اور پورا تغزل موجود ہے ، مومن کی اس غزل کا دوسرا شعر یہ ہے ۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

آسان زبان میں اتنی عمدہ شاعری بہت کم کی جاتی ہے ، حکیم مومن خاں مومن کے آبا واجداد کشمیر سے ہجرت کر کے دہلی آئے تھے ، ان کے والد حکیم غلام نبی بڑے حاذق طبیب تھے اور

دربار شاہی سے منسلک تھے، حکیم مومن خاں مومن کا نام معروف عالم اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز کا رکھا ہوا ہے، انھوں نے مروجہ تعلیم حاصل کی، علم طب، علم نجوم، ریاضی اور موسیقی وغیرہ کی مبسوط کتابیں بھی پڑھیں، اپنی جوانی میں وہ ایک آزاد اور مست نوجوان تھے، لیکن سید احمد شہید بریلوی کے ہاتھ پر بیعت ہونے کے بعد انھوں نے عیش وعشرت کی زندگی کو خیر باد کہا لیکن وہ زاہد خشک نہیں تھے، مومن کو قلعہ معلیٰ اور سرکار انگریزی سے پنشن ملتی تھی اس لیے معاشی طور پر آسودہ حال تھے، ان کا عہد وہ ہے جب شاہ ولی اللہ دہلوی کے خانوادے کی علمی تحریک اور سید احمد شہید کے جہاد کی تحریک پورے ملک میں پھیل گئی تھی اور حکیم مومن خاں مومن سید احمد شہید کے دست گرفتہ ہو گئے تھے، لیکن ان کی شاعری جاری رہی اور ان کی شاعری میں سادگی اور شوخی کا انداز برقرار رہا، ان کی ایک مشہور غزل ہے ۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پر روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی تم بھی ہم سے تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا آپ نے ایک وعدہ تھا
سو نباہنے کا ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ کہتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے با وفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلہ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پر تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد

مومن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت آسان زبان کے ساتھ نازک خیالی ہے،

غزل تو عشق کے جذبات اور حسن کی دلفریب کیفیات پیش کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، مومن خاں مومن نے غزل میں تخیل کے کرشمے دکھائے ہیں، ان کے کلام میں کہیں عریانی اور بے حیائی نہیں ہے، جبکہ یہ بے حیائی جرأت اور انشاء کے کلام میں کسی حد تک موجود ہے، الفاظ کے انتخاب میں اور ان کی ترتیب میں مومن کو کمال حاصل ہے، ان کی غزلیں بہت مترنم ہیں انھوں نے جو تشبیہات اور استعارات استعمال کیے ہیں ان میں بھی ندرت پائی جاتی ہے، مجموعی طور پر مومن خاں کا کلام بہت دلکش ہے۔

میر انیس (1802 تا 1874)

میر انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے، یہ مشہور مثنوی گو شاعر میر حسن کے پوتے تھے، میر انیس کے والد میر خلیق بھی مثنوی گو شاعر تھے، ان ہی کے مشورے پر مرثیہ لکھنا شروع کیا اور بہت نام کمایا، مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی تعریف دردناک انداز میں بیان کی جاتی ہے، رنج و غم کا بھی اظہار ہوتا ہے، جو سننے والے پر اثر کرتا ہے، مذہبی ماحول میں تعلیم پائی، لباس اور رہن سہن بہت باوضع تھا، بہت خوش آواز تھے، ان کی شہرت دور دراز علاقوں تک پھیل گئی اور ان کو مرثیہ پڑھنے کی دعوتیں ہر طرف سے آنے لگیں، مرثیہ ایک اہم صنف شاعری ہے اور اس صنف شاعری کو میر انیس نے درجۂ کمال تک پہنچایا ہے، جب وہ واقعات کربلا کا ذکر کرتے ہیں تو لگتا ہے مصوری کر رہے ہیں اور واقعہ کے ایک ایک جز کو پوری کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، یہ اشعار دیکھیے۔

یہ سن کے گر پڑی جو قدم پر وہ نوحہ گر
لپٹا لیا گلے سے بہن کو بچشم تر
رو کر کہا کہ ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر
زینب خدا کے واسطے پیٹو نہ اپنا سر
خاصان حق کا خلق کا رتبہ بلند ہے
صابر رہو کہ صبر خدا کو پسند ہے

جب میر انیس امام حسین کے گھوڑے کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال
وہ یال تھی کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال
اڑ اڑ کے زین تک کبھی گرد قدم گئی
جب بس کہا تو اڑتی ہو ئی گرد تھم گئی

میر انیس نے یہ دعا مانگی تھی کہ زبان و بیان پر انھیں کامل قدرت نصیب ہو اور اس طرح سے دعا مانگی تھی۔

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملادوں
قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملادوں
ذرہ کی چمک مہر منور سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

میر انیس نے مراثی میں واقعات شہادت امام حسین منظوم کیے ہیں جو مسدس کی ہیئت میں ہیں، یہ مسدس کوئی منظوم نظم کی صورت میں نہیں ہے، چونکہ ہر مرثیہ کسی نہ کسی ایک جاں نثار کی شہادت کے لیے کہا جاتا تھا اس لیے مرثیہ میں چہرا، سراپا، جنگ اور شہادت کا تذکرہ ہے، ہر مرثیہ میں اسی شہید کا ذکر ہوتا تھا، جس کے لیے مرثیہ لکھا جاتا تھا، میر انیس نے واقعات کربلا کا تذکرہ کیا ہے، جو عراق میں پیش آئے، لیکن ان سامعین کی ذہنی فضا کا بھی خیال رکھا جو ہندوستان میں رہتے تھے اور واقعہ کے اجزا کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے وہ یہیں کہیں پیش آئے ہیں، زبان پر قدرت اور کلام کا ہنر دیکھیے۔ انیس نے ایک نقشہ کھینچا ہے کہ جب امام حسین کے تمام عزیز و اقارب شہید ہو چکے تو اتفاق سے ایک شخص کا گذر ادھر ہوا وہ آپ کو پہچانتا نہ تھا، آپ نے داستان غم سنائی، اس مسافر بے نوا نے نام پوچھا امام نے پہلے تو تأمل کیا اور دیکھیے کہ انھوں نے کس طرح سے اپنا

تعارف کرایا ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

مرزا دبیر (1801 تا 1875)

علامہ شبلی اردو زبان کے منفرد شاعر، ادیب اور نقاد تھے، انھوں نے ایک پوری کتاب موازنہ انیس و دبیر کے نام سے لکھی ہے، مرزا انیس کے بھی بہت سے شاگرد اور عقیدت مند تھے اور مرزا دبیر کے بھی پرستاروں کی کوئی کمی نہ تھی، دونوں حلقے کے لوگ اپنی پسند کے مرثیہ گو شاعر کو مرثیہ گوئی کے بلند ترین منصب پر فائز کرنا چاہتے تھے، گویا لکھنؤ میں ان دونوں شاعروں کے نام پر بزم آرائی کے نام سے رزم آرائی ہو رہی تھی اور گویا ایک ادبی اکھاڑا ادب کے تماشہ بینوں کے لیے جم گیا تھا، علامہ شبلی نے دونوں شاعروں کے تقابلی مطالعے پر ایک پوری کتاب لکھی، جو ادب کے حلقوں میں مقبول ہوئی جس میں انھوں نے شاعری میں میر انیس کا پلڑا زیادہ بھاری ثابت کیا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرزا دبیر بھی بلند مرتبہ مرثیہ گو شاعر تھے، مرثیہ گوئی کے ذریعہ ظلم اور مطلق العنانی سے دلوں میں نفرت پیدا کی، مرثیوں میں صرف دنیاداری نہیں ہے بلکہ رجز خوانی بھی، ظلم کے خلاف صبر کی حوصلہ افزائی بھی ہے، مرثیہ کی وجہ سے اردو زبان میں واقعہ نگاری کو بہت ترقی ہوئی اور نئی تشریحات و استعارات کا دفتر پیدا ہوا، انیس و دبیر دونوں کے یہاں حسن بیان اور طرز کلام کی دلکشی پائی جاتی ہے ان دونوں کے درمیان مسابقت نے مرثیہ گوئی کو بلندی تک پہنچا دیا، گویا پھول کے ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھا گیا، اس سے زبان کو وسعت ملی اور اردو شاعری میں مزید طاقت و نفاست پیدا ہوئی۔

مرزا سلامت علی دبیر نے میر مظفر حسین ضمیر سے شرف تلمذ حاصل کیا جو لکھنؤ کے ایک اچھے مرثیہ گو تھے، میر انیس کے چاہنے والے انیس کے کلام میں حسن بیان اور محاوروں کا لطف پیش کر کے مثال کے طلبگار ہوتے تھے، تو مرزا دبیر کے چاہنے والے الفاظ کی شوکت بلند پروازی اور تازگیٔ مضامین کو مقابلہ میں پیش کر دیتے تھے، ان دونوں امامِ مرثیہ گو نے مرثیہ نگاری کو بلندی آسمان تک پہنچا دیا، مرزا دبیر کا ایک مشہور مرثیہ جناب عباس کے حال میں ہے، جو اس طرح

شروع ہوتا ہے۔

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

مرزا دبیر کی مرثیوں کی تعداد 675 ہے، 134 سلام انھوں نے لکھے، نوحوں اور رباعیوں کی تعداد ہزار سے اوپر ہے۔

امیر مینائی (1829 تا 1900)

امیر مینائی کا خاندان صوفیوں کا خاندان تھا، جس کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ مینا تھے اور غالباً اسی لیے امیر مینائی کہلائے، ان کی عربی فارسی کی تعلیم فرنگی محل میں ہوئی، دینی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کے نتیجہ میں امیر احمد مینائی نہایت متقی اور پرہیزگار تھے عبادت الٰہی اور ریاضت نفس میں مصروف رہتے تھے، مطالعہ اور تحصیل علم کا شوق تھا، فرنگی محل کے قرب وجوار میں بڑے پختہ زبان شاعر بھی رہتے تھے، جن میں حضرت ناسخ اور جناب آتش کا نام زیادہ معروف ہے اور ہر ایک شاعر کے حلقے سے امیر مینائی کو داد ملی، امیر مینائی نے جب ہوش سنبھالا تو اس وقت لکھنؤ کے در و دیوار شعری نغمات سے گونج رہے تھے، وہ بھی میر مظفر علی اسیر کے شاگردوں میں شمار ہونے لگے جو شاعری کا بہت نفیس ذوق رکھتے تھے، 1856 کے بعد جب اودھ کی حکومت ختم ہوگئی اور اس کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے نظر بند کر کے کلکتہ بھجوا دیا تو امیر مینائی نے بھی لکھنؤ کو خیرباد کہا اور رامپور کا رخ کیا، رامپور دہلی اور لکھنؤ کے اجڑنے کے بعد ایک بڑا ادبی اور شعری مرکز بن گیا، داغ دہلوی کے علاوہ کئی شعرا نے رامپور دارالسرور کو مستقل یا عارضی وطن بنایا، امیر مینائی رامپور میں تقریباً 42 سال گزارے اور جب داغ دہلوی 1881 میں حیدرآباد چلے گئے اور نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں آصف کے استاذ مقرر ہوئے، پھر ان کو محسوس ہوا کہ رامپور

کے علاوہ دکن میں بھی سخن وروں کی خوب پذیرائی ہوتی ہے، چنانچہ داغ کی فرمائش پر امیر مینائی حیدرآباد منتقل ہوگئے لیکن حیدرآباد کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی اور بیمار رہنے لگے 1900 کو 71 سال کی عمر میں عالم فانی کو الوداع کہا، ان کا مزار حیدرآباد میں موجود ہے۔

امیر مینائی کے یہاں حسن وعشق کا تذکرہ بھی ہے اور معاملہ بندی بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی، لیکن انداز بیان لکھنؤ سے کچھ ہٹ کر کے ہے، ان کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

ہم وہ ہیں اے امیر تجلی کا ذکر کیا
جھپکی نہ آنکھ برق جمالوں کے سامنے

یاران رفتہ سے کبھی جاہی ملیں گے ہم
آخر تو پیچھے پیچھے اسی کارواں کے ہیں

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد! نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھیں کی زباں کے ہیں

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے کی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیر مینائی کا شمار ان شعرا میں جنھوں نے اپنی زندگی میں سیاسی سماجی اور تہذیبی انقلابات کا زمانہ دیکھا ہے، انھوں نہایت دل شکن حالات کا سامنا کیا ہے، لیکن ان کے حوصلے بلند رہے اور غزل میں اپنی منفرد آواز کے ساتھ رہے، انھوں نے نعت میں بھی طبع آزمائی کی، محسن

کا کوروی ان کے شاگرد تھے جنھوں نے صنف نعت میں کمال حاصل کیا۔

مرزا داغ دہلوی (1831 تا 1905)

مرزا داغ دہلوی اپنے شوخ انداز بیان اور زبان کی لطافت اور محاورات کے چٹخارے کے لیے مشہور ہیں، یہ خوبیاں ان کے بعد کسی شاعر کی غزلوں میں اتنی فراوانی کے ساتھ نہیں پائی جاتیں، محبوب کے حسن و جمال کی بلیغ تمثیل داغ کے اس شعر میں ملتی ہے ۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

محبوب کے نیم ابروں کچھ ظاہر کچھ پوشیدہ، کچھ حجاب اور کچھ بے حجابی کی تصویر جس طرح داغ نے کھینچی شاید ہی کسی شاعر نے ایسی کھینچی ہو ۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

داغ دہلوی کے آبا و اجداد سمرقند و بخارا سے عالمگیر ثانی کے دور حکومت میں دہلی وارد ہوئے ، داغ کے پر دادا نواب عارف خاں اور ان کے بھائی نواب قاسم خاں ہندوستان آئے تھے، یہ دونوں بھائی فن سپہ گری اور حرب وضرب میں ماہر تھے، اس زمانے میں شاہ عالم بادشاہ صوبہ بنگال کے مہم پر تھے، انھوں نے ان بھائیوں کی سیف زنی دیکھی تو خوش ہوئے اور جاگیر عطا کیے، مرزا داغ 5 مئی 1831 کو دہلی کے محلّہ چاندنی چوک میں پیدا ہوئے، داغ کے والد کا نام شمس الدین خاں تھا جنھیں رزیڈنٹ دہلی کے قتل کے شبہ پر انگریزی حکومت نے 1835 میں پھانسی دے دی تھی، ان کی والدہ نے محمد سلطان ولی عہد شاہ دہلی کے دامن میں پناہ حاصل کی اور نواب شوکت محل بیگم کا خطاب پایا، داغ چونکہ بچپن ہی سے قلعہ معلیٰ میں داخل ہو گئے تھے جہاں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا اس لیے ان کی طبیعت بھی چمک اٹھی ،قلعہ معلیٰ میں ولی عہد کے استاد حضرت ابراہیم ذوق تھے، داغ نے ان سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی تھی، اس زمانہ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر مشاعرہ ہوا، داغ نے مشاعرہ میں پہلی اپنی غزل پڑھی اس غزل کا مطلع تھا ۔

شرر و برق نہیں شعلہ سیماب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

ابھی ان کی عمر 26 برس کی تھی کہ ہندوستان پر 1857 عیسوی میں انگریزی سامراج کا تسلط ہوگیا، قلعہ معلیٰ اجڑ گیا، بادشاہ بہادر شاہ ظفر قید کر کے رنگون بھیج دیے گئے اور قلعہ میں رہنے والے جو قتل و غارگری سے بچ گئے تھے ادھر ادھر منتشر ہوگئے، شعر و سخن کی بساط بھی الٹ گئی اور وہ شعرا جو دربار سے وابستہ تھے، ان کا ذریعہ معاش ختم ہوگیا، ایسے ابتر حالات میں رامپور کی چھوٹی سی ریاست میں ان خانماں برباد شعرا کو اپنے دامن عاطفت میں لیا، والئی ریاست نواب یوسف علی خاں نے داغ کو اپنے یہاں بلا لیا، رامپور میں جن شعرا کی پذیرائی ہوئی، ان میں داغ کے علاوہ حضرت امیر مینائی اور جلال کے نام آتے ہیں، رامپور میں شعرا نے خوب خوب طبع آزمائی کی، داغ کے کلام میں جو چیز زیادہ نمایاں ہے وہ مضامین کی شوخی اور رنگینی، معاملہ بندی اور زبان کی صفائی ہے، محاورے کی چاشنی جتنی ان کے کلام میں ہے شاید ہی کسی کے کلام میں مل سکے پھر داغ 1890 کو حیدرآباد آ گئے اور اس محلّہ میں داغ نے قریب قریب چودہ برس گزارے، پھر وہ ترک بازار میں منتقل ہوگئے اور پھر وہ نظام حیدرآباد کے دربار میں ملک الشعرا بھی بن گئے، ان کی زندگی فارغ البالی کی زندگی تھی، حیدرآباد نام پلی میں واقع درگاہ یوسف صاحب میں مدفون ہوئے، داغ کے کچھ مشہور اور زبان زد اشعار یہ ہیں ۔

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ہوش و حواس تاب و تواں جا چکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

جلوے مری نگاہ میں کون ومکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
داغ کہتے ہیں جنھیں دیکھیے وہ بیٹھے ہیں
آپ کی جان سے دور آپ پر مرنے والے

حالی (1837 تا 1914)

الطاف حسین حالی عام طور پر مسدس حالی کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، وہ شاعر بھی تھے اور دانشور بھی تھے، وہ نقاد بھی تھے اور مفکر بھی تھے، انھوں نے اپنے مسدس کا نام مدوجزر اسلام رکھا، یہ مسدس انھوں نے قوم کو جگانے اور میدان عمل میں اتارنے کے لیے دنیائے شعروادب میں پیش کیا، وہ مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑنا چاہتے تھے اور سعی وعمل پر آمادہ کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے مسدس کے ذریعہ تحصیل علم پر زور دیا، کہ یہی زندہ قوموں کے لیے ترقی کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، الطاف حسین حالی کا دوسرا ادبی کارنامہ ان کا اپنے دیوان پر لکھا ہوا مقدمہ ہے جو مقدمہ شعروشاعری کے نام سے مشہور ہے، اس میں شاعری اور شعرگوئی کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں ہندوستان کی اردو شاعری کا ایک تنقیدی مطالعہ ہے، درحقیقت یہ مقدمہ فن تنقید پر اردو میں پہلی کتاب ہے، وہ بہترین نقاد اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے شاعر تھے، وہ پہلے نثر نگار ہیں جنھوں نے سوانح نگاری کے فن کو پورے طور پر برتتے ہوئے سرسید کی زندگی پر حیات جاوید لکھی اور غالب کی زندگی پر یادگار غالب تصنیف کی اور شیخ سعدی کی حیات پر حیات سعدی کے نام سے کتاب لکھی، وہ بہت ہی باکمال دانشور اور بہت اچھے شاعر تھے، ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیئے ہے ٹھہرتی جا کر نظر کہاں
ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
جی چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

اب بھاگتے ہیں سایہ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

الطاف حسین حالی دہلی کے قریب واقع پانی پت میں پیدا ہوئے تھے، ان کے آبا واجداد سات سو برس قبل آ کر یہاں آباد ہوئے تھے، بچپن میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ، اسی کے ساتھ انھوں نے فن عروض میں دستگاہ حاصل کی ، ان کا شوق مطالعہ اور کتب بینی کا تھا، دہلی میں قیام کے دوران حالی کی ملاقات مرزا غالب سے ہوگئی، حالی کے کلام کو سن کر غالب نے کہا تھا: ''اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے''۔ حالی نے اپنی زندگی میں منطق اور فلسفہ کے ساتھ حدیث اور تفسیر کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اس کے بعد یوپی ضلع بلند شہر کے رئیس جناب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ان کو اپنے یہاں بلا لیا تھا، شیفتہ خود بہت اچھے اور باذوق شاعر تھے، حالی کی شعر گوئی کے ذوق کو شیفتہ کی صحبت سے اور جلا مل گئی، اصلاح کے لیے حالی اپنی غزلیں مرزا غالب کو بھیجتے تھے، شیفتہ کے انتقال کے بعد وہ لاہور چلے گئے اور وہاں ان کو انگریزی ادب کے مطالعہ کا موقع ملا اور وہاں ان کو یہ احساس ہوا کہ مشرقی زبانوں میں یعنی اردو فارسی وعربی ادب میں بعض وہ بلندیاں نہیں ہیں جو انگریزی شعر وادب میں ہیں، لاہور میں ایسے مشاعرے منعقد ہوئے جن میں مصرع طرح کے بجائے کوئی عنوان دے دیا جاتا تھا چنانچہ انھوں نے برسات، امید، خوشی اور حب وطن کے عنوان پر نظمیں لکھیں، پھر جب وہ دہلی آئے تو ان کی ملاقات سرسید احمد خاں سے ہوئی اور سرسید ہی کی فرمائش پر حالی نے طویل مسدس مدوجزر اسلام کے نام سے لکھی، جس کو سرسید اپنے لیے وسیلہ نجات سمجھتے تھے، حالی کا طرز نگارش سب سے جدا تھا، انھوں نے غزل میں بھی جدت پیدا کی تھی خود وہ فرماتے ہیں ؎

مال ہے نایاب اور گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

ان کی بہت سی نظمیں انسانوں کے لیے بہترین نصیحتیں ہیں ان کی یہ نظم دیکھیے ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے یہ ہے شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
مصیبت کا ایک ایک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
ہے الفت بھی وحشت بھی دنیا سے لازم
نہ الفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

حالی کے بارے میں کچھ بھی پڑھ کر دل خوش ہوتا ہے اور حالی کا یہ شعر یاد آتا ہے ۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اکبرالہ بادی (1846 تا 1921)

اردو زبان میں کچھ ایسے شعرا گذرے ہیں جو بڑے دانشور بھی تھے، مفکر بھی تھے اور بلند مرتبہ شاعر بھی تھے، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملت کو زار و زبوں حالت سے اوج اور عروج کی حالت تک پہنچانے کی کوشش کی اور جن کا شمار مصلحین میں بھی ہوتا ہے، ایسے شعرا میں حالی کے بعد اکبرالہ بادی کا نام آتا ہے، ان کا پورا نام سید اکبر حسین اکبرالہ بادی ہے، انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی ہے، کہ مسلمان اپنا رشتہ ماضی سے استوار رکھیں اور مشرقی تہذیب پر قائم رہیں اور مغربی تہذیب سے دور رہیں، اکبرالہ بادی جج تھے اور سرکاری ملازم تھے، اس لیے وہ مغربی تہذیب کے خلاف بہت صاف صاف نہیں بول سکتے تھے اس لیے انھوں نے

ظرافت کا لباس پہنا اور طنز کے پردے میں ظریفانہ رنگ میں اپنی بات کہی، اپنے ظریفانہ کلام کی وجہ سے اکبرالہ بادی کو بہت بڑا ظریف اور طنز نگار سمجھا جاتا ہے، انھوں نے حکومت کے مختلف عہدوں پر کام کیا اور آخر میں ان کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔

اکبرالہ بادی کی زندگی ایسے دور پر محیط ہے جس میں دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو رہا تھا ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو چکی تھی اور انگلستان کے عیسائی ملک پر قابض ہو گئے تھے، انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ مسلمانوں کو مغرب کی کورانہ تقلید سے دور رکھنے کی کوشش کی اور انھوں نے سماج کی کمزوریوں پر انگلی رکھی اور اپنے قلم سے طنزیہ وظریفانہ اسلوب میں تنقید کی۔

اکبرالہ بادی کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، انھوں نے اپنے طنزیہ کلام میں ایک لفظ بھی عامیانہ استعمال نہیں کیا ہے، زبان پر ان کی قدرت غیر معمولی اور حیرت انگیز ہے اور جب اپنے طنزیہ کلام میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں جیسے زیور میں نگینے جڑ دیے گئے ہوں۔ سرسید چونکہ مسلمانوں کو مغربی علوم کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے تھے اور مغربی تہذیب کو بھی برتر تہذیب سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے کلام میں سرسید کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، سرسید کا مشن ایک طاقتور مشن تھا اور وہ ایک زبردست قوت ارادی کے مالک تھے اس لیے اکبرالہ بادی کی مخالفت آہستہ آہستہ کم ہونے لگی، اکبرالہ بادی کہتے ہیں۔

خدا علی گڑھ مدرسہ کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے
ہے دل روشن مثال دیوبند
اور ندوہ ہے زبان ہوشمند
اور علی گڑھ کبھی تم تشبیہ لو
ایک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز
گو کہ فکر آخرت ہے اصل چیز

اکبرالہ بادی کے پورے کلام میں زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت کا احساس ہوتا ہے،

چنانچہ یہ شعر دیکھیے جس میں غیر معمولی استعارے استعمال ہوئے ہیں اور ہر استعارہ ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

بنو گے خسروئے اقلیم دل شیریں زباں ہو کر
جہانگیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر

اس شعر میں خسرو اور شیریں جہانگیر اور نور جہاں کے استعارے بطور تلمیح استعمال کیے گئے ہیں، زبان کے اعتبار سے غیر معمولی ہیں، ایسا شعر کہنا معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ ان کے چند اور اشعار دیکھیے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچہ نہیں ہوتا
جناب حضرت اکبر ہیں حامئ پر دہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
خلا ف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں
بے پردہ ہم کو چند نظر آئیں بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کے پڑ گیا

اسماعیل میرٹھی (1844 تا 1917)

اسماعیل میرٹھی یوں تو بچوں کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، لیکن جن لوگوں نے اسماعیل میرٹھی کی اردو کی درسیات کی کتابیں پڑھی ہیں ان کو اعتراف ہے کہ اردو زبان و ادب کا ذوق ان کو اسماعیل میرٹھی کی اردو درسیات کی کتابوں سے حاصل ہوا، اسماعیل میرٹھی

نے بہت سے لوگوں کو اردو کا ادیب اور انشاء پرداز بنا دیا، انھوں نے اردو درسیات کی چھ کتابیں تیار کیں اور جن نسلوں نے ان کی کتابوں کو پڑھا ان کی اخلاقی اقدار کی نشو ونما ہوئی اور ان کے اندر زبان وادب کا ذوق بھی پروان چڑھا۔

اسماعیل میرٹھی نے بچپن میں اردو کے ساتھ فارسی زبان میں دستگاہ حاصل کی اور پھر انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کی اور انجینئرنگ کا کورس بھی مکمل کیا، انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کا خون آشام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، انھوں نے برطانوی سامراج کی بربریت اور ہندوستانیوں کی بے دست و پائی کے دردناک منظر کا مشاہدہ کیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں میں دفاع کی کوئی صلاحیت نہیں ہے انھوں نے علم وقابلیت کے باوجود کئی حکومت کا انتظامی عہدہ قبول نہیں کیا، بلکہ درس اور تدریس کا معزز پیشہ اختیار کیا، تاکہ وہ قوم کی رہنمائی کریں اور قوم کے نونہالوں کی تربیت کریں، انھوں نے درسی کتابیں تیار کیں جو آگرہ اور اودھ کے صوبہ میں داخل نصاب رہیں، ان کتابوں میں اردو زبان کی خوبصورت نثر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور اسماعیل میرٹھی کی نظمیں بھی ہیں، ان میں اخلاقی مضامین بھی ہیں، جن کی وجہ سے پڑھنے والا تعلیم کے ساتھ تربیت کے زیور سے بھی آراستہ ہوجاتا ہے، محمد اسماعیل میرٹھی نے پچاس سے زیادہ ایسی نظمیں لکھی ہیں جو بچوں کے لیے ہیں، زبان پر قدرت کے لیے دیکھیے کہ انھوں نے انگریزی کی مشہور نظم ''ٹیونکل ٹوینکل لٹل سٹار'' کا ترجمہ غیر مقفیٰ نظم میں اس طرح کیا ہے ؎

ارے چھوٹے چھوٹے تارو
کہ چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہووے
مجھے کس طرح تحیر
اس اونچے آسماں پر
جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس طرح سے
کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

یہ اسماعیل میرٹھی کا کمال ہے کہ انھوں نے نظم تو گائے پر بچوں کے لیے لکھی ہے لیکن اس میں گاؤ پرستی کے بجائے توحید کی دعوت دی گئی ہے، یہ اشعار دیکھیے ۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
دودھ دہی اور مٹھا مسکہ
دے نہ خدا تو کس کے بس کا

اردو کے کسی استاذ کے اتنے زیادہ شاگرد نہیں ہیں جتنے اسماعیل میرٹھی کے ہیں، اب بھی جو بچہ ان کی کتابوں کو پڑھے گا اردو زبان کا ذوق اس کے اندر پیدا ہوگا اور اسی کے ساتھ اس کی اخلاقی تربیت بھی ہوگی۔

شاد عظیم آبادی (1846 تا 1927)

1857 کے بعد ہندوستان پر برطانوی سامراج کا تسلط ہو گیا تھا، بادشاہت ختم ہو چکی تھی اور پہلے دربار میں اردو شاعری کی جو سرپرستی ہوا کرتی تھی وہ بھی قصہ پارینہ بن چکی تھی، شاعروں کا کوئی پرسان حال نہ تھا، انگریزی زبان وادب کی تعلیم پھیل رہی تھی، شاعری اب فرسودہ سمجھی جانے لگی تھی، اس مایوسی کی فضا میں محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی اور مولانا حالی وغیرہ نے نئے انداز میں نئی باتیں اور نئی نصیحتیں شروع کر دی تھی، اس دھندلکے میں عظیم آباد (پٹنہ) سے ایک نئی آواز سنائی دینے لگی جس نے شاعری پر اور غزل گوئی پر اعتماد بحال کیا، یہ آواز سید علی محمد شاد عظیم آبادی کی تھی، ان کی شاعری میں جذبات کا گداز، فکر کی گہرائی اور طبیعت کی حساسیت پائی جاتی ہے، ان کی پرگوئی ایسی تھی کہ انھوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور غزل کے سفر میں ان کا مقام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، ان کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا اور انھوں نے فارسی ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا، وہ شاعری میں سید شاہ الفت حسین فریاد کے شاگرد تھے، وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے، شاد نے دو ناول بھی لکھے ہیں، ''بدھاوا'' اور ''صورۃ الخیال'' اور انھوں نے ''تاریخ بہار'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے۔ مکتوبات شاد عظیم آبادی معلومات کا ایک بحر بیکراں ہے۔ شاد عظیم آبادی نے مرثیہ نگاری بھی کی ہے اور ان کے مرثیوں میں شہدائے کربلا کا صبر اور

ایمان کی قوت کو خاطر خواہ نمایاں کیا گیا ہے۔ایک بند ملاحظہ کی کیجیے ۔

بچوں کو تین دن سے جو تھی انتہا کی پیاس
بیٹھے ہوئے تھے ماؤں کی گودوں میں سب اداس
بازار موت گرم تھا تھی زندگی سے یاس
لیکن یہ کیا مجال کہ ظاہر کریں ہراس
رونے کو اضطراب کو ٹالے ہوئے تھے وہ
سیدانیوں کے گود میں پالے ہوئے تھے وہ

شاد عظیم آبادی کی مرثیہ نگاری معیار کے مطابق ہے، لیکن ان کی اصل شہرت ان کی غزلوں سے ہوئی۔ بہترین غزل گو شعرا میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ میر تقی میر کے یہاں جو سادگی ہے اور آتش کے یہاں جو رنگینی ہے دونوں کے امتزاج کا نام شاد عظیم آبادی کی غزلیں ہیں شاد عظیم آبادی نے غزل گوئی میں ایک نئی روش نکالی جو ان کا انفرادی اسلوب ہے۔ جس میں غم اور الم بھی ہے، تخیل کا انوکھا پن بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔ان چند اشعار دیکھیے ۔

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
نہ جاؤں کیوں لحد میں منھ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں
ہوں اس کوچے کے ہر ذرہ سے واقف
ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
یہ بزم مے ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں بھی شاداب ہیں ہم
سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

لے کے خود پیر مغاں ہاتھ میں مینا آیا
مے کشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا

ریاض خیرآبادی (1854 تا 1934)

اردو شاعری میں خمریات کی ایک خاص اہمیت ہے۔ شراب نوشی اور اس کے لوازمات یعنی ساقی، مے خانہ، جام سبو، صراحی اور نشہ وخمار کے الفاظ کو بطور استعارہ استعمال کر کے شعرا نے روحانی مضامین اور صوفیانہ خیالات کو نہایت خوبی کے ساتھ باندھا ہے۔ جیسا کہ غالب نے کہا۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں بادہ وساغر کہے بغیر

ریاض خیرآبادی کا شمار ان شعرا میں ہے جو شراب اور مے خانے کے لوازمات کا استعمال اپنی شاعری میں بہت زیادہ کرتے ہیں، لیکن وہ ہمیشہ اتنے پاک باطن اور پرہیزگار رہے کہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ سارا ہنگامہ ناونوش فارسی شاعری کی روایات سے اردو شاعری میں منتقل ہوا، فارسی میں حافظ اور خیام کے اشعار بادہ وساغر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں اس قدر شاعرانہ فرضی مے کشی پر تنقید کی ہے اور یہ اس لیے کہ اسلام میں نشہ حرام ہے، لیکن ریاض خیرآبادی کہتے ہیں۔

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہوگئی ہے
چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی

ریاض خیرآبادی کے خمریات سے متعلق کچھ اور اشعار۔

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں
کوئی حسیں پلائے تو یہ شے بری نہیں

دوسرے موضوعات پر بھی ان کے اشعار بہت اچھے ہیں۔

کیوں جوانی آئی دو دن کے لیے
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے
جام مے توبہ شکن توبہ میری جان شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

صفی لکھنوی (1862 تا 1950)

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا سورج جب 1857 میں غروب ہوگیا اور صوبوں کے خودمختار حکمرانوں کی عمل داریاں بھی ختم ہوگئیں اور جب انگریزوں کا اقتدار قائم ہوتا چلا گیا تو ملک میں اور خاص طور پر سلطنت اودھ کے عوام وخواص جو بیسوں برس سے ایک پرسکون زندگی گزار کے آئے تھے، سخت کرب کا شکار ہوئے۔ حکومت بھی گئی دولت بھی رخصت ہوئی اقتدار کا بھی خاتمہ ہوا۔ حویلیاں رہ گئیں جو ویران ہوگئیں اور محلات باقی رہ گئے لیکن ان کی ساری رونقیں ختم ہوگئیں۔ پرانے بازاروں کی رونقیں ختم ہوئیں، نئے بازاروں میں چراغاں ہونے لگا۔ سپاہیوں کی چھاؤنیاں عوام پر خوف پیدا کرنے کے لیے ہر طرف قائم ہوگئیں۔ پرانی طرز معاشرت مٹتی گئی ایسے میں صرف ایک شاعر کا دل ہوتا ہے جس سے دھواں اٹھتا ہے اور زبان مرثیہ سرا ہو جاتی ہے، صفی لکھنوی کے کلام میں ان حالات کا عکس یوں نظر آتا ہے۔

کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کیے
زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اجڑا کیا ہم نا تواں دیکھا کیے
بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
شعبدے تیرے یہی اے آسماں دیکھا کیے
ہم تھے ایک آئینہ عبرت کسی کی بزم میں
مہر باں دیکھا کیے نامہرباں دیکھا کیے

صفی لکھنوی کا پورا نام سید علی نقوی تھا۔ لکھنؤ میں ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی کی حاصل کی

اور بعد میں انگریزی تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لیا اور انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ عدالت میں سرکاری ملازمت مل گئی جس میں وہ ترقی کرتے رہے۔ انھوں نے پوری توجہ ادب اور شاعری کی طرف لگادی۔ انھوں نے قومی جذبہ کو ابھارنے والی نظمیں بھی کہی ہیں اور مناظر قدرت کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ صفی کے کلام میں درد اور یاس کا رنگ بہت گہرا ہے اور اسی کے ساتھ عاشقانہ مضامین بھی ہیں۔ کلام میں سلاست ہے اور انداز بیان سادہ اور بے ساختہ ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

دل اجزا پریشاں کو حقارت سے نہ دیکھ
کہیں صدیوں میں یہ سرمایہ بہم ہوتا ہے

بلبلیں شور مچائیں نہ چمن میں کہہ دو
بستر گل پہ کوئی خواب گہ ناز میں ہے

بنائے ہستی ہے نیستی پر مگر تمھیں کچھ خبر نہیں ہے
یہ گلشن رنگ و بو ہے کیا شے اگر فریب نظر نہیں ہے

آرزو لکھنوی (1872 تا 1949)

آرزو لکھنوی لکھنؤ کے محترم اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اور انھوں نے اردو شاعری میں بعض ایسے شائستہ اور اجتہادی کام انجام دیا جس کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور ان کی شاعری ایک سنگ میل بن گئی۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اردو میں فارسی اور عربی کے بھاری بھرکم الفاظ کو کم کیا جائے اور زبان کو خالص ہندوستانی بنایا جائے۔ انھوں نے مشکل، بوجھل اور دقیق لفظوں کے استعمال سے گریز کیا۔ ان کے یہاں زبان کی صفائی ہے۔ چنانچہ انھوں نے آسان زبان میں اور عربی و فارسی کے مشکل الفاظ سے پرہیز کرتے ہوئے غزلیں کہیں ہیں۔ جیسے یہ شعر۔

اندھیرے میں کبھی چاندنی نہیں آتی
ہنسی کی بات پہ بھی اب ہنسی نہیں آتی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے ہے جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

حسن اور عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا بڑھ کے چلا پروانہ بھی
ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا مے خانہ بھی
دو تند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی
یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ جو کہنا نہ تھا سب کہہ جانا

ہر برائی سے بچائے رکھتی ہے اتنی سے بات
آرزو ہر ایک کو اپنے سے اچھا جانیے

آرزو لکھنوی کے اشعار سننے میں اور پڑھنے میں بہت مزا دیتے ہیں اور یہ اس لیے کہ ان اشعار میں عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ نہیں آتے شعر عام فہم ہوتا ہے، لیکن اس میں شعریت ہوتی ہے اور اچھے شعر کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی زبان کوثر و تسلیم میں دھلی ہوئی ہوتی ہے۔ ''جہان آرزو'' اور ''فغان آرزو'' اور ''بیان آرزو'' کے نام سے ان کے اشعار کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

علامہ اقبال (1877 تا 1938)

اقبال نے جو کچھ کہا وہ دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہا اور دل سے نکلی ہوئی بات دل پر

اثر کرتی ہے۔انھیں کا شعر ہے ۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

اقبال کا پورا نام شیخ محمد اقبال تھا۔ان کا خاندان کشمیری پنڈتوں کا خاندان تھا۔ان کے جد اعلیٰ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔اقبال کے والد نے اقبال کو ہدایت دی تھی کہ قرآن مجید اس طرح پڑھو گویا یہ تم پر نازل ہوا ہے۔اقبال نے اپنے والد کی نصیحت کو شعر کی زبان میں اس طرح کہا کہ ۔

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں حاصل کی ،اس کے بعد انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔پھر اس کے بعد مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔یہاں سید میر حسن مشرقی ادبیات کے معلم تھے۔پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے کر بی اے (فلسفہ) کی ڈگری لی۔انگریزی اور عربی زبان میں ممتاز رہے۔پھر پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔گورنمنٹ کالج لاہور میں مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد رہے۔آرنلڈ جب انگلستان چلے گئے تو اقبال کو بہت دکھ ہوا۔ان کے ان احساسات پر مبنی ان کی نظم نالۂ فراق ہے۔اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسلفہ اور سیاسیات کے پروفیسر ہو گئے پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے ان کے درس و تدریس کا انداز نہایت عالمانہ تھا۔اقبال نے شعر کہنا شروع کیا اور بذریعہ مراسلت داغ دہلوی کو اپنا کلام دکھانے لگے اور پھر لاہور کی انجمن حمایت الاسلام کے مشاعروں میں انھوں نے اپنی نظمیں پڑھیں ۔جو بہت مقبول ہوئیں۔ان نظموں میں تصویر درد۔ نیا شوالا ۔ترانہ ہندی اور شکوہ بہت زیادہ مشہور ہیں۔لاہور کے اخبار مخزن اور سارے ہندوستان کے اردو اخبارات میں شائع ہوئیں۔اقبال نے کئی انگریزی نظموں کا منظوم آزاد ترجمے کیے۔1905 میں اقبال لندن کے لیے روانہ ہوئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے فلسفہ و اخلاقیات میں ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر جرمنی گئے اور فنون اور ادبیات کے مطالعہ میں مشغول ہوئے۔

دانایان فرنگ اور دانشوران مغرب کی صحبتوں میں رہے۔ لندن میں کچھ عرصے تک عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انھوں نے یورپ کی دانش گاہوں سے اور دانشوروں سے پورا استفادہ کیا۔ اقبال کے کلام میں پیکر تراشی بھی ہے منظر نگاری بھی ہے، ترنم اور موسیقیت بھی ہے۔ ان کی تشبیہات اور استعارات نئے انداز کے ہیں۔ انھوں نے جلال الدین رومی کے متصوفانہ کلام سے خاص طور پر استفادہ کیا اور تہذیب مغرب پر ایسی تیر بہ ہدف تنقیدیں کیں کہ اقبال کے کلام کے پڑھنے والوں پر سے مغربی تہذیب کا رعب ختم ہوا۔ اقبال نے اسلام کی تعلیمات کی طرف لوٹنے اور عشق نبوی کو دل میں بسانے کی اثر انگیز تلقین کی اور دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے خودی میں ڈوبنے کی نصیحت کی۔ شاہین اقبال کا ایک بہترین استعارہ ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے مرد مسلماں میں پھر عقابی روح پیدا ہو اور تاکہ ان سرچشموں تک پہنچنا ان کے لیے آسان ہو۔ اقبال کی تصنیفات میں علم الاقتصاد اور فلسفہ عجم بھی ہے اور ان کے وہ لیکچرس بھی ہیں جو انھوں نے مدراس میں ''خطبات تشکیل جدید علوم الٰہیہ'' کے عنوان سے انگریزی میں دیے تھے۔ اس کے ساتھ فارسی میں ان کا دیوان ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' پیام مشرق۔ زبور عجم۔ جاوید نامہ ہے۔ ان کے علاوہ بانگ درا، ضرب کلیم، بال جبریل اور ارمغان حجاز ان کے اردو دیوان ہیں۔ اقبال عظیم شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ بہت بڑے مفکر اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے محرک اور پیغامبر تھے۔

اقبال کا عہد وہ عہد تھا جس میں پہلے سرسید نے مادہ پرستی اور دنیوی فلاح کا نسخہ یہ تجویز کیا تھا کہ انگریزی زبان اور انگریزوں کی تہذیب اور ان کے علوم میں مسلمان دست گاہ حاصل کریں۔ اس نسخہ کے خلاف ردعمل پہلے اکبر الہ آبادی کا اور علامہ شبلی نعمانی کا سرسید کی زندگی میں آچکا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس دور کے علما نے جن میں سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی وغیرہ نے بھی سرسید کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا تھا۔ دارالمصنفین (اعظم گڑھ) جیسے عظیم تصنیفی ادارے کا مقصد اسلامی افکار کا فروغ اور مشاہیر اسلام پر اردو میں عالمانہ اور تحقیقی کتابیں لکھنا تھا۔ ان شخصیتوں کے بعد علامہ اقبال کی ایک طاقتور شخصیت ابھری جنھوں نے افکار اسلامی کو ایک نئے اسلوب اور طاقتور پیرایہ بیان میں پیش کیا اور مغربی تہذیب کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ اقبال کے یہاں مرد مومن ایک استعارہ ہے جس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی

ہیں جو عظمت رفتہ کی باز آفرینی اور طاقت وشوکت کے حصول کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ مرد مومن کے بارے میں اقبال کے یہ اشعار دیکھیے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں کار کشا و کارساز
ہر لحظہ مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اقبال نے خودی کے بارے میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار۔

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ کشاں لا الہ الا اللہ
خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

اقبال نے ربط ملت کا تصور ابھارا اور تعمیر ملت کے لیے توحید پر ایمان اور رسالت پر ایقان کامل کی دعوت دی۔ انھوں نے اسلامی غیرت وحمیت اور خود شناسی کا پیغام دیا۔ اقبال نے مغرب کے علوم نو سے بھی استفادہ کیا۔ لیکن بنیادی افکار قرآن وحدیث سے حاصل کیے۔ اقبال مجموعی طور پر ایک مینار نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے اکتساب فیض کرنے اور ان سے متاثر ہونے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ انھیں بجا طور پر بیسویں صدی کا مفکر اور مجدد اور عہد آفریں شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کے کچھ اور اشعار بطور مثال درج کیے جاتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

خود بہ خود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

مولانا حسرت موہانی (1882 تا 1951)

حسرت موہانی کا نام سید فضل الحسن تھا۔ شاعری میں ان کا شمار غزل کے مجددین میں ہوتا ہے۔ کیونکہ ان سے پہلے بہت سے مصلحین امت کا خیال تھا کہ اردو شاعری میں غزل ایک بے مقصد چیز ہے۔ کیونکہ اس میں اصلاح کا کوئی پیغام نہیں ہے۔ مولانا حالی نے غزل کو بیکار قرار دیا۔ سرسید احمد خاں بھی مخالف ہوئے۔ شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد نے بھی غزل سے بے اعتنائی برتی اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ غزل کا دور میر تقی میر یا غالب پر ختم ہوا۔ غزل مورد الزام ٹھہری اور نظم کا چراغ روشن ہوا اس ماحول میں شاد عظیم آبادی نے پوری طاقت کے ساتھ غزل کا چراغ روشن کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب حسرت موہانی نے دنیائے شاعری میں قدم رکھا تو تمام اصناف سخن میں غزل کو سب سے زیادہ موزوں پایا۔ انھوں نے غزل کو نئی زندگی، نیا آہنگ اور نیا وقار عطا کیا۔ حسرت موہانی کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ ایک آتش کدہ بن گیا تھا، انھوں نے انگریزوں کی مخالفت کی اور اس کے لیے ان کو جیل بھی جانا پڑا اور قید با مشقت کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اس لیے ان کا شمار مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے اور یہ ان کا شعر ہے ۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہے سزا دے لو جی کھول کے کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

مطالعہ کے بے حد شوقین تھے، قدیم ادب اور شاعری کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے غالب کے دیوان کی ایک شرح لکھ ڈالی۔ قید و بند کی مصیبتوں کے زمانے میں انگریزوں نے ان کا سارا کتب خانہ جلا ڈالا تھا۔ وہ انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، پارلمنٹ کے رکن بھی بنائے گئے اور دستور ساز اسمبلی میں بھی شریک ہوئے لیکن ہر جگہ حق گوئی اور بے باکی کو اپنا شیوہ بنایا۔

حسرت سیاسی لیڈر اور مجاہد آزادی تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بہت شوخی اور کہیں کہیں رنگینی بھی ہے۔ وہ محبت و عشق کی وارداتوں کی ایسی منظر کشی کرتے ہیں کہ یہ احساس ہوتا ہے کہ سامنے پردۂ سیمیں پر محبت و عشق کے مناظر دکھائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے محبت کے احساسات کو بے تکلف بیان کیا ہے لیکن فحاشی اور عریانیت سے اپنا دامن بچایا ہے۔ ان کی ایک نظم نما غزل جو بہت مقبول ہوئی ہے یہ ہے ۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
با ہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگا نا یاد ہے
تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بے باک ہوجانا مرا
اور ترا دانتوں پہ وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونہ دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا منہ کو چھپانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پر ننگے پیر آنا یاد ہے
آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

حسرت کی بہت سی غزلیں سادگی کے ساتھ پرکاری کا نمونہ ہیں جیسے یہ اشعار ۔

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ خوبیٔ قسمت پر اپنے ناز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
حسن بے پروہ کو خود بیں وخود آرا کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا
غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

حسرت موہانی نے خود اپنے بارے میں بجا طور پر کہا ہے ۔

دیار شوق میں برپا ہے ماتم مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاک باز اس کا

فانی بدایونی (1879 تا 1941)

فانی بدایونی ان شعرا میں ہیں جن کے یہاں غم کی زیریں لہر بہت تیز ہے۔ محرومی اور ناکامی کا احساس بہت گہرا ہے وہ اپنے آپ کو دنیا کے بلا کشان درد والم میں سے ایک سمجھتے ہیں، ان کی اپنی زندگی گھٹن میں گذری، انھوں نے جبر واختیار مسرت والم اور ہستی اور نیستی کے تصورات کو اپنے اشعار میں سمو دیا ہے۔

فانی کا پورا نام محمد شوکت علی خاں تھا۔ فانی کے اجداد کابل سے ہجرت کر کے ہندوستان آ کر مغربی اتر پردیش کے ضلع بدایوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ عربی فارسی کے علاوہ انھوں نے

علی گڑھ سے بھی تعلیم حاصل کی اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن ان کی ساری توجہ شعر و ادب کی طرف تھی۔ 1927 میں وہ حیدر آباد آئے جس سے مہاراجہ کشن پرشاد سے ان کے اچھے مراسم ہو گئے، ایک مدرسہ کے صدر مدرس ہو گئے۔ یہاں ان کی شریک حیات اور ایک جواں سال لڑکے کا انتقال ہو گیا، ان کی زندگی معاشی پریشانی میں گذری۔ اس کی وجہ سے ان کی زندگی میں مایوسی اور اداسی بہت تھی، چنانچہ زندگی سے متعلق ان کا رویہ منفی نظر آتا ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے ؎

میری حیات ہے محروم مدعائے حیات
وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مرمر کے جیے جانے کا

اور آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امنڈ آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

شوق کی ناکامی کی بدولت کوچہ دہلی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ختم ہوئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

منزل عشق پر تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور وکفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ فانی اتنے غمگین شخص نہیں جتنے غمگین شاعر ہیں۔غم کا ذکر جس رکھ رکھاؤ سے انھوں نے کیا ہے اس سے غم غم نہیں رہا، ایک انداز فکر، آرٹ اور عبادت بن گیا۔فانی کے یہاں موت ایک انفرادی ردعمل اور سارے غموں کا حل ہے۔ان کے یہاں زندگی کی نفی پائی جاتی ہے، شاید وہ چاہتے ہیں کہ اس سے درد کا احساس کم ہو جائے، وہ موت کی حسرت کرتے ہیں اور اس کا انتظار کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ۔

آج یوم وصال ہے فانی
موت سے ہو رہے ہیں راز ونیاز

اصغر گونڈوی (1884 تا 1936)

عصر حاضر میں اقبال کے عہد کے بعد اردو کے چار مشہور غزل گو شعرا ہوئے جنھیں غزل کے ستون کہا جاتا ہے ان میں ایک اہم ستون اصغر گونڈوی ہیں۔ان کی شاعری عظیم ہے اور اس عظمت کا دارومدار زبان وبیان پر قدرت کے ساتھ قوت متخیلہ پر ہے۔اچھا شعر دراصل حسن تخیل اور حسن بیان کا مجموعہ ہوتا ہے، بیسویں صدی کے ممتاز سائنس داں ڈاکٹر آئن اسٹائن سے جب کسی نے یہ سوال کیا کہ انسان کے لیے علم کی زیادہ اہمیت ہے یا عقل کی انھوں نے جواب دیا کہ نہ علم نہ عقل بلکہ سب سے زیادہ اہم چیز انسان کی قوت متخیلہ ہے اور قوت خیال کے بغیر نہ علم سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل سے۔نمونے کے طور پر اصغر گونڈوی کے یہ اشعار دیکھیے ۔

بہت سمجھے ہوئے ہیں شیخ راہ ورسم منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادہ منزل سمجھتے ہیں

کہہ کے کچھ لالہ وگل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

تم سامنے کیا آئے اک طرفہ بہار آئی
آنکھوں نے میری گویا فردوس نظر دیکھا

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

یہاں کوتاہیء ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہی صیاد ہوتا ہے

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

ردائے لالہ وگل پردہ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

اصغر گونڈوی کی شاعری میں یاس اور محرومی کے شکوے کے بجائے شگفتگی، رنگینی، روحانیت، بلند ہمتی، تخیل کی بلندی اور مفکرانہ گہرائی ہوتی ہے۔ اصغر کو تصوف سے بڑا تعلق خاطر تھا، اکثر وہ اوراد اور ریاضت روحانی میں مشغول رہتے تھے، نہایت متقی اور پرہیز گار تھے، شاہ عبدالغنی منگلوی کے حلقہ ارادت میں شامل تھے، انھوں ایک سہ ماہی رسالہ ''ہندوستانی'' کی ادارت بھی انجام دی۔ لوگ ان کے رشحات قلم کو نہایت دلچسپی سے پڑھتے تھے، سر تیج بہادر سپرو اور مولانا آزاد بھی ان کے زور قلم کے معترف تھے اور جب اصغر گونڈوی کا دیوان ''نشاط روح اور سرور زندگی'' شائع ہوا تو اس پر ان دو حضرات نے تقریظ لکھی اور اصغر کے کلام کی عظمت کا اعتراف کیا۔ مولانا آزاد نے یہ جملہ لکھا: ''اگر تقریظ لکھنے کی فرمائش خود صاحب کلام کرتے تو میں شاید معذرت کر دیتا لیکن یہاں خود کلام یہ فرمائش کر رہا ہے اس لیے معذرت نہیں کر سکتا''۔

جگر مرادآبادی (1890 تا 1960)

انسان زمین پر رہنے والی ایک مخلوق ہے اور وہ صاحب عقل مخلوق ہے، اس کی فطرت

میں ایک اور کیفیت ہے جس کو عشق کہا جاتا ہے۔ عشق وہ جذبہ ہے جو اپنے سے برتر ہستی کا قرب چاہتا ہے بلکہ اس میں سما جانا چاہتا ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو بے مقصد زندگی کو با مقصد بناتا ہے۔ انسان کی فطرت میں یہ جذبہ ودیعت کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان برتر ہستی سے قرب کی کوشش کرے۔ یہی وہ عشق حقیقی ہے جس کی تلاش میں اور جس کے حصول میں تمام صوفیہ کرام کوششوں میں لگے رہے۔ ہماری اردو شاعری کا بڑا حصہ عشق اور داستان عشق پر مشتمل ہے، یہ عشق عشق حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور عشق مجازی بھی ہوسکتا ہے۔ اس عشق کی نغمہ سرائی میں جن شاعروں نے اپنی پوری شاعری کو وقف کیا ان میں ایک بہت اہم نام حضرت جگر مرادآبادی کا ہے۔ انھوں نے عشق کے ہر عنوان کو اپنی غزل کا موضوع بنایا اور اسی لیے ان کے کلام کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی کیفیت عشق کو غزل میں ڈھال دیا، بیسویں صدی میں غزل کے چار ستون تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایک حسرت موہانی دوسرے اصغر گونڈوی تیسرے فانی بدایونی اور چوتھے جگر مرادآبادی۔

جگر کا پورا نام علی سکندر تھا، ان کے آبا و اجداد مغلیہ دور میں دہلی میں مقیم تھے، ان کے موروث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کی سکونت ترک کر کے مرادآباد آ گئے تھے۔ جگر مرادآبادی مرادآباد سے منتقل ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے، لکھنؤ کا ماحول شعر و ادب کا ماحول تھا۔ ابھی ان کی عمر تیرہ چودہ برس کی تھی کہ انھوں نے غزلیں کہنا شروع کر دیں تھی، ان کی غزلوں کی اہم خصوصیت ان کا سیل ممتنع ہونا ہے۔ جگر کے یہاں عشق کا جذبہ بہت شدید ہے، انھوں نے سادہ زبان میں اپنے محسوسات کو منعکس کیا ہے۔ جگر کی شاعری میں درد کا عنصر کم ہے، لیکن اس کی ہلکی سی لہر محسوس ہوتی ہے۔ جگر کا دل محبت کا شیدائی رہا ہے، انھوں نے عشق مجازی کی راہ سے عشق حقیقی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور صنم خانے کی راہ سے کعبہ کی شاہراہ تلاش کی ہے۔ ساقی کوثر تک پہنچنے کی طلب میں ان کے نعتیہ اشعار بھی موجود ہیں، جگر مرادآبادی کو شہنشاہ متغزلین کہا جاتا ہے اور شاعر فطرت شاعر محبت کے نام سے بھی ان کو جانا جاتا ہے، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی، ان کے اشعار نمونے کے طور پر حسب ذیل ہیں۔

ایک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جگر مرادآبادی نے اپنی زندگی میں جو آخری غزل کہی تھی، اس کا ایک شعر ہے جو ترجمان حقیقت بن گیا۔

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

جگر مرادآبادی کے تین مجموعے شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ ایک کا نام ہے داغ جگر دوسرے کا نام ہے شعلہ طور اور تیسرے کا نام ہے آتش گل۔ ان کا آخری مجموعہ کلام آتش گل ہے، جس کی چھوٹی بحر کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے — عشق ہے کار شیشہ و آہن
خیر مزاج حسن کی یا رب — تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
ہستی شاعر اللہ اللہ — خاک نشیں اور عرش نشیمن
کامل رہبر قاتل رہزن — دل سا دوست نہ دل سا دشمن

جمیل مظہری (1905 تا 1980)

جمیل مظہری اس عہد کے ان شعرا میں ہیں جن کے کلام میں کلاسیکل پختگی ہے پورا کلام عروض اور فکر و فلسفہ کے اعتبار سے پختگی اور مہارت اور استادانہ شان کا حامل۔ کم شعرا ہوں گے جو زبان پر گرفت اور فن کی پختگی کے اعتبار سے جمیل مظہری کا مقابلہ کر سکیں گے ان کا ایک شعر بہت مشہور ہوا اور اس مفہوم کا شعر اردو شاعری میں پایا نہیں جاتا ہے اور وہ شعر یہ ہے۔

بقدر پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ سرور پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

عمیق افکار کو شعر کا جامہ پہنانے میں جمیل مظہر کو کمال حاصل ہے دور جدید کی شاعری میں جمیل مظہری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ان کا نام کاظم علی تھا اور جمیل تخلص تھا۔جمیل مظہری عظیم آباد کے رہنے والے تھے، ہندوستان کے مشہور ادبی رسالوں میں ان کا کلام چھپتا رہا اور وہ کلکتہ میں اردو صحافت سے بھی وابستہ رہے۔اچھا شاعر وہ ہوتا ہے جس پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔جگر مرادآبادی پر بھی یہ کیفیت طاری رہتی تھی۔بے خودی سے مراد شراب کا نشہ نہیں ہے بلکہ ایک وارفتگی کی کیفیت ہے۔جس زمانہ میں وہ پٹنہ کالج میں استاد تھے تو اکثر جلتی ہوئی سگریٹ کو قلم سمجھ کر شیروانی کی جیب میں ڈالنے لگتے تھے چنانچہ ان کی شیروانی کی جیبیں سوز آتش سے جل جایا کرتی تھیں پھر دھواں سا دل سے اور جان سے نہیں بلکہ شیروانی کی جیب سے اٹھتا تھا۔آثار جمیل، وجدان جمیل،عرفان جمیل،فکر جمیل،نقش جمیل ان کی ادبی کاوشوں کے مرقعے ہیں ان کے چند اشعار ہیں۔

سحر کے جو انتظار میں ہیں پکار کر کوئی ان سے کہہ دے
کہ صرف ظلمت کی سینہ چاکی کوئی دلیل سحر نہیں ہے

جمیل کا سوز ناتمامی لطیف جذبوں کی تشنہ کامی
یہی تو وہ خون آرزو ہے جو رنگ لاتا ہے شاعری میں

جوش ملیح آبادی (1986 تا 1982)

جگر مرادآبادی اگر غزل کے اہم ستون تھے تو جوش ملیح آبادی اردو نظم کی شوکت عمارت، ذخیرہ الفاظ ان کے پاس جس قدر تھا، اتنا کم شعرا کے پاس ہوتا ہے۔میر انیس کے بعد سب سے زیادہ جس شاعر کے یہاں شوکت الفاظ کی گھن گرج ہے وہ جوش ملیح آبادی ہیں، انھوں نے ایک عظیم ذخیرہ ادب نظم ونثر کی شکل میں چھوڑا ہے۔ابتدا میں جوش کے لیے لوگوں نے مصور جذبات کا لقب استعمال کیا تھا اور بعد میں بعض لوگوں نے انھیں شاعر فطرت کہا اور کچھ لوگوں نے شاعر شباب کا نام بھی دیا اور پھر شاعر اعظم اور شاعر انقلاب کا اعزاز بھی انھیں بخشا گیا۔

جوش ملیح آبادی کا نام شبیر حسین خان تھا، عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ملیح آباد میں

حاصل کی۔ فارسی انھوں نے مرزا محمد ہادی رسوا سے پڑھی، سیتا پور لکھنؤ اور علی گڑھ اور آگرہ کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی رسمی تعلیم تو بہت زیادہ نہ ہوسکی لیکن مطالعہ کتب کے شوق نے ان کو ایک بڑا عالم اور دانشور بنا دیا تھا۔ زندگی کے رموز اور فطرت کے اسرار پر غور وفکر کی عادت نے ان کے اندر فکر وخیال کی بلندی پیدا کر دی تھی۔ جوش نے نو سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے والد نے شروع میں ان کو شاعری سے روکا لیکن جب ان کے شوق بے نہایت کو دیکھا تو عزیز لکھنوی سے تلمذ اختیار کرنے کی تلقین کی، جس کی وجہ سے ان کو زبان اور عروض کے رموز ونکات معلوم ہوئے، بعد میں سلیم پانی پتی نے 1914 میں جوش کو تنگ نائے غزل سے نکل کر نظم کے وسیع سمندر میں کود پڑنے کی تلقین کی۔ 1920 میں ان کے مجموعہ کلام ''روح ادب'' کی اشاعت ہوئی۔ بعد میں اعزہ کی بے گانہ روش اور بعض دوسرے اسباب کے تحت انھوں نے ملیح آباد چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ 1924 میں حیدرآباد کے مہاراجہ کرشن پرشاد کے نام علامہ اقبالؔ، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبرالہ آبادی اور مولانا سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط لے کر جوش ملیح آبادی حیدرآباد آگئے۔ انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں ان کو ملازمت ملی۔ بعد میں وہ ناظر ادبی کے عہدے پر مقرر کیے گئے، بعد میں ایک غلطی کی وجہ سے وہ معتوب ہوئے اور ان کو 1934 میں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے دارالترجمہ میں نو برس تک کام کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی دہلی میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں سے انھوں نے ''کلیم'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالا اور دہلی ہی سے ان کے دو مجموعے ''نقش ونگار'' اور ''شعلہ وشبنم'' بھی شائع ہوئے۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں انقلابی اشعار بھی بہت ہیں، ان کی ایک نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' بہت زیادہ مقبول ہوئی ہے۔ 1947 کے بعد آزاد ہندوستان کے حالات نہایت دل شکن تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ''ماتم آزادی'' میں کیا ہے، جوش ملیح آبادی دہلی سے نکلنے والے سرکاری ماہنامہ ''آج کل'' کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ 1956 میں بعض حالات کی وجہ سے وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور یہیں سے ان کا زوال شروع ہوا۔ پاکستان پہنچ کر وہ حکومت کے معتوب رہے اور تمام سرکاری تقریبات اور ریڈیو ٹیلی ویژن کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے۔ آخر میں وہ بہت بیمار ہوئے، حکومت کا عتاب جوش پر اتنا زیادہ رہا

کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے اعزا سے کہا گیا کہ اگر میت کو گھر لے جانا ہے تو ایمبولینس میں پٹرول ڈلوالیں۔ ان کا سوگ پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں منایا گیا۔ جوش ملیح آبادی کے اٹھارہ شعری مجموعے اور چار نثری کتابیں شائع ہوئی ہیں، نثر میں ان کی خودنوشت سوانح حیات ''یادوں کی برات'' بھی شامل ہے، اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات بیان کیے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کے کچھ اشعار دیکھیے ۔

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے صبح کافی تھی

نظر اٹھی تو گلاب دیکھا پلک جو جھپکی تو خواب دیکھا
سنا کہ فصل گل آرہی ہے چمن میں پہنچے تو جارہی تھی

نظر نے دیکھا تو شوخ تتلی فضا میں پرواز کررہی ہے
نگہ جمائی تو گرد ٹپکی ہواؤں میں تھرتھرا رہی تھی

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

مجھ کو تو کچھ ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

خورشید شفق میں ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب افق کے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا دریا کا تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل تھرانے لگا

فراق گورکھپوری (1896 تا 1984)

فراق گورکھپوری کا اصلی نام رگھوپتی سہائے ہے، ان کی ولادت گورکھپور کے ایک کائیستھ خاندان میں ہوئی۔ جدید شاعری میں فراق کا مقام بہت بلند ہے۔ عہد جدید کی شاعری پر فراق کے اثر کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی ادب سے بھی ان کو شغف رہا، انگریزی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا، تنقید میں رومانی تنقید کی ابتدا فراق سے ہوئی۔ فراق گورکھپوری انڈین سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے لیکن گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی حمایت میں استعفیٰ دے دیا، جس کی پاداش میں انھیں جیل جانا پڑا۔ وہ الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی زبان کے لیکچرر مقرر ہوئے اور یہیں سے ان کی اردو شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ شاعری میں ان کی شہرۂ آفاق کتاب گل نغمہ'' ہے جس کو ہندوستان کا اعلیٰ معیار ادب ''گیان پیٹھ'' انعام بھی ملا اور وہ آل انڈیا ریڈیو کے پروڈیوسر بھی رہے۔ 1960 میں انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا 1968 میں پدم بھوشن کا اعزاز ملا، 1981 میں غالب اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

فراق گورکھپوری اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو مطالعہ میں غرق رکھا، صرف اردو کی کلاسیکل شاعری کا نہیں بلکہ ہندی ادب کا بھی اور انگریزی ادبیات کا بھی بہت گہرا مطالعہ کیا۔ الہ آباد یونی ورسٹی میں ہی وہ انگریزی کے استاد ہوئے، انھیں مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے قریب ہونے اور ان کی صحبتوں سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، ہمعصر شعرا میں جگر مرادآبادی اور جوش ملیح آبادی سے ان کے گہرے تعلقات رہے۔ فراق گورکھپوری جدید عہد کے اتنے اہم شاعر ہیں کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بحیثیت مجموعی ان کی شاعری رومانی شاعری ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ انگریزی کے رومانی شعرا شیلی، کیٹس اور ولیم ورڈس ورتھ کی رومانی شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھے، ان کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

کون سکون دے سکا غم زدگان عشق کو
بھیگتی راتیں بھی فراق آگ لگا کے رہ گئیں
تیرے خرام ناز سے آج وہاں چمن کھلے
فصل بہار تھی جہاں خاک اڑا کے رہ گئیں

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسہ بھی نہیں

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں چادر تان لیتے ہیں

تیرا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو میری دنیائے آبرو نہ بنا

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

ایک مدت سے تیری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

رکی رکی سی شب مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ زندگی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو
یہ سکوت ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو
نکہت زلف پریشاں داستان شام غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

فیض احمد فیض (1912 تا 1984)

فیض احمد فیض سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی انداز میں ہوئی۔ انھوں نے فارسی اور عربی زبانیں سیکھیں، لاہور سے عربی اور انگریزی میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔ 1936 میں امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے، بعد میں کچھ دنوں فوج میں ملازمت بھی اختیار کی۔ تقسیم ہند کے بعد انگریزی اخبار پاکستان ٹائمس کے مدیر رہے اور پھر راولپنڈی سازش کیس میں ان کو گرفتار کیا گیا اور انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کی شاعری مقبول خاص و عام ہوئی، انھوں نے روس انگلینڈ اور متعدد ممالک کا سفر کیا۔ چونکہ وہ ترقی پسند تحریک کے سرخیل اور ممتاز شاعر تھے۔ اس لیے روسی حکومت کی نظر کرم ان پر رہی۔ روسی حکومت نے ان کی نظموں کے ترجمے شائع کیے اور بین الاقوامی ''لینن امن انعام'' سے انھیں سرفراز کیا، فیض کی شاعری کو جس چیز نے مقبولیت اور شہرت عطا کی وہ ان کی خاص نظریات ہیں اور اسی کے ساتھ خیالات کی بلندی ہے۔ نوع بشر کی فلاح بھی ان کا خاص موضوع ہے اور وہ اپنے مقصد کے لیے ہر رنج و محن کو برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، پھر اپنے احساسات کے

اظہار نہایت خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں ۔

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض کی پرورش شعر وادب کے ماحول میں ہوئی۔ کالج کی تعلیم کے زمانے سے شعر کہنے لگے تھے، شروع شروع میں ان کی شاعری کا موضوع عشق مجازی تھا، جو اکثر نوجوان شاعروں کا موضوع رہتا ہے۔ ان کے زمانے میں حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی نے عام انسان کے محسوسات کا ذکر کیا تھا اور غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ دنیا میں ایک طرف سامراجی نظام کے خلاف تحریک شروع ہو کر دنیا کے بہت سے حصوں میں پھیل گئی تھی، فیض احمد فیض بھی اس تحریک سے متأثر ہوئے اور ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے اور مزدوروں اور کسانوں کی مظلومیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے لگے۔ انھوں نے نوع بشر کی فلاح کے لیے جس راستہ کو چنا تھا، اس راستہ پر وہ اس لیے گامزن ہوئے کہ یہی راستہ ان کے نزدیک حقیقی مسرت کا سرچشمہ تھا، ان کا ایک شعر ہے ۔

شمع نظر ، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تیری محفل سے آئے ہیں

فیض احمد فیض نے اپنے فن کو اپنی تحریکی زندگی کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنے خیالات اور محسوسات کو فن کی تمام روایات کو برتتے ہوئے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے کبھی شدید تنہائی کا احساس بھی کیا، ان کی نظم تنہائی رموز و کنایات کا ایک خوبصورت مرقع ہے ۔

پھر کوئی آیا ہے دلدار، نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات ،بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سو گئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں ، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

فیض کا محبوب بہت دل کش تھا، جب اس سے ملنے کے لیے جاتے تھے، تو جو احساسات ہوتے تھے وہ کچھ اس طرح تھے ۔

رنگ پیراہن کا ، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمھارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

غم جاناں کے بارے میں اور حسن محبوب کے بارے میں تو اشعار سیکڑوں شعرا نے کہے ہیں لیکن انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کا رشتہ ایک نیا تجربہ تھا اور یہاں فیض کی ایک منفرد آواز بلند ہوتی ہے ۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

فیض کے پانچ شعری مجموعے ہیں، نقش فریادی، دست صبا، زندان نامہ، دست تہہ سنگ، اور سر وادی سینا فیض کی غزلوں میں تغزل اور ترنم بہت زیادہ ہے، کچھ منتخب اشعار درج ذیل ہیں ۔

ویراں مے کدہ ہے خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

شیخ صاحب سے رسم وراہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

مقام فیض کو ئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت نا گوار گذری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

نہ رہا جنون رخ وفا، یہ رسم یہ دار کرو گے کیا
جنھیں دل میں عشق کا ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

مجروح سلطان پوری (پیدائش 1915)

مجروح سلطان پوری کا اصل نام اسرار الحسن خان تھا۔ ان کی پیدائش 1909 میں اعظم گڑھ میں ہوئی۔ اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور آگے کی تعلیم کے لیے الہ آباد گئے وہاں سے عربی کے امتحانات مولوی اور عالم پاس کیے اور لکھنؤ پہنچ کر طب یونانی کی تعلیم حاصل کی اور طبابت کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا، لیکن اس پیشہ سے ان کو زیادہ مناسبت نہیں تھی۔ وہ شاعر تھے

انھوں نے شاعری شروع کی اور ہر طرف مقبول ہو گئے۔ فلمی دنیا میں بھی کچھ عرصہ تک رہے اور فلموں کے لیے گیت لکھتے رہے۔ مجروح غزل کے شاعر ہیں اور ترقی پسند تحریک نے غزل کو اس لیے اہمیت نہیں دی کہ غزل اس طرح پیغامبری نہیں کر سکتی جس طرح نظم کر سکتی ہے۔ غزل نے آخر کار اپنی توانائی کا لوہا منوالیا، غزل اشارے اشارے میں ہر بات کہہ جاتی ہے اور اس طرح کہ دل پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مجروح کی غزل زمانے کے تقاضے سے منہ نہیں موڑتی ان کی غزل میں زمانہ کی ناسازگاری کا ذکر ضرور ہے لیکن سپر انداز ہونے کا رویہ نہیں بلکہ نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ہے۔ یہ زندگی کا ترقی پسند رویہ ہے اور انھیں ان شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے جنھوں نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی اور مظلوم کے لیے سینہ سپر ہو گئے، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

اور

فراز دار پر رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے
جلا کہ مشعل دل ہم جنوں صفات چلے جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

اور

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ
میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروح غزل کے شاعر ضرور ہیں لیکن روایتی غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ انھوں نے غزل کی مریضانہ ذہنیت کو دور کیا اور اسے مردانہ للکار عطا کی اسے ایک ہمت افزا پکار سے آشنا کیا ان کی غزل میں زمانہ کا عکس ہے اور حالات کا کرب اور شعور ہے، عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود ان کی غزل غزل رہی اور غزل کی تمام خصوصیات آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما رہیں ان کے مجموعۂ کلام کا نام غزل ہے اس سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

حادثے اور بھی گذرے تری الفت کے سوا ہاں مجھے دیکھ مجھے، اب مری تصویر نہ دیکھ
دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
کچھ بھی ہوں پھر بھی دکھے دل کی صدا ہوں ناداں میری باتوں کو سمجھ تلخی تقریر نہ دیکھ

مخدوم محی الدین (1908 تا 1969)

مخدوم محی الدین تمام ترقی پسند شعرا میں اپنی اشتراکیت پسندی نیز انقلابی اور رومانی لہجے میں ممتاز ہیں۔ ترقی پسندی کی تحریک اس لیے قائم ہوئی تھی کہ ادیب اس کے ذریعہ اور تحریک کے پلیٹ فارم سے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچائیں اور دوسروں کو متاثر کریں گویا ادب کا مقصد سماجی زندگی کو متاثر کرنا تھا۔ مخدوم محی الدین بحیثیت شاعر و فنکار اپنی سماجی ذمہ داریوں سے واقف ہیں، ان کی شاعری میں ظلم اور بربریت کے خلاف بغاوت ہے۔ غریب اور پسماندہ طبقہ سے اظہار ہمدردی ہے اور ان کا استحصال کرنے والے سرمایہ داروں سے نفرت وحقارت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔

مخدوم محی الدین ابتدا سے انقلاب پسند واقع ہوئے تھے، پھر ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے بھی ان کے فکر وخیال کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا، چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو عوام کے لیے وقف کر دیا، کسانوں میں بیداری پیدا کی اور زمین داروں اور سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کے لیے ان کے ذہن ومزاج کو تیار کیا۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد وکرب تھا وہ انسانی معاشرے کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پستی سے نکال کر بلندی پر لے جانا چاہتے تھے۔

فیض احمد فیض، مجاز، ساحر لدھیانوی، شمیم کرہانی اور احمد ندیم قاسمی جیسے ترقی پسند شعرا کی طرح مخدوم کی شاعری میں بھی رومان اور انقلاب کا حسین وجمیل امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں، جن میں بھرپور رومانیت ہے، انھیں میں سے ایک نظم ''منڈوے تلے'' ہے اور اسی طرح سے ''چارہ گر'' مخدوم کی رومانی نظم میں بہت نمایاں ہے اور یہ کامیاب نظم ہے۔ اس کے مطالعے سے شاعر کی جمالیاتی حس کا پورے طور پر اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس نظم کے علاوہ ''رقص گل''، ''ہم دونوں'' اور'' فاصلے'' وغیرہ بھی اہم نظمیں ہیں۔ ان کی رومانی نظموں میں مناظر فطرت کی حسین جلوہ گری پائی جاتی ہے، یہ خصوصیت ان کے نظموں کو بلندی تک لے جاتی ہے۔ ان کی جو عشقیہ اور رومانی نظمیں ہیں ان میں ایک عجیب شادابی کا احساس ہوتا ہے، مخدوم محی الدین کی انقلابی شاعری ان کو دوسرے شعرا سے بہت ممتاز کرتی ہے، اس شاعری میں انقلاب کی دعوت بھی ہے اور لطافت اور رعنائی بھی موجود ہے، ان کی نظم ''دھواں'' سے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

عشرت وعیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دل زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشم گناہ گار نے یہ بھی دیکھا
خون دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

مخدوم محی الدین نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی لکھی ہیں، ان کی غزلیں ان کے نقطۂ نظر اور نصب العین کی نقیب ہیں، فنّی اعتبار سے کامیاب بھی ہیں۔ ان میں فنی رچاؤ، نزاکت ولطافت اور شیرینی پوری طرح موجود ہے۔ مخدوم محی الدین مزاج عروس غزل کے رمز شناس تھے اور اس کے ناز وادا سے بھی واقف تھے ان کا یہ شعر ہے ۔

اٹھوں کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

ان کی ایک اور غزل کے چند اشعار دیکھیے ،الفاظ پھولوں کی طرح خوبصورت اور شگفتہ اور شاداب ہیں۔

روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں — اس میں وہ ایک نور جہاں دیکھتے چلیں
وا ہورہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ — انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھ کے چلیں
سرگوشیوں کی رات ہے رخسار ولب کی رات — اب ہورہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں
آنچل سے اڑ رہے ہیں فضاؤں میں دور دور — شاید وہی ہو جان بتاں دیکھتے چلیں

پرویز شاہدی (1910 تا 1968)

پرویز شاہدی بھی ترقی پسند شاعر تھے، ان کی شاعری میں بھی اشتراکیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ پیدا ہوئے تھے زمیندار گھرانے میں، لیکن جاگیردارانہ نظام کے شدید مخالف تھے، ان کا دل بہت حساس تھا اور ذہن میں کسانوں اور مزدوروں کی خستہ حالی کو دیکھ کر بغاوت پیدا ہوئی۔ وہ ہندوستانی عوام کی بدحالی اور افلاس کے لیے انگریزوں کو مورد الزام ٹھراتے تھے، اشتراکی نقطۂ نظر

انھیں بہت عزیز تھا۔ اشترا کی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں شیرینی اور نرمی پائی جاتی ہے۔ ان کا اپنا مخصوص طرز سخن ہے جس نے ان کی شاعری کو انفرادیت عطا کی ہے، اس میں ترنم ہے، نغمگی اور لطافت ہے اور بانکپن ہے، ان دو شعروں کو دیکھیے ۔

تمام پھیلی حلاوت کلام شیریں کی دکھائی نظم میں پرویز خسروی میں نے
تلخی زندگی ہی کا یہ فیض ہے کہ آج پرویز تیرا شاعر شیریں بیاں ہوا

پرویز شاہدی کے کلام میں رومان بھی ہے اور انقلاب بھی ہے۔ شاعر کا انقلابی رجحان اس کے رومان کی توسیع ہے اور فطری طور پر نمودار ہوا ہے۔ جیسے شاخ سے کلی پھوٹتی ہے اور جیسے درخت برگ و بار لاتے ہیں اور جیسے پھول کھلتے ہیں اور خوشبو پھیلاتے ہیں۔

پرویز شاہدی کی نظمیں تلوار، بنت ہمالہ، رجز انقلاب، خوش آمدید، بہت اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں، پرویز شاہدی کی نظم ''بنت ہمالہ'' بھی ایک خوبصورت نظم ہے، شاعر نے لفظوں سے مصوری کی ہے اور ترکیب و استعارہ سے نئی تعبیریں ایجاد کیں ہیں، جس کی وجہ سے اسلوب میں ندرت اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے ۔

آہ اے کوہ ہمالہ کے غرور سیال
تیری موجوں میں جمال اور ترے طوفاں میں جلال
ترے دامن پر کبھی بیٹھی نہ تھی گرد ملال
منہ ترا پونچھتا تھا چاند کا سیمی رومال
زخم سینے پے لیے آج ہیں دھارے ترے
اف کہاں ڈوب گئے چاند ستارے ترے

پرویز شاہدی کے بہت سے رومانی اشعار خاص و عام میں بہت مقبول ہوئے، انھیں میں سے چند اشعار یہ ہیں ۔

ان سے نظریں ابھی ملی بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو دل کہیں بھی نہیں
ساری باتوں کا ایک مطلب ہے
ان کی ہاں بھی نہیں نہیں بھی نہیں

روش صدیقی (1909 تا 1971)

عہد جدید کے شعرا میں روش صدیقی ایک خاص مرتبے کے مالک ہیں۔انھوں نے اگرچہ غزلیں بھی کہیں ہیں۔لیکن اصلاً وہ نظم نگار شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں بھی رومانی لے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں مناظر فطرت کی عکاسی بھی ہے اور عشق ومحبت کے جذبات بھی ہیں اور جذبۂ قومیت اور ملی احساسات بھی ہیں۔ بیداریٔ مشرق ان کا خاص موضوع ہے۔وہ مشرقی ملکوں کے خواب غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔روش صدیقی نے ایشیا کو ایک فکری اور روحانی رہنما کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ان کے یہاں گہری مذہبیت بھی پائی جاتی ہے اور جہاں جہاں انھوں نے عشق ومحبت کا اظہار کیا ہے ان میں پاکیزگی اور طہارت کا رنگ نمایاں ہے۔ان کی ایک نظم ''شاہد معصوم'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔وہ اپنے محبوب سے کہتے ہیں۔

میرے داغ دل ترے گلزار کے قابل نہیں — تیری الفت آہ مرے پیار کے قابل نہیں
یعنی میں تری محبت کے لیے ہوں نا سزا — بھول جا اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا
تو نگار عفت وعصمت ہے آوارہ ہوں میں — تو مقیم جلوہ گاہ راز اور رسوا ہوں میں
گر تجھے مجھ سے محبت ہے تو دے مجھ کو بھلا — بھول جا اے شاہد معصوم مجھ کو بھول جا

یہ نظم ایک معصوم حسن اور پاکباز عشق کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔اس میں عصمت واخلاق کی قدر وقیمت کا بھی اظہار ہے۔اس اعتبار سے روش نے رومانی تحریک کو ایک نئی سمت دی ہے اور وہ اردو کی رومانی شاعری میں انفرادی مقام پانے کے مستحق ہیں۔

روش صدیقی کے کلام میں انقلاب کا آوازہ بھی شامل ہے۔وہ لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ انقلاب کے خواہاں ہیں اور حق وصداقت کے علمبردار، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

اے جمال شمع آزادی کے پروانو اٹھو — سو چکے اے قصر ملت کے نگہبانو اٹھو
بادۂ بیداریٔ مشرق کے مستانو اٹھو — اب جگا بھی دو بہت کچھ سو چکا ہے آفتاب
انقلاب اے ساکنان ارض مشرق انقلاب

انقلابی آواز کا علم بہت سے شاعروں نے اٹھایا ہے۔ جوش اور مجاز، ساحر اور جاںنثار اختر اور مخدوم محی الدین ان میں سے ہر ایک کے یہاں انقلاب کے طبل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن روش صدیقی کے یہاں دعوت انقلاب میں اخلاق اور صداقت کا رنگ بہت نمایاں ہے اور جذبۂ حریت کے ساتھ پیغام حرکت و عمل بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے ''دل تنگ نہ ہو'' اس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

کیوں ہیں درماندۂ حسرت ترے عشقوں کے چراغ
حلقۂ انجمنِ نیم شبی باقی ہے
دل ہو بیدار تو ہیں شوق کے پیغام بہت
صبح باقی ہے نسیم سحری باقی ہے

مجاز لکھنوی (1909 تا 1955)

ہندوستان میں ترقی پسند شاعری کا کوئی تذکرہ مجاز کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ان کی عمر مختصر رہی لیکن اس مختصر عمر میں بھی انھوں نے جو مقبولیت حاصل کی وہ کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ مجاز کا مجموعہ کلام آہنگ منظر عام پر آیا تو ادبی حلقوں میں اس کو بڑی پذیرائی ہوئی۔ شجاعت علی نے انھیں اردو شاعری کی آبرو قرار دیا اور جعفر علی خاں نے انھیں اردو شاعری کا کیٹس بتایا۔ آہنگ میں مجاز کی ابتدا اپنے تعارف سے ہوتی ہے۔ شاعر نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔ شاعر کا نام اسرار الحق تھا۔

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنہ عقل سے بیزار ہوں میں
زندگی کیا ہے گناہ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اسرار الحق مجاز نے حسن و عشق کے گیت بھی گائے ہیں اور انقلاب کے ساز بھی چھیڑے ہیں۔ وہ ایک نئے اقتصادی نظام کے علمبردار ہیں اور اپنی نظموں کے ذریعہ رائے عامہ کو ہموار اور

بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے دھیمے دھیمے لہجہ میں انقلاب کا گیت گایا ہے اور اس گیت میں غنائیت ہے۔ رومانی لے کی وجہ سے انقلابی آواز کی تلخی، نرمی و شیرینی میں بدل جاتی ہے۔ انقلاب اور تغزل کا امتزاج مجاز کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ وہ ظلم و ستم کی دنیا سے بیزار ہیں۔ وہ اپنی الجھنوں کو اور اپنے غم حیات کو بے چینی اور کرب و اضطراب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے فکر و فن سے دور ایک نئی بستی بسانا چاہتے ہیں، ان کی ایک مشہور نظم ہے، اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں۔ چند اشعار دیکھیے ۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں یا اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز ایک ایسی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں امیری اور غریبی کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ ان کی نظمیں پیغام امن دیتی ہیں اور ماحول کی غلامی اور پستی سے نکالنا چاہتی ہیں۔ مجاز کو علی گڑھ یونیورسٹی سے بھی والہانہ لگاؤ تھا اور گہری عقیدت تھی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ مجاز ہی کا لکھا ہوا ہے۔ جواب یونی ورسٹی کی روایت کا ایک حصہ بن گیا ہے اور یونیورسٹی کے ہر پروگرام میں اسے گایا جاتا ہے۔

معین احسن جذبی (1912 تا 2005)

معین احسن جذبی عہد جدید کے شعرا میں ایک خاص مقام و مرتبے کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز ترقی پسند تحریک سے قبل ہو چکا تھا۔ ان کے ابتدائی کلام پر اصغر۔ فانی اور جگر کے رنگ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن جب ترقی پسند تحریک سامنے آئی تو بہت سارے نوجوان شعرا کی طرح جذبی بھی اس سے متاثر ہوئے۔ وہ ترقی پسند شاعر تو ضرور تھے لیکن وہ اپنی شاعری میں اس نظریہ کے پابند نہیں ہوئے اور نہ تحریکی نظریہ کو اپنی شاعری کے لیے انھوں نے ضروری تصور کیا۔ وہ اپنی شاعری میں ایک انسان دوست اور انسانیت نواز کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ وہ ترقی پسندی کے حامی بھی ہیں لیکن ترقی پسندی کے نظریات کو شاعری میں سمونا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لیے ترقی پسندی کی حمایت کے ساتھ ان کے یہاں اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اور اسی لیے بہت سخت گیر اور تشدد پسند ترقی پسندوں نے ان پر تنقید بھی کی ہے۔ جذبی غزل کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور ان غزلوں میں انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے یہ اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ کیجیے۔

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں
اے موج بلا کچھ ان کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

جب کشتی ثابت وسالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے
جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے
دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

جذبی کے اشعار میں نغمہ اور ترنم ہے۔ان کے اشعار خلوتوں میں گنگنائے جاتے ہیں اور نغمہ بن کر مدتوں گونجتے رہتے ہیں۔ بلکہ دلوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔

احسان دانش (1914 تا 1983)

احسان دانش مزدوروں غریبوں اور مفلسوں کے شاعر کہے جاتے ہیں ان کی شاعری غریب اور نادار طبقے کی منہ بولتی تصویر ہے۔رقص وسرور کی محفلیں ان پر گراں گزرتی ہیں۔ بیوہ کی خستہ حالی اور یتیم کی کس مپرسی سے ان کا دل بہت متاثر ہوتا ہے۔خود ان کا کہنا ہے کہ اس کشمکش اور کرب والم کے عالم میں صرف نماز کے ذریعہ مجھے روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ان کے یہاں گہری مذہبیت کے ساتھ انسانیت کا درد وغم بہت نمایاں ہے۔محنت کشوں کی زندگی کا نقشہ انھوں نے اپنے اشعار میں کھینچا ہے۔کسان کے عنوان سے ان کی ایک نظم ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیے ۔

بشرے سے نمایاں خستہ حالی کندھے پر کدال پیٹ خالی
سانسوں میں تھکی ہوئی سی تیزی ماتھے پہ نشان سجدہ ریزی
مرجھایا ہوا شباب چپ ہے ہنگامہ انقلاب چپ ہے

احسان دانش اقبال کی طرح خدا سے شکوہ گزار ہیں۔ وہ تمام درد وکرب کے لیے خدا سے شکوہ کرتے ہیں اور کبھی ان کا لہجہ سخت بھی ہو جاتا ہے۔وہ کہتے ہیں ۔

بھوک سے جاں بلب ہے مزدور اور تو منعموں میں جلوہ طراز
تو رحیم وکریم ہے لیکن یہ کرم کا ہے کون سا انداز

احسان دانش کا نظریہ آزادی اور حریت پسندی کے بارے میں اس درجہ سخت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو غلامی کا حامی ہے وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں۔شاعر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ساری انسانیت کو آزادی کا سبق دیا تھا لہٰذا ہمیں بھی آزادی کا شیدائی ہونا چاہیے۔ احسان دانش گہری مذہبیت کے شاعر ہیں انھوں نے بہت خوبصورت حمدیہ اور نعتیہ نظمیں لکھیں ہیں جس کا مقصد اپنی عبدیت اور عقیدت کا اظہار ہے اور اس میں قوم کو رجوع الی اللہ کا پیغام بھی ہے۔ ایک حمدیہ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

یہ جنگل یہ دریا یہ کوہ دمن ہیں پھیلے ہوئے کارخانے ترے
یہ گلشن یہ ایواں یہ سورج یہ چاند نہ جانے مرے ہیں نہ جانے ترے

اشاروں پہ ترے قیام وسفر زمینیں تری ہیں زمانے ترے
جدھر سنتے ہیں تیری سرگوشیاں جدھر سونچئے شاخسانے ترے
تری دولتوں کے امیں کوہ ودشت ستاروں سے بڑھ کر خزانے ترے
ضیائے رخ زندگی تجھ سے ہے چمک اوررخشندگی تجھ سے ہے

جانثاراختر (1914تا1973)

جانثار اختر ترقی پسند شاعر تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی شاعری رومان اور حقیقت کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اختر کی شاعری کا موضوع انسان ہے اور سماجی حقیقت پسندی ان کی بہت گہری ہے۔ اسی لیے انقلاب کا تصور بھی ان کا محبوب موضوع ہے۔ ان کے انقلابی ذہن کے آئینہ دار یہ اشعار ہیں۔

خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے
قلب انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم
یا بغاوت کا دہکتا ہوا راگ
قلب انساں میں سلگتی ہوئی آگ
پھر سے جاگے ہوئے مزدور کے بھاگ
کو ن سا گیت سنو گی انجم

جانثار اختر کی نظموں میں ''مسافر'' ایک اہم نظم ہے۔ مسافر کو شاعر نے ایک باعزیمت اور جدوجہد کرنے والے انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اسے مشورہ دیا ہے کہ راستے کے ان تمام پرفریب نظاروں سے آنکھیں بچا کر گزرنا چاہیے کیونکہ راستے کے مناظر منزل مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

مسافر کہیں راہ مت بھول جانا جوانی کی وادی کے خندہ نظارے
محبت کے گردوں کے رخشاں ستارے تجھے راستے میں کریں گے اشارے
کہ آ ہم سکھائیں تجھے دل لگانا مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

مناظر کی زینت نہ جادو جگائے قدم تیرے پکڑے نہ باغوں کے سائے
نظر ہے ملی ہاتھ جوڑے نہ آئے تخیل کا رنگین دھوکہ نہ کھانا
مسافر کہیں راہ مت بھول جانا

جاثار اختر کی نظموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا کا تتبع کیا ہے۔ وہ کامیاب شاعر ہیں۔ نظموں کے علاوہ انھوں نے غزلیں بھی کہیں ہیں۔ ان کی غزلوں میں رومانیت بھی ہے اور عصری حسیت بھی، اس میں روایت کی پاسداری بھی ہے اور روایت سے بغاوت بھی۔ نصیحتیں بھی ہیں اور رہنمائی بھی۔ ان کے اشعار ہیں ؎

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو
اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو زندگی شمع لیے در پر کھڑی ہے یارو

اختر کی شاعری اگرچہ ایک طویل عرصے تک ترقی پسندی کی شاعری رہی ہے لیکن ان کے آخری دور کی شاعری پر جدیدیت کی چھاپ بھی نظر آتی ہے اور جدیدیت کے اثرات کی وجہ سے ان کے فن میں نمایاں رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

ساحر لدھیانوی (1921 تا 1980)

ساحر لدھیانوی بھی ترقی پسند شاعر تھے اور انھیں اس کا یقین تھا کہ ملک کی غلامی اور پستی کا مداوا اشتراکیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ وہ ترقی پسند اشتراکی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے غزل گو شاعر بھی تھے اور ایک رومانیت کی فضا ان کی غزلوں میں بہت نمایاں ہے۔ ساحر کی نظموں میں سب سے مشہور و معروف نظم تاج محل ہے۔ اس نظم نے انھیں شہرت اور مقبولیت کی بلندی تک پہنچایا ہے اور اس نظم میں بھی ان کا اشتراکی تصور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

ساحر لدھیانوی کے نظریۂ اشتراکیت سے اختلاف تو کوئی بھی شخص کر سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ نظم بے حد دلکش اور حسین ہے۔ الفاظ کی بندش اور مصرعوں کی روانی قابل داد ہے۔

پوری نظم موسیقی سے لبریز ہے اور ہر مصرع میں بربط اور ستار کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ساحر کی غزلیں بھی بہت خوبصورت ہیں اور رومانیت سے بھرپور ہیں۔ ان کی ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم
مایوسیِ مآل محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

ماہر القادری (1907 تا 1978)

ماہر القادری اردو شعر و ادب کی ایک بہت نمایاں شخصیت کا نام ہے۔ وہ بہت اچھے نثر نگار اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے شاعر بھی ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے جیسے: فردوس۔ محسوسات ماہر۔ نغمات ماہر۔ جذبات ماہر وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں بیک وقت رومانیت بھی ہے اور اقبال کی مقصدیت بھی ہے۔ فنی اعتبار سے ان کے اشعار بلند ہیں۔ ان کی ایک نظم مشاہدہ ہے۔ جس کے دو شعر پیش کیے جا رہے ہیں ۔

نظروں کے سامنے ہے ایک شوخ ماہ پارا
میں لڑکھڑا رہا ہوں دینا کوئی سہارا
رنگیں لبوں پر رقصاں ہلکی سی مسکراہٹ
جیسے شفق کی ضو میں ایک کانپتا ستارا

اردو شاعری میں ماہر القادری اپنے مخصوص فکر و مزاج اور پاکیزہ خیالات اور شگفتہ انداز بیانی کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ جس طرح سے بہت سے شعرا کے نزدیک اشتراکیت ایک بلند ترین نظریہ ہے۔ ماہر القادری کے نزدیک اسلام ایک پاکیزہ ترین نظریہ اور ضابطۂ حیات ہے۔ وہ عالم باعمل بھی تھے اور مذہبی فکر کے حامل تھے اور سچے عاشق رسول تھے۔ ان کی لکھی ہوئی نعتیں اردو نعت گوئی میں خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ماہر القادری کا ''سلام'' تو اتنا مقبول رہا ہے کہ وہ خاص و عام کی زبان پر ہے، اس میں شاعر کا سوز دروں اور جذبۂ صادق بہت نمایاں ہے اور اس کی شہرت پوری اردو دنیا تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس مشہور سلام کے دو شعر یہ ہیں ۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں

ماہر القادری کے کلام میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کا اصلاحی اور احیائی نقطۂ نظر صاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

کتنے عارض شراب سے گل رنگ — کتنے چہروں پہ صرف گردِ ملال
زندگی ہے فقط عمل ہی عمل — واعظ خوش بیاں ہے قال ہی قال
رقص ونغمہ شراب وعیش نشاط — ان دریچوں سے جھانکتا ہے نوال

ماہر القادری کے جتنے شعری مجموعے ہیں تقریباً اسی قدر ان کی نثری کتابیں ہیں۔ وہ اردو کے بہت بڑے ادیب اور نقاد بھی تھے الفاظ اور تعبیرات کی صحت پر جتنی اچھی ان کی نظر تھی اس کا مقابلہ مشکل ہی سے کوئی ادیب اور صاحب قلم کرسکتا ہے۔ وہ کراچی سے ماہنامہ ''فاران'' نکالتے تھے اور اس کے ہر شمارے میں کسی کتاب یا کسی کے دیوان پر بہت تفصیلی تبصرہ ہوتا تھا اور اس میں زبان وبیان کی غلطیاں واضح کی جاتی تھیں۔ ان کے تبصروں کا مجموعہ بھی شائع ہوگیا ہے اور زبان وبیان کی صحت سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں ان کے لیے ماہر القادری کے تبصرے کا مطالعہ مفید ہوگا۔

نعیم صدیقی (1916 تا 2002)

نعیم صدیقی شاعر بھی ہیں۔ افسانہ نگار بھی ہیں اور صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے شاعری کی تقریباً تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعیم صدیقی کی شاعری میں فکر وخیال بھی ہے اور حسن وجمال بھی ہے۔ ان کا فنی شعور نہایت بالیدہ اور دل نہایت حساس ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح شعریت مجروح نہ ہو۔ ان کا نظریہ اور نقطۂ نظر یہ ہے کہ ''شعر کو اول وآخر آئینہ دار فن ہونا چاہیے۔ شاعری اصلاً ایک جمالیاتی تجربہ ہے اور شعر نگاری جمالیاتی عمل''۔ ان کا خیال ہے کہ کشمکش شاعری کا بہت اہم عنصر ہے اور وہ شاعر اکثر کامیاب ہوتا ہے جو باطل کے

خلاف یا ظلم و جبر کے خلاف معرکہ میں اپنے فن سے کام لیتا ہے۔نعیم صدیقی کی شاعری اول سے آخر تحریکی مزاج کی شاعری ہے۔ان کی شاعری کا ایک مجموعہ شعلۂ خیال کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو بہترین ادبی محاسن مزین ہے۔نعیم صدیقی نے اپنے اشعار میں حضور اکرم ﷺ کو اس طرح خطاب کیا ہے۔

دنیا ترے عشاق کے رہنے کی کہاں ہے
ہر چوٹ جو سہتے ہیں وہ سہنے کی کہاں ہے
افسوس مسلماں کی دو صدیوں کی کہانی
کہنے کو تو کہتے ہیں یہ کہنے کی کہاں ہے
امت کا جگر دیکھ ذرا زخم جگر دیکھ
ادھر دیکھ ادھر دیکھ

نعیم صدیقی کی نظمیں ہوں یا غزلیں وہ فنی لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ان میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو اچھے اشعار کے لیے ضروری ہیں۔ان کے یہاں فکر و فن کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے اور ان کی شاعری سے احساس جمال کو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔

کلیم احمد عاجز (1924 تا 2015)

کلیم عاجز سوز و گداز اور غم والم کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں جو کئی دیوان پر محیط ہے اتنا درد پایا جاتا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کے شعر میں موجود ہو۔اسی لیے کلیم عاجز کو میر تقی میر کے بعد سب سے بڑا شاعر درد والم سمجھا جاتا ہے۔جمیل مظہری جیسے پختہ فنکار شاعر کا کہنا ہے کہ بہت سے شعرا نے میر کے تتبع کی کوشش کی لیکن کسی کو میر کا انداز نصیب نہ ہو سکا۔''میر کی یہ میراث خاص طور پر خالق نطق نے ایک ایسے نوجوان کے لیے وقف کر رکھی تھی جو اپنی افتاد طبع ہی کے لحاظ سے نہیں۔میر کی خانگی معاشرتی۔سماجی اور ان کے عہد کے سیاسی حالات کی مشابہت کے اعتبار سے بھی میر کے تاثرات تغزل کا حامل ہونے والا تھا''۔فراق گورکھپوری عہد جدید کے اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں ان کا کہنا ہے کہ''جب میں نے کلیم عاجز صاحب کا کلام سنا۔تو شاعر اور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا۔اتنی دھلی ہوئی زبان۔یہ گھلاوٹ۔لب و لہجے کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص

سے پیدا ہوسکتا ہے۔اس سے پہلے مجھے کبھی اس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا''۔

غزل میں جب تک غم کی زیریں آنچ موجود نہ ہو غزل خوبصورت غزل نہیں بنتی۔غزل وہ غزل ہے جس میں چشمۂ غزال کی مایوسی اور دردمندی چمکنے لگے۔جب شکاری کا تیر اس کے جسم میں پیوست ہو چکا ہوتا ہے۔جب تک سینۂ شاعر غم کے تیر سے گھائل نہ ہو شاعری فن کی شیشہ گری تو ہوسکتی ہے لیکن اس میں غزل کا رنگ نہیں آسکتا ہے۔اسی لیے فیض احمد فیض نے کہا ہے''لب بہ حرف غزل دل میں قندیل غم''۔

کلیم عاجز کی شاعری ان کی اپنی آپ بیتی ہے۔وہ ایک جاں سوز اور عالم آشوب حادثے کو غزل کی زبان میں سناتے رہتے تھے۔انھوں نے اپنے دل کی جراحتوں سے غزلوں کے پھول کھلائے اور ان پھولوں سے پورا چمن تیار کرلیا اور خون جگر سے اس چمن کی آبیاری کی۔ میر سے لے کر فانی بدایونی تک شاید ہی کوئی شاعر ہوا ہو جس کے یہاں غم کی ایسی شدت اور آنسوؤں کی ایسی برسات نظر آئے جتنی کلیم عاجز کی شاعری میں ملتی ہے۔وہ صرف آتش غم کا اظہار نہیں کرتے بلکہ مملکت غم کی اور رنگ زیبی کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ پکار سارے چمن میں تھی وہ سحر ہوئی وہ سحر ہوئی
مرے آشیاں سے دھواں اٹھا تو مجھے بھی اس کی خبر ہوئی
مجھے کیا اگر ترے دوش سے تری زلف تابہ کمر ہوئی
کہ میں ایسا خانہ خراب ہوں کبھی چھاؤں میں نہ بسر ہوئی

کلیم عاجز کے بہت سے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکے ہیں ان ہی میں ان کے یہ اشعار ہیں۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کروہو کہ کرامات کروہو

اپنا یہ کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ رستے میں خواہ دوست یا دشمن کا گھر ملے

حفیظ میرٹھی (1924 تا 2000)

حفیظ میرٹھی تعمیر پسند نقطہ نظر کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی عمومی فضا مقصدیت اور صالحیت اور ایمان اور یقین کی فضا سے معمور ہے وہ غزل اور صرف غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیت فن غزل کو سنوارنے اور نکھارنے میں صرف کی ہے یہی وجہ کہ اپنی مقصدیت اور اسلامی لے کے باوجود غزل گوئی میں بلند مقام کے مستحق ہیں۔ جہاں اعلیٰ درجہ کا فن پایا جاتا ہو اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اس سے قطع نظر کے شاعر کا اپنا نظریہ کیا ہے۔ گلاب کا پھول ہر جگہ دلکش ہے خواہ وہ میخانہ کے دروازہ پر کھلے یا مسجد کے صحن میں کھلے۔ حفیظ نے غزل کی آبرو کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیت سے اس میں چار چاند لگائے ہیں۔ وہ سارے اوصاف جن سے غزل میں نکھار آتا ہے ان کے کلام میں موجود ہیں، ان کے یہاں غزل کی روایت کی پاسداری ہے اور غزل کے فنی لوازم کا احترام بھی۔ وہ ہر جگہ تخیل اور جذبہ کی خلاقانہ قوت سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے یہاں فن اور مقصد کا کامیاب امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں اسلامیت تعمیر پسندی کے ساتھ فن کا رچاؤ ہے اور احساسات اور جذبہ کی شدت بھی چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

دل کے بل بوتے پہ کہہ ڈالی غزل ہم نے حفیظ
سوچتے ہی رہ گئے اہل زباں کیسے کہیں

ان کی غزل کا شعر ہے ؎

تمہارا ہر قدم شمع ہدایت　　تمہارا نقش پا تصویر منزل
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے　　دل ٹوٹے آواز نہ آئے

شکیل بدایونی (1916 تا 1970)

عہد جدید کے غزل گو شعرا میں شکیل بدایونی ایک بہت اہم نام ہے۔ انھوں نے طویل عرصے تک فلمی دنیا میں گیت نگار کی حیثیت سے کام کیا ہے لیکن نغمہ نگاری کے علاوہ انھوں نے غزل کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ ان کے والد کا نام محمد جمال احمد قادری تھا اور انھوں نے شکیل کے لیے عربی۔ فارسی اور ہندی پڑھانے کے لیے گھر میں ٹیوشن کا انتظام کیا۔ ان کے ایک

دور کے رشتہ دار ضیاء القادری بدایونی مذہبی شاعری کرتے تھے۔شکیل بدایونی ان سے متاثر تھے۔ اس کے علاوہ بدایوں کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ شاعری کی طرف راغب ہوگئے۔1936 میں جب انھوں ے علی گڑھ مسلم یونی روسٹی میں داخلہ لیا تو انھوں نے مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا۔جلد ہی انھوں نے شہرت حاصل کرلی۔تعلیم کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔جہاں انھیں ایک اچھی نوکری مل گئی۔نوکری کے ساتھ وہ مشاعروں میں حصہ لیتے رہے اور ان کی شہرت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔اس زمانے کے شعرا اکثر سماج کے کچلے ہوئے طبقوں کے بارے میں شاعری کرتے تھے اور ترقی پسند تھے۔لیکن شکیل بدایونی کا شعری مزاج کچھ اور تھا۔وہ رومانی شاعری کرتے تھے اور ایسی شاعری جو دل کے بہت قریب ہوتی تھی۔وہ محبت کے ترجمان اور رازداں تھے۔انھوں نے حکیم عبدالوحید اشک بجنوری سے باقاعدہ اپنی شاعری میں اصلاح لینی شروع کی۔ بمبئی منتقل ہونے کے بعد انھوں نے فلموں میں بہت کامیاب گیت لکھے لیکن ان کا فن اس سے مجروح نہیں ہوا۔ان کی غزلیں عہد جدید کے شعرا میں ایک امتیاز خاص رکھتی ہیں۔جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

غم عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت ترے نام تک نہ پہنچے
وہ نوائے مضمحل کیا نہ ہو جس میں دل کی دھڑکن
وہ صدائے اہل دل کیا جو عوام تک نہ پہنچے
نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے
یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے
جو نقاب رخ اٹھادی تو یہ قید بھی لگادی
اٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

مرے ہم نفس مرے ہم نوا۔ مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بلب مجھے زندگی کی دعا نہ دے
میں غم جہاں سے نڈھال ہوں کہ سراپا حزن وملال ہوں
جو لکھے ہیں مرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے

باب۔دوم

اردو کے ادیب اور نثر نگار

موضوع کا تعارف

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد ملک پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور پھر بتدریج وہ وقت آ گیا کہ انگریزی زبان ملک میں رائج ہوگئی اور لوگوں نے انگریزی ادبیات کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اردو نثر میں نئے طریقہ اظہار کو اختیار کیا گیا اور کئی بڑے نثر نگار اور نقاد پیدا ہوئے جنھوں نے انگریزی نثر کی پیروی کی، زبان میں سادگی پیدا ہوئی اور پر تکلف اظہار کے طریقوں کو اور مسجع عبارتوں کو ترک کیا گیا۔ پہلے سرسید نے اردو شعر و نثر کو نیا راستہ دکھایا۔ انھوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔ مبالغہ آرائی اور لفاظی اور تصنع اور قافیہ پیمائی سے روکا۔ وہ خود اچھے نثر نگار تھے انھوں سادہ اور سلیس نثر کا نمونہ پیش کیا۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے نام سے اصلاحی رسالہ جاری کیا یہ مجلّہ اصلاحی اور سادہ اور سلیس نمونہ تھا اس نمونہ کو بہت سے اہل قلم نے اختیار کیا۔ محسن الملک، چراغ علی، الطاف حسین حالی اور شبلی، نذیر احمد اور بہت سے اہل قلم پیدا ہوئے۔ انگریزی ادبیات سے استفادہ کے بعد ناول بھی لکھے جانے لگے افسانہ نگاری

کو بھی ترقی ملی۔ جس کی ابتدا نذیر احمد اور راشد الخیری سے ہوئی۔ عبدالحلیم شرر اور مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول مقبول ہوئے۔ ڈرامہ نگاری کا فن بھی مقبول عام ہوا۔ انگریزی ادب کے مطالعہ کے بعد بہت سے نقاد میدان میں آئے جنھوں نے بہت سے نئے تنقیدی نظریات پیش کیے ہر میدان میں اردو زبان میں لکھنے والے بہترین اہل قلم پیدا ہوئے۔

مرزا غالب (1796 تا 1869)

مرزا غالب جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے اردو میں چند کتابوں پر تقریظیں لکھی ہیں اور ان کے علاوہ چند چھوٹی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان کتابوں کی تحریر فسانہء عجائب کی زبان کی طرح مصنوعی قسم کی ہے البتہ انھوں نے اردو میں جو خطوط لکھے ہیں ان سے اردو نثر کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ غالب کے زمانہ میں فارسی میں خط لکھنے کا رواج تھا۔ خود غالب فارسی میں خط لکھا کرتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے اردو میں خط و کتابت شروع کی اور جو لکھا قلم برداشتہ لکھا۔ ان کا یہ بے تکلف انداز بہت پسند کیا گیا اور خط و کتابت کا انھیں بہت شوق تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ دن کا زیادہ حصہ خط پڑھنے اور خط کا جواب دینے میں گزر جاتا تھا۔ خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ غالب نے ایسا طرز و اسلوب ایجاد کیا کہ خط پوری ملاقات بن گیا اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب خط نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک جگہ بڑے فخر سے کہتے ہیں: ''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ سو کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔'' مرزا غالب کا مزاج نرالا تھا۔ کسی کی پیروی کو باعث شرم خیال کرتے تھے۔ ہر معاملہ میں اپنا راستہ آپ نکالتے تھے۔ ان کے عہد میں مراسلہ نگاری کا جو انداز تھا اسے رد کر کے انھوں نے نیا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے مختصر سے مختصر القاب لکھے۔ جیسے بھائی صاحب۔ مہاراج۔ میری جان۔ بندہ پرور اور کسی خط میں بس مکتوب الیہ کا نام لیا اور اپنی بات شروع کر دی۔ یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے ؎

''یوسف مرزا۔ تجھ کو کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا''

''میاں لڑکے۔ کہاں پھر رہے ہو۔ آؤ بیٹھو''

''ارے کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے''

''کبھی مرزا غالب خط لکھنے میں سرے سے القاب نہیں لکھتے خط شروع کر دیتے ہیں بلکہ ایک دو جگہ تو یہ بھی کیا کہ آخر میں اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ صرف یہ لکھ دیا کہ ''ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ دیکھیں تم پہچان جاتے ہو کہ نہیں''

خطوط غالب ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے خاندان کے۔ اپنے آبا و اجداد کے اور خود اپنے مکمل حالات بیان کر دیے ہیں۔ حد یہ ہے کہ غالب نے ان باتوں کو بھی نہیں چھپایا جنھیں اکثر لوگ چھپا جاتے ہیں مثلاً ان خطوں میں غالب کی شراب نوشی کا ذکر موجود ہے۔ ایک ڈومنی انھیں چاہتی تھی یہ بات بھی صاف صاف بتا دی۔ اپنی تنگ دستی اور مہاجن سے قرض لینے کا حال بے کم و کاست لکھ دیا۔ یہ خطوط غالب کی مکمل سوانح عمری ہیں۔

غالب کے زمانہ کی دلی کو دیکھنا ہو تو غالب کے خطوط کی ورق گردانی کیجیے۔ غدر کے حالات۔ دلی کا اجڑنا۔ بے گناہوں کا مرنا یا سزا پانا سب کچھ ان خطوط میں موجود ہے۔ غالب نہایت شگفتہ مزاج تھے۔ شوخی اور ظرافت طبیعت میں داخل تھی جبھی تو حالی نے انھیں ''حیوان ظریف'' کہا ہے۔ یہ خطوط لطیفوں۔ چٹکلوں اور دل چسپ باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ غالب نے ان خطوں میں صرف بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ جہاں علمی معاملات کا ذکر ہو وہاں انھوں نے علمی زبان کا استعمال کیا ہے۔

سرسید احمد خاں (1817 تا 1898)

سرسید احمد خاں انیسویں صدی کے ایک بہت بڑے رہنما ہوئے ہیں۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں ان کی تعلیمی اور فکری رہنمائی سے ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی۔ وہ قوم جو سستی۔ کاہلی اور بے عملی کی بیماری میں مبتلا ہو کر تباہی کے گڑھے میں گر گئی تھی۔ سرسید کے جگانے سے جاگی۔ ہوش میں آئی۔ جہد و عمل پر کمر بستہ ہوئی اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہوئی۔

انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر توجہ کی اور جہاں جہاں خرابی نظر آئی اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو انگریز دشمنی سے بچنے اور کچھ دنوں کے لیے سیاست

سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور مسلمانوں کو مذہب کی اصل روح سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔

سرسید نے اردو شعر و ادب کو بھی ایک نیا راستہ دکھایا۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ شعر و ادب نہ تو بے کاروں کا مشغلہ ہے نہ تو تفریح اور دل لگی کا ذریعہ ہے۔ بلکہ یہ زندگی کو سنوارنے اور بہتر بنانے کا آلہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ انھوں نے ادب کی افادیت اور مقصدیت پر زور دیا۔ اردو نثر میں جتنے عیب تھے انھوں نے گن گن کر بتائے۔ مبالغہ آرائی۔ لفاظی۔ تصنع اور قافیہ پیمائی اردو نثر کے وہ عیب تھے جن سے سرسید کو نفرت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اردو نثر میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ کام کی بات سیدھے سادھے لفظوں میں ادا کی جا سکے تا کہ بات مصنف کے دل سے نکلے اور قاری کے دل میں بیٹھ جائے۔ وہ خود نثر نگار تھے انھوں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ ان کی رہنمائی اور تربیت سے بہت سے ایسے ادیب پیدا ہوئے جو سرسید کی طرح وضاحت کے ساتھ موثر انداز میں اظہار خیال پر قدرت رکھتے تھے۔

ایک انگریز ولیم میور نے ''لائف آف محمدؐ'' کے نام سے سیرت پر ایک کتاب لکھی اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کی۔ سرسید نے کتاب دیکھی تو مضطرب ہو گئے۔ تمام اثاثہ فروخت کر کے اور دوستوں سے قرض لے کر انگلستان گئے اور اس کا دندان شکن جواب لکھا جو بعد کو اردو میں خطبات احمدیہ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب سرسید کے استدلالی انداز بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ انگلستان ہی میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان واپس آ کر تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کریں گے۔ یہ اصلاحی رسالہ جاری ہوا اور اس نے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی اردو نثر کو اس سے خاص طور پر فائدہ پہنچا۔ اس رسالہ نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور اردو نثر کو نئی جہت عطا کی۔ اردو نثر پر سرسید کا احسان ہے کہ اس نے نئی زندگی پائی اور نئے اسلوب سے آشنا ہوئی۔

محسن الملک (1817 تا 1907)

سید مہدی علی نام تھا۔ محسن الملک کا خطاب پایا تو لوگ نام بھول گئے اور محسن الملک ہی کہنے لگے۔ ان کی پیدائش اٹاوہ میں ہوئی۔ گھر پر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اول کلکٹری میں ملازمت مل گئی۔ محنت اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کی وجہ سے ترقی کر کے

تحصیلدار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے دوران قانون کے موضوع پر ان کی دو تصنیفات سامنے آئیں جس کی وجہ سے انھیں ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ ان کی کارکردگی کی شہرت اٹاوہ سے حیدرآباد تک پہنچ گئی جس کی وجہ سے وہ حیدرآباد میں مالیات کے معتمد اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہوئے اور تین ہزار روپیہ ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر ہوئی اور حسن خدمات کے اعتراف میں انھیں محسن الملک کا خطاب ملا۔ حیدرآباد میں ان کی ایسی عزت تھی کہ بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے۔ 1893 میں وہ پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور باقی زندگی کالج کی خدمت میں گزاری۔ وہ سرسید کے رفیق اور جانشین ہوئے اور ان کا انتقال 1907 میں شملہ میں ہوا مگر انھیں علی گڑھ لا کر سرسید کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

محسن الملک کو سرسید کا دست راست کہا جائے تو درست ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر سرسید کے ساتھ تعاون کیا اور اپنے قلم سے سرسید کے افکار و خیالات کو پھیلانے کی کوشش کی۔ ان کے مضامین تہذیب الاخلاق میں اکثر شائع ہوتے تھے۔ ان کی نثر بہت شگفتہ اور دلکش ہوتی تھی۔ مضمون کے ایک ایک لفظ پر ان کی نظر ہوتی تھی اور وہ بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرتے تھے اس لیے وہ جو لکھتے تھے وہ حسین اور دل نشین ہوتا تھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے اور اہل ذوق اس مجموعہ کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ علامہ شبلی جیسی شخصیت بھی ان کی دلکش تحریر کی قائل تھی۔

چراغ علی (1846 تا 1895)

چراغ علی کا آبائی وطن کشمیر تھا لیکن ان کے دادا ملازمت کے سلسلہ میں پنجاب چلے آئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے میرٹھ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہیں 1846 میں چراغ علی کی ولادت ہوئی۔ صرف دس برس کے تھے کہ یتیم ہو گئے۔ والدہ نے پرورش کی مگر تعلیم خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی بھی سیکھی مگر واجبی سی۔ معاشی حالت اچھی نہیں تھی ضلع بستی میں بیس روپیہ ماہوار پر سرکاری ملازمت کر لی۔ علم کی پیاس بے حساب تھی۔ مطالعہ کا شغل جاری رہا۔ یہاں تک کہ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی۔ لاطینی اور یونانی زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔

لیاقت صلاحیت اور علمی ذوق کی شہرت حیدرآباد تک پہنچی۔ اس زمانہ میں تمام جوہر قابل کو حیدرآباد بلانے کی کوشش ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کو بھی حیدرآباد بلا لیا گیا اور مددگار معتمد مالگزاری کا عہدہ ان کے سپرد کیا گیا۔ پھر وہ ترقی کر کے معتمد کے عہدہ تک پہنچے۔ علم کا شوق اور

مطالعہ کا ذوق ہو تو انسان ہر جگہ اپنا یہ شغف جاری رکھ سکتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف کتابوں کا مطالعہ جاری رکھا بلکہ مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں جن کی افادیت کو سب نے تسلیم کیا۔ وہ تہذیب الاخلاق میں بھی برابر مضامین لکھتے رہے۔ مذہب اور اخلاق ان کا خاص موضوع تھا اور بہت سے معاملات میں وہ سرسید کے ہم خیال تھے۔ جس طرح سے سرسید کے بہت سے افکار و نظریات کو تنقید کا ہدف بنا گیا اسی طرح سے چراغ علی کے نظریات پر بھی لوگوں نے تنقیدیں کیں۔ چراغ علی کا ذہن تحقیقی تھا اور وہ جو کچھ لکھتے تھے غور و فکر کے بعد لکھتے تھے اور اس میں استدلالی رنگ پایا جاتا تھا۔ چراغ علی کا انتقال 1895 میں بمبئی میں ہوا۔

محمد حسین آزاد (1830 تا 1910)

اردو نثر کو خوبصورت۔ بال و پر عطا کرنے والوں کی مختصر ترین فہرست بھی اگر بنائی جائے گی تو اس فہرست میں محمد حسین آزاد کا نام ضرور آئے گا۔ انھوں نے کئی قابل قدر کتابیں لکھیں جو آج بھی شوق کے ہاتھوں لی جاتی ہیں اور انھیں سرمہء چشم بنایا جاتا ہے۔ ''آب حیات'' ان کا لازوال کارنامہ ہے جو اردو شاعری کی باقاعدہ تاریخ ہے جس میں ادوار قائم کر کے اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آب حیات میں شاعروں کے حالات دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب میں شعرا پر تنقید بھی ہے۔ اس لیے اس کتاب کو اردو تنقید کا نقطہء آغاز بھی قرار دیا گیا ہے۔ محمد حسین آزاد کا دوسرا بے مثال کارنامہ ان کے وہ رمزیہ مضامین ہیں جو ''نیرنگ خیال'' میں شامل ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ ہے۔ ان کی تصنیفات میں ایک بہت اہم تصنیف ''دربار اکبری'' ہے۔ یہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی دل چسپ تاریخ ہے۔ انداز ایسا ہے کہ اس عہد کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ ان کی ایک اور اہم تصنیف ''سخن دان فارس'' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت دونوں کی بنیاد ایک ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے ''قصص ہند'' کے نام سے کہانیاں لکھی ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی تاریخ سے ہے۔

طرز تحریر۔ اسلوب کی دل کشی اور حسن ادا کے اعتبار سے محمد حسین آزاد کی نثر لاجواب اور بے مثال ہے۔ اس میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ شگفتگی اور شیرینی ایسی کہ کتاب کو ہاتھ سے چھوڑنے کا جی نہ چاہے۔ ان کی تحریر میں عجب تاثیر اور تسخیر کی صلاحیت ہے۔ جملے اتنے دلکش

کہ دل میں اتر جائیں۔شبلی جیسے ادیب نے بھی ان کے بارے میں یہ لکھا کہ ''محمد حسین آزاد اگر گپ بھی ہانک دیں تو وحی معلوم ہوتی ہے'' الفاظ ومحاورات کا صحیح استعمال اور مناسب استعارہ و تشبیہ سے عبارت کو مزین کرنا ان کی وہ خصوصیت ہے جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

الطاف حسین حالی (1837 تا 1914)

اردو نثر کے فروغ میں مولانا الطاف حسین حالی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بلا شبہ وہ بہت اچھے شاعر تھے اور مسدس حالی ایک نا قابل فراموش طویل ترین نظم ہے لیکن اسی کے ساتھ بحیثیت نثر نگار بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ ان کی پہلی نثری تصنیف ''مجالس النساء'' ہے۔اس کا موضوع عورتوں کی تربیت اور تعلیم ہے۔لیکن انداز قصہ گوئی اور ناول کا ہے۔اس کے بعد انھوں نے مشہور فارسی شاعر سعدی کی سیرت 1882 میں ''حیات سعدی'' کے نام سے لکھی۔ اس میں شاعر کے مستند حالات پیش کیے۔اس کے بعد انھوں نے غالب کی سوانح ''یادگار غالب'' کے نام سے لکھی۔ یہ غالب شناسی کی جانب پہلا قدم ہے اور اس میں انھوں نے غالب کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت بہت بہتر طریقہ سے دیا ہے۔سوانح عمری مولانا حالی کا پسندیدہ موضوع بن گیا۔ مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے بعد انھوں نے ''حیات جاوید'' کے نام سے سرسید کی مبسوط اور ضخیم سوانح عمری لکھی۔الطاف حسین حالی کا شریفانہ مزاج اور روایتی وضع داری ان کو تنقید پر آمادہ نہیں کرتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے غالب اور سرسید دونوں پر کہیں تنقید نہیں کی ہے۔ یہاں تک کہ شبلی نے حیات جاوید کو مدلل مداحی اور کتاب المناقب کا نام دے دیا لیکن شبلی کی تنقید اپنی جگہ پر۔سوانح نگاری کے میدان میں یادگار غالب اور حیات جاوید کی اہمیت باقی اور برقرار ہے۔مولانا حالی کی فن شاعری پر ناقدانہ بصیرت کا مظہر ان کی کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' ہے۔آل احمد سرور نے اس کتاب کو اردو شاعری کا پہلا منشور قرار دیا ہے۔انھوں نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ اچھی شاعری کے لیے کیا شرطیں ہیں اور شاعری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں شعری اصناف یعنی غزل۔قصیدہ۔مرثیہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔مولانا حالی کی نثر میں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی ہے۔شگفتگی بھی ہے اور تاثیر بھی ہے۔ وہ اپنی بات کو واضح اور مدلل طور پر بیان کرتے ہیں۔آگے چل کر اردو میں جس سادہ نثر کو رواج ہوا

اس کی بنیاد حالی کی نثر ہے۔ یہ درست ہے کہ حالی کی نثر میں شبلی کی زبان کی شگفتگی اور رعنائی نہیں ہے اور نہ مولوی نذیر احمد کا زور بیان ہے لیکن ان کی سادہ نثر بھی بہت دل کش اور موثر ہے۔

نذیر احمد (1836 تا 1912)

مولوی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے لیکن انھوں نے ناول کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ قرآن مجید کا با محاورہ ترجمہ کیا۔ مذہب و اخلاق سے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے بعض انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے بھی کیے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا تعلق قانون سے ہے۔ جیسے ایک ترجمہ کا نام ہے ''تعزیرات ہند'' اور دوسرے ترجمہ کا نام ہے ''قانون شہادت''۔

ڈپٹی نذیر احمد ادیب بھی تھے اور خطیب بھی تھے۔ ان کے خطبات بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں بلا کا زور اور جوش پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ عربی کے بڑے عالم تھے۔ اس لیے عربی زبان کے اثرات ان کی اردو نثر پر بہت زیادہ ہیں۔ ان کو ''شمس العلماء'' کا خطاب بھی دیا گیا اور اڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شہرت ان کے ناول ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' اور ''توبۃ النصوح'' اور ''ابن الوقت'' کی وجہ سے ہے۔ نذیر احمد کو اردو کے پہلے ناول نگار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے مکالمے بہت لاجواب ہیں اور یہ ناول اصلاحی مقصد کے لیے لکھے گئے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو ان کے یہاں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان کی تمام تصانیف جدید نثری صنف کا سنگ بنیاد ہیں۔

پریم چند (1880 تا 1936)

اردو ناول کا سنگ بنیاد ڈپٹی نذیر احمد نے رکھا تھا جب انھوں نے مراۃ العروس تصنیف کی۔ اس کی عمارت تعمیر کی منشی پریم چند نے اور ناول نگاری کے فن کو آسمان تک پہنچا دیا اور یورپ کی زبانوں کے ناول کے ہم پلہ اور ہم رتبہ کر دیا۔ پریم چند کی ناول نگاری کی امتیازی صفت ہندوستان کے گاؤں اور دیہات کی منظر کشی اور کسانوں کے مسائل اور معاملات ہیں۔ غریب کسانوں پر مہاجنوں کا جو ظلم ہے اس کی تصویر کشی بھی ہے۔ غریب کسان قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے اور مہاجن اس کی غربت کا استحصال کرتا ہے۔ پریم چند کا دوسرا موضوع سماجی نا انصافی ہے جو

ہندوستانی معاشرہ میں سرایت کر چکی ہے اسی میں ذات پات کا نظام بھی ہے جو ابھی تک تمام اصلاحی کوششوں کے باوجود ختم نہیں ہوسکا ہے۔ پریم چند کو انسانیت سے بڑی ہمدردی ہے وہ فرقہ واریت کے بھی شدید مخالف ہیں۔ انھوں نے یہ سب کچھ سادہ اور سلیس اسلوب میں لکھا ہے۔ لیکن سادہ نگاری کے باوجود ان کے اسلوب میں شیرینی اور جاذبیت ہے اور یہی پریم چند کا کمال ہے۔ وہ پلاٹ کی طرف پوری توجہ دیتے ہیں اس لیے ان کی ناول فنی اعتبار سے پختہ اور دلکش ہیں۔ اسی طرح ان کی کردار نگاری میں بھی پختگی ہے اور اس میں بھی انھوں نے فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کے مشہور ناول یہ ہیں: جلوہ ایثار۔ بیوہ۔ بازار حسن۔ گوشہ عافیت۔ غبن۔ چوگان ہستی۔ میدان عمل۔ گئودان وغیرہ۔

ذکاءاللہ (1832 تا 1910)

منشی ذکاءاللہ دہلی کے رہنے تھے۔ والد کا نام ثناءاللہ تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ اس کالج میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد پہلے سے زیر تعلیم تھے۔ ادبی اور شعری ذوق کے مشترک ہونے کی وجہ سے ان تینوں کے درمیان زمانہء طالب علمی سے ہی دوستانہ مراسم قائم ہوگئے۔ جب بچپن کے زمانہ سے اہل فن اور شعر وادب کا ذوق رکھنے والوں سے شناسائی ہوجاتی ہے تو یہ ذوق بھی پروان چڑھتا ہے اور جس کے نتیجہ میں ایک انسان اچھا شاعر یا اچھا ادیب بن جاتا ہے۔ منشی ذکاءاللہ نے اردو اور فارسی بھی پڑھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو علم ریاضی سے بھی شغف تھا۔ چنانچہ تعلیم سے فارغ ہونے بعد اسی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے۔ انھوں نے بہت سے مضامین سپرد قلم کیے اور کتابوں کا انبار لگا دیا۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ ان کی جملہ تصانیف کی تعداد ایک سو تینتالیس تھی۔ ان کی تمام تصانیف میں غالباً سب سے اہم کتاب ''تاریخ ہندوستان'' ہے جو دس جلدوں میں ہے۔ انھیں بھی ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا گیا۔ ان کی تمام کتابیں پر از معلومات ہیں لیکن حسن بیان اور شگفتگی زبان کے اعتبار سے نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی کتابوں کے درجہ کی نہیں ہیں۔ وہ آخر میں الہ آباد کے کالج میں عربی فارسی کے پروفیسر بھی ہوگئے تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وہ جب بھی لکھتے تھے تو معلومات کا انبار لگا دیتے تھے۔

علامہ شبلی (1857 تا 1914)

علامہ شبلی کی شخصیت ایسی نابغہء روزگار شخصیت ہے کہ جنھیں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ تاریخ کا اور نہ اردو زبان وادب کا اور نہ فارسی زبان وادب کا۔ ان کا انتقال صرف ستاون برس کی عمر میں ہوا لیکن اس قلیل مہلت عمر میں ہی انھوں نے جو علمی کارنامے انجام دیے ان کی وجہ سے ان کو حیات جاوداں مل گئی ہے۔ ان کے قلم سے ایسی لاجواب تصنیفات وجود میں آئی ہیں کہ جن کی وجہ سے ان کا نام گردش شام وسحر کی زنجیر سے آزاد ہو گیا ہے۔ ان کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی انھوں نے مولوی محمد فاروق چریا کوٹی اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے علم کے حصول کے لیے مختلف شہروں اور مختلف ملکوں کے سفر کیے، جب وہ علی گڑھ گئے تو سرسید نے اس جوہر قابل کو پہچانا اور یونیورسٹی میں ان کو جگہ دی۔ شبلی نے سرسید کے کتب خانہ سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور الطاف حسین حالی اور محسن الملک اور آرنلڈ کی علمی صحبتوں سے مسلسل مستفید ہوئے۔ انسان کو اگر علمی ذوق ودیعت کیا گیا ہو اور مناسب ماحول بھی اس کو میسر آ جائے تو بہت جلد اس کی شہرت شمیم گل کی طرح چمن میں پھیل جاتی ہے۔ وہ ندوہ میں رہے تو ''الندوہ'' نکالا اور مولانا آزاد کو اس کا اڈیٹر مقرر کیا۔ سید سلیمان ندوی اور دوسرے طلبا کی علمی اور ادبی تربیت کی۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں ''سیرۃ النبی'' ''الفاروق'' ''المامون'' ''شعرالعجم'' اور ''موازنہء انیس ودبیر'' اور ''علم الکلام'' بہت اہم ہیں۔ شبلی شاعر بھی بہت اچھے تھے۔ انھوں نے جو تاریخی نظمیں کہی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ نثر میں وہ ایک اسلوب کے بانی ہیں۔ ان کی زبان میں شگفتگی ورعنائی ہے۔ انھوں نے دارالمصنفین کی شکل میں ایک علمی ودینی تصنیفی ادارہ امت کو دیا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے اس ادارہ کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ دارالمصنفین کی تمام کتابیں علمی اعتبار سے اور زبان و بیان کے اعتبار سے اہم درجہ رکھتی ہیں۔ علامہ شبلی کے مضامین اور مکاتیب کا مجموعہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

شبلی نے مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' اور ''حیات خسرو'' اور ''سفرنامہء روم وشام ومصر'' اور ''الجزیہ'' اور ''فلسفۂ اسلام''۔ انھوں نے مضامین بھی بہت کثرت سے لکھے ہیں ان مضامین سے ان کی نثر کے حسن اور جاذبیت و

شگفتگی کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلوب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔شبلی قدیم روایات کے پاسدار اور قومی مزاج کے شناسا تھے۔سرسید نے اسلام کا مطالعہ عصری مغربی فکری معیارات کے نقطۂ نظر سے کیا اور شبلی نے مغربی اقدار کو اسلامی نقطۂ نظر سے جانچنے کی کوشش کی۔شبلی نے علم الکلام کی تحقیق اور اجتہاد کو ہمیشہ اہمیت دی اور اسی بنا پر انھوں نے اپنی فکری زندگی کا آغاز ''سیرۃ النعمان'' کی تصنیف سے کیا۔شبلی نے فن سیرت نگاری میں درجۂ کمال کو چھولیا ہے۔''المامون'' سیرت النعمان۔الفاروق۔ الغزالی۔سوانح مولانا روم۔سیرت النبی ان کی شاہکار کتابیں ہیں اور عالمانہ تحقیق کا نمونہ ہیں۔ سیرت النبی ان کی آخری تصنیف ہے جس کے شروع میں انھوں نے یہ اشعار لکھے ہیں۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

علامہ سید سلیمان ندوی (1853 تا 1884)

علم وادب کی گرانقدر خدمت اور تحقیقی کاموں کی بدولت مولانا سید سلیمان ندوی کا شمار اپنے عہد کے ممتاز مصنفین میں ہوتا ہے۔ان کے خاندان کا تعلق بہار شریف کے گاؤں دسنہ سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔1901 میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔جہاں ان کو علامہ شبلی سے علمی استفادہ کا موقع ملا۔علامہ شبلی بھی ان کے علمی خلوص اور کام کی لگن سے متاثر تھے اور انھوں نے مولانا سلیمان ندوی کو ''الندوہ'' کی ذمہ داری سونپی۔جب جولائی 1912 میں مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو مجلس ادارت میں شامل کیا۔ انھوں نے الہلال میں ادبی انداز میں موثر مضامین لکھے۔وہ دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرار مقرر ہوئے۔وہاں انھوں نے انگریزی سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کرلی اور اسی جگہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب ارض القرآن کا پہلا حصہ مکمل کرلیا۔ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ علامہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔انھوں نے سیرت النبی کا نامکمل کام مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کیا۔ شبلی کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین کے نام سے ایک ایسے ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو صرف

تصنیف وتالیف کے لیے مختص ہو۔ دارالمصنفین کے لیے شبلی نے اپنا گھر اور باغ وقف کر دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد کے لگائے ہوئے اس چمن کی آبیاری کی اور اسے رشک صد گلستاں بنا دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ ان کے اور دیگر رفقا بھی تھے جنھوں نے دار المصنفین کی علمی شہرت میں اضافہ کیا جیسے مولانا عبد السلام ندوی اور ریاست علی ندوی اور شاہ معین الدین ندوی وغیرہ ۔مولانا عبد السلام ندوی کی ''اقبال کامل'' اہم ادبی کتاب ہے مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین سے علمی ماہنامہ ''معارف'' نکالا اور اب سو سال ہو رہے ہیں یہ وقیع علمی رسالہ پابندی کے ساتھ آج بھی شائع ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں کوئی بھی علمی رسالہ ایسا نہیں ہے جس نے اپنی عمر کے سو سال پورے کیے ہوں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور تاریخی تحقیق کا شاندار نمونہ ان کی کتاب ''خیام'' ہے۔ انھوں نے شبلی کی تصنیف سیرت النبی کو مکمل کیا اور اس کی مزید چھ جلدیں تیار کیں۔ سیرت پر اتنا وقیع کام دوسری زبانوں میں بھی نہیں ہوا ہے۔ سیرت پر ان کی دوسری کتاب ''خطبات مدراس'' ہے اور یہ کتاب سیرت کے موضوع پر ان کے علمی خطبات کا بے نظیر مجموعہ ہے۔ اس کی مقبولیت آج تک باقی ہے۔ اس کے علاوہ سیرت عائشہ اور حیات شبلی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ حیات شبلی صرف شبلی کی سوانح حیات نہیں ہے بلکہ ایک پورے عہد کی علمی اور ثقافتی تاریخ کی دستاویز ہے۔ یادرفتگاں ان کے وہ خاکے ہیں جو وہ معارف میں لکھا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی زبان بہت دل کش اور دل آویز ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی شبلی کے خاص شاگرد تھے۔ وہی علمیت۔ وہی انداز تحقیق اور وہی زبان وبیان کی شگفتگی۔

شبلی کے شاگردوں کی طرح علامہ سید سلیمان ندوی کے بھی کئی نامور شاگرد ہوئے ان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور صباح الدین عبدالرحمٰن بہت ممتاز ہیں۔ صباح الدین عبدالرحمٰن کی علمی اور ادبی کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہوئی ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی عربی زبان کے بھی بہت بڑے ادیب تھے اور جب پوری دنیا میں رابطہ ادب اسلامی کی تحریک قائم ہوئی تو مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس کا صدر بنایا گیا۔ مولانا عبدالحئ کی کتاب گل رعنا کا بے مثال مقدمہ مولانا علی میاں ندوی کے ادبی ذوق اور انشا پردازی کا مظہر ہے۔ حیات عبدالحئ۔ پرانے چراغ۔ نقوش اقبال اور

تاریخ دعوت وعزیمت مولانا کی مشہور کتابیں ہیں۔ مولانا بہت بڑے مصنف ہیں۔ کوئی شخص اردو زبان کے ذریعہ اسلامیات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اس کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ دونوں بہت اچھی اردو نثر لکھنے والے مفکر اور عالم دین ہیں۔

سجاد انصاری (متوفی 1924)

سجاد انصاری کا تعلق اس نوجوان نسل سے تھا جسے علی گڑھ میگزین نے پروان چڑھایا تھا، انھیں شاعری سے بھی دل چسپی تھی لیکن انھیں شہرت اس نثر سے ملی جو نہ افسانہ ہے نہ انشائیہ نہ تنقید لیکن اس نثر میں ان سب اصناف کی خوبیاں موجود ہیں۔ یہ ایسی رومانی نثر ہے جو اپنی داخلی اوصاف کی بنا پر شاعری کا درجہ رکھتی ہے سجاد انصاری کے نثری مضامین کا مجموعہ ''مخشر خیال'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نثر کو پڑھ کر شگفتن گل ہائے ناز کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فلسفہ اور ادب کے لطیف امتزاج کی وجہ سے اردو نثر میں انھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ ان کا انتقال جوانی کے زمانہ میں ہوا۔ ادب لطیف۔ انشائے جمیل اور ادب برائے ادب کا ذکر جب بھی آئے گا تو سجاد انصاری کی کتاب محشر خیال کا تذکرہ ضرور کیا جائے گا۔ سجاد انصاری صنف نازک۔ حسن وعشق اور زندگی کے حسین مناظر اور مظاہر کا تذکرہ فلسفیانہ انداز سے کرتے ہیں۔ ان کے یہاں آزادی خیال بھی پائی جاتی ہے۔ وہ آسکر وائلڈ کی طرح ادب برائے ادب کے نظریہ پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فرد کو پوری آزادی ملنی چاہیے کہ وہ ترک واختیار کے پیمانے خود بنائے اور انھوں نے یہ لکھا ہے کہ جماعت کو حق نہیں ہے کہ فرد پر اپنے قوانین مسلط کرے۔ سجاد انصاری کی تحریروں پر مذہبی حلقہ سے تنقیدیں بھی کی گئیں۔ ان کا طرز فکر یہ ہے کہ ادب اور جمالیات کی تعبیر کو اپنے پسند کے انداز میں کرنا چاہیے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ کاروبار شوق اور ذوق نظارہ جمال پر پابندی عائد کرے۔ سجاد انصاری رنگینی۔ سرشاری اور دل فریبی کے دلدادہ ہیں۔ ان کی جمالیاتی حس بہت تیز اور گہری ہے۔

مہدی افادی (1870 تا 1921)

اردو نثر کو رومانی تحریک کی رنگینی ولطافت اور تابناکی سے روشناس کرانے والوں میں

سجاد انصاری کے ساتھ مہدی افادی کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ وہ ایک منفرد انشا پرداز تھے اور فکری رویّوں کے اعتبار سے امتیازی خصوصیت کے حامل ادیب تھے۔ انھوں نے عربی فارسی اور اردو زبانیں گھر پر سیکھیں اور ابتدائی انگریزی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی اور پھر علی گڑھ میں تدریس کی منزلیں طے کیں۔ مہدی افادی ایک ذہین انسان تھے اور غور و فکر کے عادی تھے۔ اس لیے ان کی نظر نئے گوشوں پر پڑتی اور وہ ان پر اپنے منفرد انداز میں اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ایک طرف شگفتگی اور شادابی ہے۔ دوسری طرف عقلیت ہے۔ ان دونوں کی آمیزش کی وجہ سے وہ اردو کے ممتاز اور صاحب طرز ادیب قرار دیے گئے۔ انھوں نے ''حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر'' کے نام سے ایک وقیع مضمون 1897 میں شائع کیا تھا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''افادات مہدی'' کے نام سے بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ وہ اردو ادب کے کلاسیکی روایات کا احترام کرتے ہوئے جدت کے پرستار تھے اور رومانیت پر اصرار کے باوجود عقلیت سے گریزاں نہیں تھے۔ وہ علی گڑھ تحریک اور تہذیب الاخلاق سے بھی متاثر تھے۔ ان کی تحریروں میں جذباتیت اور عقلیت اور رومانیت اور افادیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ مہدی افادی سرسید کے ساتھ شبلی کے بھی پرستار ہیں اور شبلی کے طرز تحریر کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مہدی افادی نے بہت سے لوگوں کے اثرات کو قبول کیا، وہ ناصر علی کی رنگین اور پر لطف نثر کے بھی دل دادہ ہیں اور شبلی کے بھی پرستار ہیں اور سرسید کے بھی قائل اور معترف ہیں۔

ظفر علی خان (پیدائش 1870)

ظفر علی خان اردو صحافت کی تاریخ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصہ اخبار ''زمیندار'' کی اڈیٹر رہے اور حیدر آباد دکن مین ملازمت کے دوران ''رسالہ دکن ریویو'' اور ''ستارۂ صبح'' نکالا۔ زمیندار وہ اخبار تھا جس میں نیاز فتحپوری۔ مولانا غلام رسول مہر۔ عبداللہ عمادی اور عبدالمجید سالک جیسے ادیب مضامین لکھا کرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان شعلہ نوا مقرر تھے اور بدیہہ گو شاعر تھے اور اسی کے ساتھ سیاسی رہنما اور قومی مبلغ بھی تھے۔ جب وہ اپنی پاٹ دار آواز سے تقریر کرتے تو دشت و جبل اور وادی و کوہسار گونج اٹھتے۔ اپنی شعلہ نوائی اور گرم تقریروں کی وجہ سے زمیندار کئی بار بند ہوا لیکن ادھر زمیندار بند ہوتا ادھر قوم کے تعاون سے پھر نکل آتا۔ زمیندار نے مسلمان قوم کو

خود اعتمادی سکھائی۔ صحافت کے وسیلہ سے ادب کے ساتھ فکاہات کا معیار بھی بلند کیا۔ زمیندار ایک طویل العمر اخبار تھا لیکن مولانا ظفر علی خان کے انتقال کے بعد وہ بھی زندہ نہ رہ سکا۔ وہ کانگریس۔ تحریک خلافت۔ اتحاد ملت اور مسلم لیگ سب کے روح رواں رہ چکے تھے۔ ان کی زبان میں سادگی اور پرکاری اور تشبیہات واستعارات کی رنگینی یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ ان کی عبارتوں میں ادبیت کی شان ہے۔ ''حقائق ومعارف''۔ ''جواہر الادب''۔ ''حقیقت وافسانہ'' ان کی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ''بہارستان'' ''نگارستان'' اور ''چمنستان'' ظفر علی خان کے کلام کے مجموعے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی (1892 تا 1977)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی علمیت۔ اپنے صحافتی تبصرے اور فلسفیانہ بصیرت اور ادبی ژرف نگاہی کی وجہ سے ادبی دنیا میں فراموش نہیں کیے جاسکیں گے ان کی تصنیفات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ قرآن مجید کے مترجم اور مفسر بھی ہیں۔ شروع میں ان کے قلم سے کئی کتابیں نکلیں جیسے فلسفہ جذبات اور فلسفہء اجتماع۔ ان دونوں کو انھوں نے اپنی تصنیفات کی فہرست سے خارج کر دیا تھا۔ وہ ادیب بھی تھے اور مصلح اور مفکر بھی تھے۔ کئی برس تک پہلے ہفتہ وار ''سچ'' اور پھر ''صدق جدید'' کے نام سے جریدہ نکالتے رہے۔ جس میں ان کے شذرات بہت قیمتی ہوتے تھے اور پورے ملک میں پڑھے جاتے تھے۔ وہ حیدرآباد کے دارالترجمہ سے بھی وابستہ رہے۔ انھیں فلسفہ اور منطق کی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ ان کی کتابوں میں ''محمود غزنوی'' ''مکالمات برکلے'' ''مبادی فلسفہ'' اور ''فلسفہ اور اس کی تعلیم'' بہت اہم ہیں۔ مولانا دریا آبادی کا خالص ادبی اسلوب ''سفرنامہء حجاز'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' میں بہت نمایاں ہے۔ ''آپ بیتی'' کے نام سے انھوں نے اپنی سرگزشت بھی لکھی ہے۔ سیرت پر ان کے مضامین اور نثری تقریروں کا مجموعہ ''مردوں کی مسیحائی'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ ''مقالات ماجد'' اور ''انشائے ماجد'' بھی مولانا کے مضامین کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے ''تفسیر ماجدی'' اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی ہے۔ انھوں نے جو خاکے لکھے ہیں ان کا مجموعہ ''معاصرین'' کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ انھوں نے پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزاری اور اردو ادب کی

تاریخ میں نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔انھوں نے خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے لکھی ہے۔

قاضی عبدالغفار(1885 تا1954)

قاضی عبدالغفار ایک صاحب طرز ادیب۔صحافی اور انشائیہ نگار تھے انھوں نے اردو نثر کو اپنے خاص اسلوب کی وجہ سے منفرد پہچان عطا کی ہے۔وہ اردو تحریک کے پر جوش کارکن تھے۔ مرادآباد ان کا وطن تھا۔ابتدائی تعلیم کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھوں نے داخلہ لیا۔قاضی عبدالغفار کو شروع ہی سے صحافت سے دل چسپی تھی مرادآباد سے ایک رسالہ ''نیّر عالم'' شائع ہوتا تھا اس میں ان کی بعض تحریریں شائع ہوئی تھیں۔1913 میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد میں اپنا اسسٹنٹ مقرر کرلیا۔اس طرح سے قاضی عبدالغفار کو مولانا محمد علی کی تربیت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ جب حکومت نے ہمدرد کو بند کردیا تو قاضی عبدالغفار کلکتہ آ گئے اور وہاں سے انھوں نے روزنامہ ''جمہور'' جاری کیا۔انگریزی حکومت نے جمہور پر بھی پابندی عائد کردی تو قاضی عبدالغفار نے دہلی سے روزنامہ ''صباح'' جاری کیا۔ یہاں ان کو حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی صحبت حاصل ہوئی اور جب خلافت کمیٹی کا وفد لندن جانے لگا تو ان کو اس وفد کا ایک رکن بنایا گیا۔وہ 14 فروری 1921 کو وفد کے ساتھ لندن پہنچے اور تقریباً ڈھائی مہینہ کے بعد ہندوستان واپس ہوئے۔یہ چونکہ مرادآباد کے تھے اور ہر شخص کو اپنا شہر اور اپنے شہر کی صنعت وحرفت عزیز ہوتی ہے اس لیے انھوں نے پیرس میں مرادآبادی برتنوں کی دکان کھولنے کی کوشش کی۔لیکن ایک ادیب اور دانشور تاجر اور ساہوکار نہیں بن سکتا۔چنانچہ انھوں نے برتنوں کی دکان بند کی۔بعد میں وہ ساہتیہ اکیڈمی کے رکن نامزد ہوئے اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دی۔

قاضی عبدالغفار نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی تھی لیکن ان کا اصل مقام یہ تھا کہ وہ اردو کے صاحب طرز ادیب تھے۔''لیلیٰ کے خطوط''''مجنون کی ڈائری''۔''تین پیسے کی چھوکری''۔''پندار کا صنم کدہ''۔''سیب کا درخت''۔''نقش فرنگ''۔''آثار جمال الدین افغانی''۔''آثار ابوالکلام آزاد'اور''حیات اجمل'' ان کی شاہکار کتابیں ہیں۔انھوں نے

حیدرآباد سے پیام نام کا اخبار بھی نکالا تھا اور اس اخبار میں انھوں نے سر راہ کے عنوان سے طنزیہ اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے صحافت کے ذریعہ رائے عامہ کی رہنمائی کا کام انجام دیا۔ ان کا طرز تحریر شگفتہ اور پر اثر ہوتا تھا۔ لیلیٰ کے خطوط قاضی عبدالغفار کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ ان خطوط میں حسن بیان اور شگفتگی غیر معمولی ہے۔ اسی طرح سے مجنوں کی ڈائری بھی ایک اہم کتاب ہے۔ ان کی تحریریں انشائیہ اور ادب لطیف کا اچھا نمونہ ہیں۔ سوانحی ادب میں بھی ان کے قلم کی کاوشیں نمایاں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں اور جمال الدین افغانی کی سوانح قلم بند کی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی (1878 تا 1955)

اردو کے صاحب طرز ادیبوں کی کوئی مختصر فہرست خواجہ حسن نظامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک زود نویس اور کثیر التصانیف ادیب تھے۔ انھوں نے انشائیے۔ سفرنامے اور روزنامچے لکھے۔ تفسیر بھی لکھی۔ صحافت سے بھی اپنا رشتہ قائم کیا۔ ایک سوانح نگار اور مرقع نگار کی حیثیت سے بھی اپنی انفرادیت تسلیم کروائی۔ ان کے اسلوب کی آب وتاب بدستور باقی ہے۔ تصوف کے مشائخ کے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ وہ گیروا لمبا کرتہ پہنتے تھے۔ انھوں نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا اور نظام المشائخ کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا۔ اسی رسالہ میں ان کا سفرنامہ شام بھی شائع ہوا۔ انھوں نے نثر کے مختلف اصناف میں اپنی تخلیقی یادگاریں چھوڑی ہیں ''آپ بیتی''۔ ''بیگمات کے آنسو''۔ ''سیپارۂ دل''۔ ''بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ''۔ ''جگ بیتی کہانیاں''۔ ''چار درویشوں کا تذکرہ''۔ ''دلی کی جانکنی''۔ ''سفرنامہء حجاز''۔ ''مصر وشام''۔ ''طب کی تاریخ''۔ ''طمانچہ بر رخسار یزید'' وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔ انھوں نے ایک عام فہم تفسیر بھی لکھی ہے۔ ان ایک اور تاریخی اور ادبی کارنامہ ''فرعونی تاریخ'' ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے۔ ''میلاد نامہ'' کے نام سے سیرت رسول ﷺ لکھی ہے اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی سوانح عمری بھی قلم بند کی ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے مضامین میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ معمولی سی معمولی چیز سے کوئی سبق لیتے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی فکر رسا اور مشاہدہ زرخیز ہے۔ مناظر قدرت سے بھی ان کی جذباتی وابستگی ہے وہ صبح دوپہر شام سردی وگرمی و برسات کی کیفیات اپنے خاص انداز میں

بیان کرتے ہیں۔ان کی جمالیاتی حس بہت تیز ہے اور وہ فطرت کی رنگارنگی میں ڈوب کر اس کے بوقلموں جلووں کی مصوری کرتے ہیں اور جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی عارفانہ نکتہ اور کوئی درس تلاش کر لیتے ہیں۔ان کا طرز نگارش سلیس۔عام فہم اور دل نشین ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (1888 تا 1958)

مولانا آزاد کے والد کا نام خیر الدین تھا جو ہندوستان کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہجرت کر کے سرزمین حجاز چلے گئے تھے وہیں مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی۔بعد میں ان کے والد خیر الدین اپنے علاج کے سلسلہ میں کلکتہ آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔مولانا آزاد نے ابتدائی تعلیم و تربیت مختلف اساتذہ سے یہیں کلکتہ میں حاصل کی۔مولانا آزاد نے بعد میں انگریزی بھی سیکھی اور اتنی سیکھی کہ انگریزی زبان کی علمی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ان کی میز پر انگریزی زبان کی علمی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔1912 میں مولانا آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا جو حق گوئی و بے باکی کا مرقع تھا۔اس میں انگریزوں کی سیاسی پالیسی پر سخت تنقیدیں کی جاتی تھیں۔الہلال حکومت مخالف موقف کی وجہ سے زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرتا رہا۔بند ہوا تو بعد میں ''البلاغ'' کی شکل میں نمودار ہوا۔1927 میں الہلال دوبارہ نکلا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد مستقل طور پر بند ہو گیا۔مولانا کو قید و بند کی زندگی گزارنی پڑی۔1916 کو انھیں رانچی میں نظر بند کیا گیا اور چار سال کی نظر بندی کے بعد 1920 میں انھیں رہا کیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بہت بڑے ادیب۔زبردست عالم دین۔بلند مرتبہ سیاسی قائد اور غیر معمولی خطیب تھے۔الہلال اور البلاغ کے علاوہ کئی کتابیں مثال کے طور پر'' تذکرہ''۔ ''ترجمان القرآن''۔''غبار خاطر'' اور'' کاروان خیال'' ان کی یادگار تصانیف ہیں۔انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے نقوش ''انڈیا ونس فریڈم'' کے نام سے مرتب کیے ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ہے۔الہلال میں مولانا نے جو آتشیں مقالات سپرد قلم کیے ان کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ یہ مقالات مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کے اندر سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے لکھے گئے تھے۔ ترجمان القرآن قرآن کریم کی تفسیر ہے وہ بائیس پاروں تک مکمل ہو سکی۔اس میں سب سے طویل تفسیر سورہ ءفاتحہ کی تفسیر ہے۔غبار خاطر خطوط کا مجموعہ ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد ایک نئے اسلوب

کے بانی ہیں۔ الہلال اور البلاغ میں ان کا اسلوب پر جوش اور ولولہ انگیز ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعور کی بیداری کے لیے صور پھونکا جا رہا ہے۔ غبار خاطر کا اسلوب مختلف ہے اس میں شیرینی اور نغمگی ہے۔ حسرت موہانی نے مولانا کی آزاد کی نثر کی ستائش کرتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزہ نہ رہا

ڈاکٹر عابد حسین (1895 تا 1978)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مسلمانوں کے لیے ایک مستحکم ادارہ اور ایک مینارہ نور اور نئی نسل کے خوابوں کی تعبیر بنانے کے لیے کئی اشخاص نے انتھک کوششیں کیں۔ ان شخصیات میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مجیب کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین بہت بڑے مفکر۔ سحر طراز انشا پرداز اور فلسفی تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے طرز فکر کو عصری رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اسلام کی تہذیب کے ساتھ ہندوستان کی قومی تہذیب کا بھی شعور تھا اور اس موضوع پر ان کی کتاب ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' بہت بلند پایہ علمی اور فکری کتاب ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے ہندوستان میں حالیہ دور کی وہ تاریخ لکھی ہے جو مسلمانوں کے اردگرد گھومتی ہے اور یہ کتاب ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں انگریزوں کے عہد اقتدار اور مختلف سیاسی کشمکش اور مسلمان شخصیتوں کا اس میں رول۔ مسلمانوں کی آزمائش کا دور اور مسلمان قائدین۔ ان تمام موضوعات پر بہت تفصیلی اور فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ اسلوب عالمانہ اور اسی کے ساتھ انشا پردازانہ ہے۔ جن لوگوں کو عہد حاضر میں اس ملک کے اندر مسلمانوں کی تاریخ جاننی ہو ان کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

1949 میں ڈاکٹر عابد حسین کو جامعہ کا پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ 1948 میں انھوں نے ایک ہفت روزہ اخبار ''نئی روشنی'' کے نام سے جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کی خود اعتمادی بحال کرنا تھا۔ یہ اخبار 1950 تک جاری رہا۔ کئی سال تک وہ علی گڑھ میں جنرل ایجوکیشن نصاب کے وہ ڈائرکٹر رہے۔ 1968 میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے انھیں آل انڈیا ریڈیو میں اپنا ادبی مشیر نامزد کیا اور پھر 1967 میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے انھوں نے ''اسلام اینڈ دی ماڈرن

ایج'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسی نام سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالا۔ اردو میں اسلام اور عصر جدید کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ وہ نکالتے رہے۔ انھیں پدم بھوشن کا خطاب بھی دیا گیا۔ ان کی علمی دل چسپیاں متنوع تھیں۔ انھوں نے کئی ادبی تخلیقات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ ادب پاروں کی روح کو اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ ایک فلسفی تھے اور سماجی مفکر بھی تھے اور ان کے مضامین میں بہت زیادہ شگفتگی اور دل کشی کا عنصر موجود ہے۔ مزاح اور طنز وظرافت سے متعلق بھی ان کی تحریریں ہیں۔ جسے پڑھ کر تبسم نمودار ہوتا ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو نثر کو فروغ دیا۔

مسعود حسن رضوی ادیب (1893 تا 1975)

مسعود حسن رضوی ادیب ایک سربرآوردہ ادیب اور نقاد اور محقق ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور یہاں کے ادبی کارناموں کو متعارف کروانے میں اہم رول ادا کیا۔ میر انیس کے فن کی تفہیم وتحقیق سے متعلق ان کی کئی کتابیں ہیں جیسے روح انیس۔ شاہ کار انیس اور رزم نامہ انیس۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں استاد رہے اور یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ 1970 میں انھیں پدم شری کا خطاب ملا۔ ان کی کتابوں کی تعداد تیس سے اوپر بتائی جاتی ہے جن میں بعض کتابوں کی حیثیت تحقیق کی ہے اور بعض کتابیں تنقید سے متعلق ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں ''مجالس رنگین''۔ ''فیض نیر'' اور ''متفرقات غالب'' اور ''آب حیات کا تنقیدی مطالعہ'' اور ''تنقید کلام غالب'' اور ''نگارشات ادیب'' اور ''سلطان عالم واجد علی شاہ'' ہیں۔ ان کی وہ کتاب جو اردو زبان وادب اور شاعری کا پاکیزہ ذوق پیدا کرنے میں بہت معاون ہے اور جو بہت زیادہ مقبول بھی ہوئی ہے وہ ان کی کتاب ''ہماری شاعری'' ہے۔ انھوں نے اردو شاعری پر لگائے الزامات کا جواب بہت شائستہ اور مہذب انداز میں دیا ہے۔ مسعود حسن رضوی کا شمار نہ صرف بلند پایہ نقاد میں ہوتا ہے بلکہ انھوں نے اردو شاعری کی خوبیوں اور محاسن پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر وشاعری میں اردو شاعری پر جو تنقیدیں کی تھیں ان کا جواب لیکن بہت ہی شائستگی کے ساتھ مسعود حسن رضوی نے دیا ہے۔ حالی نے کہا تھا کہ اردو شاعری گل وبلبل کی شاعری

ہے۔ مسعود حسن رضوی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گل وبلبل دراصل زندگی کی علامتیں ہیں جن کے وسیلہ سے غزل گو شعرا نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

آغا حشر کاشمیری (1876 تا 1935)

آغا حشر کاشمیری ڈرامہ نگاری میں اردو کے شیکسپیئر کہلاتے ہیں اردو ڈرامہ کی نشاونما اور ترقی میں ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا۔ ان کے خاندان کے دو بزرگ کشمیری شال کی تجارت کرتے تھے اور اسی سلسلہ میں بنارس آئے تھے جہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ بنارس ہی میں آغا حشر کاشمیری کی ولادت ہوئی اور یہیں انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی اور یہیں پھر انھوں راج نارائن ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور حشر تخلص اختیار کیا۔ بمبئی کی ایک تھیٹر کی کمپنی جب بنارس آئی تو اس نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ حشر نے اس کمپنی کے ڈرامے دیکھے تو ان کے اندر سویا ہوا ڈرامہ نگار بیدار ہو گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ''آفتاب محبت'' کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔ پھر وہ بمبئی چلے گئے اور یہاں ان کے تعلقات ایک ناٹک منڈلی کمپنی کے مالک سے ہوئی۔ کمپنی کا مالک ان کی فی البدیہہ شعر گوئی کی صلاحیت سے متاثر ہوا اور انھیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ یہاں انھوں نے کئی ڈرامے لکھے۔ جیسے مرید شک۔ اسیر حرص۔ یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے اور انھوں نے پھر ''جرم وفا'' اور ''باپ کا قاتل'' اور ''ترکی کی حور'' کے نام سے ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں نے مقبولیت کی بلندیوں کو چھولیا۔ انھوں نے حشر فلمس کے نام سے اپنی کمپنی بھی قائم کی اور ''خوبصورت بلا'' اور ''یہودی لڑکی'' اور ''صید ہوس'' کے نام سے ڈرامے لکھے۔ یہ سارے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں میں برجستہ گوئی۔ فقرے بازی۔ خطابت اور شاعری کا جادو جگایا گیا تھا۔ بہت سے مکالموں میں سجع اور قافیہ کا التزام تھا۔ اس لیے کہ قدیم ڈراموں کا یہی اسلوب ہوا کرتا تھا۔ بعد میں انھوں نے اپنے ڈراموں میں زمانہ کے لحاظ سے تبدیلیاں کیں لیکن اس کے ساتھ ہی عوام کے معیار اور ذوق کو پیش نظر رکھا گیا۔ آغا حشر کاشمیری نے اپنے ڈراموں میں ہمیشہ ادبیت قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے ادبی اعتبار سے مشہور ڈراموں میں ''سیتا بن باس'' اور ''رستم وسہراب'' مشہور ڈرامے ہیں۔ ادبی حیثیت سے آغا حشر کاشمیری نے ڈرامہ کو دل کشی عطا کی

ہے اور بقول آل احمد سرور آغا حشر قدیم اور جدید ڈرامہ کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امتیاز علی تاج (1900 تا 1970)

اردو ڈرامہ کی تاریخ میں مشہور ڈرامہ ''انارکلی'' کے تخلیق کار امتیاز علی تاج کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ اردو میں ڈرامہ نگاری نے اتنی ترقی نہیں کی جتنی دوسری زبانوں کے ڈراموں نے کی۔ اس کے بہت سے اسباب بتائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس فن کو مذہبی اعتبار سے ثقہ اور معتبر نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے مذہبی ذہن کے لوگ اس سے گریزاں رہے۔ بہر حال اردو ڈرامہ نگاری میں انارکلی کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے اور اس کے ڈرامہ نگار امتیاز علی تاج کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے 1922 میں بی اے کی ڈگری لی۔ وہ تہذیب نسواں کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالتے رہے جسے ان کے والد نے شروع کیا تھا۔ پھر امتیاز علی تاج نے 1918 میں کہکشاں کے نام سے رسالہ جاری کیا اور جب ان کا ڈرامہ انارکلی 1922 میں منصۂ شہود پر آیا تو اسے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھیں ''ستارہ امتیاز'' سے پاکستانی حکومت نے نوازا۔ ان کے اور بھی کئی ڈرامے ہیں جیسے حلیم قلب اور صید و صیاد۔ ورجینا اور الوّ کی زبان وغیرہ۔ وہ ایک کثیر التصانیف نثر نگار تھے اور ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے اسکول کی کہانیاں۔ بونوں کی کہانیاں۔ بیربل کی کہانیاں۔ خزانوں کی کہانیاں۔ خانہ بدوشوں کی کہانیاں۔ سانپوں کی کہانیاں۔ جنوں کی کہانیاں۔ کنجوسوں کی کہانیاں اور ہیبت ناک افسانے اور چچا چھکن وغیرہ۔ یہ سب ان کی نثری یادگاریں ہیں اور چچا چھکن اردو کے مزاحیہ ادب کا ایک قابل قدر نقش ہے۔

ان کے ڈراموں۔ افسانوں اور کہانیوں میں جو شہرت انارکلی کو ملی وہ کسی اور کتاب کو نہیں مل سکی۔ اس ڈرامہ میں انھوں نے مغل حکمرانوں کی حرم سرا۔ خواجہ سرا۔ کنیزوں اور بیگمات کی شاندار مرقع کشی کی ہے۔ ان سب کے آداب و انداز۔ طرز گفتگو۔ شہنشاہ کے رعب و جلال کو انھوں نے مجسم کر دیا ہے اور ہر کردار کی زبان اور گفتگو کا فرق ملحوظ رکھا ہے۔ جس سے جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور کردار کا فرق بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ڈرامہ کے آغاز سے انجام تک تجسس اور تذبذب کی فضا برقرار رہتی ہے۔ مغلوں کے قلعے۔ باغات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ انارکلی کے برجستہ مکالمے

ڈرامہ نگار کی قوت اظہار اور فنی ذکاوت کے مظہر ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب (1902 تا 1985)

محمد مجیب ان باکمال شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں دانشوری کی روایات کو استحکام عطا کیا۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ دہرہ دون کے ایک پرائیویٹ اسکول میں ثانوی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ بھیج دیے گئے۔ یہاں انھوں نے لاطینی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترقی میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین۔ شفیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ساتھ حصہ لیا۔ جامعہ ملیہ میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ ملیہ سے علی گڑھ چلے گئے تو پروفیسر محمد مجیب نے شیخ الجامعہ یعنی وائس چانسلر کی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے جامعہ میں کئی شعبے قائم کیے اور بہت سی کتابیں لکھیں جو ان کی گہری بصیرت اور تاریخ دانی اور دانشوری اور ادبی ذوق پر دلالت کرتی ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں انڈین مسلم کے نام سے قابل قدر کتاب لکھی۔ اردو میں ان کی بہت کتابیں ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''دنیا کی تاریخ'' ان کے عمیق نظر۔ وسیع مطالعہ۔ فلسفیانہ بصیرت اور شگفتہ اسلوب پر دلالت کرتی ہے۔ ان کی دوسری کتابوں میں تاریخ ہندوستان کی تمہید۔ تاریخ فلسفہ سیاسیات۔ روسی ادب۔ تاریخ تمدن ہند (قدیم)۔ اردو کلام کا انتخاب اہم ہیں۔

پروفیسر محمد مجیب ادیب اور مؤرخ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ڈرامہ نگار بھی تھے۔ ''کھیتی'' ان کا پہلا ڈرامہ ہے۔ ''خانہ جنگی'' اور ''حبہ خاتون'' ان کے دوسرے ڈرامے ہیں۔ ان کا ایک ڈرامہ ''آزمائش'' کے نام سے ہے۔ ''ہیروئن کی تلاش'' کے نام سے ان کا ایک اور ڈرامہ ہے۔ ان کے تمام ڈراموں میں مقصدیت کا عنصر بہت نمایاں رہتا ہے اور جس کی وجہ سے مکالمے طویل بھی ہو جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کا اسلوب سادہ۔ پر اثر اور عام فہم ہے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد انشا پردازی کی رنگینی کے درمیان بھی صاف نظر آتا ہے۔

قاضی عبدالودود (1897 تا 1984)

قاضی عبدالودود نے اردو ادب میں تحقیق و تدوین کی روایت کو فروغ دیا اور تحقیق کے آداب کا سلیقہ سکھایا اور اس میدان میں حق گوئی و بے باکی کا درس دیا۔ حق اور باطل۔ سیاہ و سپید

کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کا ہنر آشکار کیا۔ قاضی عبدالودود ایک اصول پرست اور سخت گیر محقق ہیں اور راست گفتاری اور حقیقت پسندی سے سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ گیان چند جین نے انھیں ''بت شکن'' محقق کے نام سے یاد کیا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کے بہت سے ایسے بتوں کو توڑا جن کی عظمت اور برگزیدگی مسلمہ تھی اور ان کا ''فرمایا ہوا'' ''مستند'' تصور کیا جاتا تھا۔ قاضی عبدالودود نے عربی فارسی کی تعلیم اپنے وطن بہار میں حاصل کی۔ پھر وہ علی گڑھ گئے۔ علی گڑھ کے کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں لاطینی۔ جرمن اور فرانسیسی زبانیں سکھائی جاتی تھیں۔ 1920 میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری لی اور اس کے بعد اعلی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ مارچ 1929 میں پٹنہ واپس ہوگئے اور علم وادب کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ انھوں انگریزی اور فرانسیسی ادب کا بھی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ انھیں تاریخ اور قانون سے بھی دل چسپی تھی۔ انھوں نے اپنی تمام توانائی بحث وتحقیق میں صرف کی۔ ان کی مشہور تصانیف میں ''تذکرہ ءشعرا''۔ ''دیوان جوشش'' اور ''قاطع برہان'' اہم ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین کی تعداد دوسو سے اوپر ہے۔ ان کی اہم تحریروں میں ''غالب کا فرضی استاذ'' ''میر تقی میر حیات وشاعری'' اور ''عبدالحق بحیثیت محقق'' اور ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' وغیرہ شمار کی جاتی ہیں۔ ان کو میر تقی میر اور انشا اور غالب اور مصحفی سے غیر معمولی لگاؤ تھا۔ انھوں نے مسعود حسن رضوی کی ''دیوان فائز'' پر محققانہ تبصرہ لکھا۔ انھوں نے اپنی کتاب ''عیار ستان'' میں خواجہ احمد فاروقی کی متعدد اغلاط کی نشاندہی کی۔ انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کے ماخذ کا بڑی سختی کے ساتھ محاسبہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ خواجہ احمد فاروقی نے جن تصانیف کے حوالے دیے ہیں وہ ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں۔ قاضی عبدالودود تحقیق میں دوستی۔ ذاتی تعلقات اور مراسم کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انھوں نے بابائے اردو عبدالحق کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور عبدالحق کی مرتب کردہ ''ذکر میر'' ''انتخاب کلام میر'' ''نکات شعرا'' ''گلشن ہند'' کا تحقیقی نقطہ ءنظر سے جائزہ لیا۔ ذکر میر پر قاضی عبدالودود کا سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ عبدالحق نے تدوین کے دوران اس کتاب کے صرف ایک نسخہ پر تکیہ کیا اور دوسرے نسخوں سے استفادہ نہیں کیا۔ عبدالحق پر قاضی عبدالودود کے تحقیقی محاکمات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ غیر محتاط محقق ہیں اور فارسی نثر سمجھنے میں اکثر سہو کا شکار ہوگئے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا بھی

احساس ہوتا ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے دوسروں سے بھی کام کروائے ہیں۔ کتاب عیارستان میں بھی عبدالودود نے خواجہ احمد فاروقی کی کتاب ''اشتر وشوزن'' پر سخت تنقید کی ہے اور قاضی عبدالودود نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرتب نے سن کتابت کو تاریخ تصنیف سمجھا ہے اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مصنف نے جو غلطیاں کی تھیں انھیں خواجہ احمد فاروقی نے جوں کا توں چھاپ دیا ہے۔

قاضی عبدالودود نے غالب پر کوئی پینتیس مضامین سپرد قلم کیے ہیں اور غالب بحیثیت محقق میں انھوں نے ''قاطع برہان'' کے سلسلہ کے مباحث پر روشنی ڈالی ہے اور ان مباحث میں غلطیوں اور تسامحات کا جائزہ لیا ہے۔

ادبی تذکروں کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود کی معلومات بہت وسیع اور غیر معمولی ہیں۔ اردو کے بہت کم مصنفین اس معاملہ میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ قاضی عبدالودود ایک بلند پایہ محقق ہیں۔ انھوں نے تحقیق کو ایک فن بنا کر پیش کیا اور ان کی تحریروں کی وجہ سے بہت سے مصنفین تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے محققین کو حزم واحتیاط کا درس دیا۔ ان کا نظریہ ہے کہ محقق کو عبارت آرائی اور رنگین بیانی اور تشبیہات واستعارات کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے اور تحقیق کی زبان دو اور دو چار کی طرح واضح ہونا چاہیے۔ خود وہ اپنے اصول پر کاربند رہے۔ انھوں نے اردو زبان کے طلبا اور اساتذہ کو آئین تحقیق سکھائے اور اردو تحقیق کو علمی وقار سے آشنا کیا۔

مختارالدین احمد آرزو (1924 تا 2009)

مختارالدین احمد عربی زبان کے عالم۔ قدیم اردو متون کے ماہر اور شمالی ہند کی پہلی اردو ''کربل کتھا'' کے مرتب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ یہ تصنیف اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ تابندہ رکھے گی۔ مختارالدین کا شمار اردو کے ان محققین میں ہوتا ہے جنھیں مخطوطہ شناسی کے آئین وآداب پر کامل دسترس حاصل ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن پٹنہ میں حاصل کی۔ ان کے والد مولانا ظفرالدین قادری ایک بڑے عالم تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور عربی میں ایم اے کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے انھیں علی گڑھ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات کا سربراہ بنا دیا۔ وہ صبح سے دوپہر تک لائبریری میں کام کرتے اور پھر دوپہر سے

شام تک شعبہء عربی میں بحیثیت ریسرچ اسکالر مصروف تحقیق ومطالعہ ہوتے۔ پی ایچ ڈی میں ان کے نگراں مشہور محقق عبدالعزیز میمن تھے۔1953 میں شعبہء عربی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں وہ آکسفورڈ بھی گئے اور جرمنی اور فرانس اور دوسرے ملکوں میں اردو ادب سے متعلق مواد حاصل کرتے رہے۔انھیں تحقیق سے بڑا شغف تھا۔انھوں نے مختلف تحقیقی موضوعات پر مضامین سپرد قلم کیے اور تدوین سے بھی دل چسپی لی جس کے معیاری نمونے ''تذکرہء شعرا فرخ آباد''۔''سیر دہلی'' ''کربل کتھا''۔ ''گلشن ہند''۔''تذکرہء حیدری'' اور ''تذکرہء آزردہ'' ہیں۔ انھوں نے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں بھی تیار کیں جن سے تحقیق کرنے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ کون سا مخطوطہ کہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔اس طرح کے کاموں میں ''فہرست مخطوطات احسن کلکشن''۔ ''فہرست مخطوطات ونوادر کتب خانہ مسلم یونیورسٹی'' زیادہ اہم ہیں۔انھوں نے شروع میں شاعری بھی کی لیکن قاضی عبدالودود کے فیض صحبت سے ان کو تحقیق سے دل چسپی پیدا ہوئی تو انھوں نے شاعری ترک کردی اور تحقیق وتدوین کی طرف متوجہ ہوگئے۔اردو تحقیق میں مختارالدین احمد کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے ایسے متون دریافت کیے جن کی دریافت کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔انھوں نے راجہ رام موہن رائے کا ایک خط بھی ڈھونڈ نکالا۔ یہ خط انھوں نے یورپ کے ذخیروں سے حاصل کیا تھا۔انھوں نے لندن۔فرانس اور جرمنی کے نایاب ذخیروں سے استفادہ کیا اور ان چھپے ہوئے خزانوں سے گوہر آب دار حاصل کیے۔ان کی کتاب کربل کتھا ان کو اردو کے معتبر محققین میں شمار کیے جانے کی سفارش کرتی ہے۔انھوں نے جس خلوص۔توجہ اور انہماک کے ساتھ کربل کتھا کی تدوین کی ہے وہ نوجوان محققین اور تازہ واردان بساط تحقیق کے لیے قابل تقلید ہے۔ان کے پاس ان کے نام ادبا اور شعرا کے بہت سے خطوط ہیں اور انھوں نے جن ادبا اور شعرا اور اہل علم کو خطوط لکھے تھے ان کی نقل بھی ان کے پاس محفوظ ہے یہ علمی خزانہ ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثا کو چاہیے کہ ان کو شائع کریں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو بھی اشاعت کی طرف متوجہ کریں۔

مولوی عبدالحق (1870۔1381ھ)

اردو کے سلسلہ میں مولوی عبدالحق نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد

رکھی جائیں گی۔انھیں بابائے اردو کا خطاب دیا گیا ہے، جوش ملیح آبادی نے انھیں دیوانہ اردو کہا کرتے تھے۔انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان وادب کے لیے وقف کردی تھی۔ان کی پیدائش ہاپوڑ کے قریب سرادھانامی گاؤں میں ضلع میرٹھ اتر پردیش میں ہوئی تھی۔پھر وہ پنجاب چلے آئے ۔پھر وہ حصول علم کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گئے۔سرسید۔حالی۔شبلی جیسے اکابر قوم کی تربیت میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔پھر وہ حیدرآباد آئے اور ایک رسالہ ''افسر'' کی ادارت ان کے سپرد کی گئی اور مدرسہ آصفیہ میں وہ مدرس ہوگئے۔اردو لغت کی تیاری کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپیہ انھیں ملتا رہا۔ جو انیس سو تیس (1930) سے انیس سو چالیس (1940) تک جاری رہا۔جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے ناظم مقرر کیے گئے اور جب اورنگ آباد کالج قائم ہوا تو اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر بھی رہے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر جب دہلی منتقل ہوگیا تو وہ بھی دہلی چلے گئے۔ 1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی۔1948 میں وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں انجمن ترقی اردو پاکستان کی بناڈالی اور اردو کالج بھی قائم کیا۔

بابائے اردو عبدالحق نے بعض اہم تذکرے مرتب کیے اور ان پر مفید مقدمات سپرد قلم کیے۔''نکات الشعرا''۔''تذکرہ ریختہ گویان''۔''مخزن نکات''۔''چمنستان شعرا''۔''عقد ثریا''۔ ''تذکرہء ہندی''۔''ریاض الفصحاء''۔''مخزن الشعرا'' کو انھوں نے اردو داں طبقہ سے روشناس کروایا کہ ان کی تاریخی اور ادبی اہمیت واضح ہوگئی۔عبدالحق کا شمار ان محققین میں ہوتا ہے جنھوں نے دکنی ادب کے سرمایہ میں اپنی تحقیق سے قابل قدر اضافے کیے۔انھوں نے وجہی کی ''سب رس'' کو مرتب کر کے اس کے مقدمہ میں اس گرانقدر ادبی تخلیق کا اسلوبیاتی مطالعہ بھی کیا اور اس کے ماخذوں سے بھی بحث کی۔عبدالحق نے پہلی بار اردو دنیا کو نثر کے قدیم نمونے کی طرف متوجہ کیا۔ انشاء کی کہانی ''ایرانی کیتلی'' ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔عبدالحق نے ایشیاٹک سوسائٹی کے قدیم کتب کے ذخیرہ سے اسے حاصل کیا تھا۔1933 میں عبدالحق نے ایک اہم کتاب لکھی جس کا نام تھا ''اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ''۔ان کی ایک اور کتاب ''نصرتی'' ہے۔نصرتی دکن کا نہایت ممتاز اور قدآور شاعر تھا۔مصنف نے اپنی کتاب میں شاعر کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔

نیاز فتحپوری (وفات 1966)

نیاز فتحپوری ایک شاعر۔ ایک بصیرت مند نقاد اور ایک اچھے انشاء پرداز اور صحافی تھے۔ انھوں نے پانچ دہائیوں تک علم وادب کی جو گرانقدر خدمت انجام دی وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ فتحپور میں ہوئی۔ بعد میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی داخلہ لیا اور وہ اس لیے کہ نیاز فتحپوری کے والد دارالعلوم ندوہ میں مطبخ کے ذمہ دار مقرر ہو گئے تھے۔ لیکن ندوہ میں ان کی تعلیم کا زمانہ مختصر رہا۔ انھوں نے الہ آباد میں ملازمت کی اور پھر ظفر علی خان نے ''زمیندار'' میں کام کرنے کی دعوت دی اور وہ لاہور چلے آئے۔ پھر وہ زمیندار سے بھی الگ ہو گئے۔ حکیم اجمل خان نے ایک چھوٹا سا انگریزی اسکول قائم کیا تو نیاز اس کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ پھر انھوں نے اس سے بھی استعفیٰ دے دیا اور بھوپال آ گئے جہاں ان کا گیارہ برس تک قیام رہا۔ ''گہوارہ تمدن''۔ ''صحابیات''۔ ''مصطفیٰ کمال پاشا''۔ ''تاریخ اسلام ابتدا سے حملہ تیمور تک'' قیام بھوپال کے زمانہ کی تصانیف ہیں۔ 1927 میں پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے اس کے بعد انھوں نے رسالہ ''نگار'' جاری کیا اور چوالیس برس تک نگار پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ نیاز کی صحافتی اور ادبی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جولائی 1962 میں نیاز ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے وہاں انھیں اردو ترقی بورڈ اور اردو لغت کا کام سونپا گیا۔ نیاز فتحپوری نے ''عرض نغمہ'' کے نام سے ٹیگور کی گیتا نجلی کا ترجمہ کیا۔ نیاز کے افسانے رومانیت۔ جمالیاتی ذوق اور تہذیبی حسیت کے آئینہ دار ہیں اور ان میں سماجی مسائل کا عکس نظر آتا ہے۔ نیاز کے دو طویل افسانے ''شہاب کی سرگزشت'' اور ''شاعر کا انجام'' نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ''حسن کی عیاریاں'' چوبیس کہانیوں پر مشتمل ہے اور ''مختارات نیاز'' میں دس افسانے ہیں جو انگریزی فکشن سے ماخوذ ہیں۔ ''چند دن بمبئی میں'' نیاز فتحپوری کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ نیاز فتحپوری مناظر قدرت کے دل دادہ ہیں۔ ان کے علاوہ نیاز کی تصانیف ''انتقادیات'' اور ''مالہ وماعلیہ'' سے ان کے تنقیدی رویہ کا پتہ چلتا ہے۔ ''کلام مومن پر ایک طائرانہ نظر'' نیاز کا ایک اہم تنقیدی مضمون ہے۔ انھوں نے داغ۔ ریاض خیرآبادی۔ نظیر اکبرآبادی۔ حسرت موہانی اور اقبال پر بھی تنقیدی مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔ وہ نگار

کے 44 سال تک اڈیٹر رہے اور انھوں نے چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک انھوں نے اردو طبقہ کے ادبی ذوق کی تکمیل کی اور تشنگان علم کی پیاس بجھائی۔

مجنون گورکھپوری (1904 تا 1988)

مجنون گورکھپوری کی شخصیت ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی وہ افسانہ نگار بھی تھے اور نقاد بھی تھے۔ان کا اصل نام احمد صدیق تھا اور وہ ضلع بستی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔عربی فارسی کی تعلیم کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا۔ان کے اکثر افسانوں کا انجام المیہ ہوتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں عورت خلوص و وفا کا پیکر بن ہمارے سامنے آتی ہے۔مجنون گورکھپوری ملازمت سے علیحدگی اختیار کرنے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔انھوں نے بحیثیت نقاد بھی بہت کام کیا ہے، ان کی نثر پر اثر، سادہ بے ساختہ اور رواں ہے۔ان کے اندر جذبات نگاری کا سلیقہ موجود ہے اور وہ اپنے کرداروں کو مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔انھوں نے ''زیدی کا حشر'' کے نام سے ایک دل چسپ اور موثر ناولٹ بھی لکھا تھا۔مجنون کے افسانے زندگی کو راز الفت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اپنے افسانوں میں انھوں نے مذہب وملت کو محبت کے راستہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ان کے مشہور افسانوں میں ''خواب وخیال''۔''بے گانہ''۔''شکستہ بے صدا''۔''سمن پوش''۔ ''تم میرے ہو'' اور ''من در چہ خیالیم وفلک در چہ خیال'' کا شمار ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں دل کشی ہوتی ہے اور قاری ان میں محو ہو جاتا ہے۔

اردو تنقید میں مجنون گورکھپوری کا مقام بلند ہے اور انھوں نے نئے رجحانات ونظریات کا اس میدان میں تعارف کرایا ہے۔ان کا شمار نئی تنقید کے معماروں میں ہوتا ہے۔تنقید سے متعلق ان کے بہت سے مضامین ہیں جیسے ''ادب اور زندگی''۔''مبادیات تنقید''۔''زندگی اور ادب کا بحران''۔''ادب اور ترقی''۔''نظیر اکبرآبادی''۔''حالی کا مرتبہ اردو ادب میں'' اور ''نیا ادب کیا ہے'' مجنون گورکھپوری کے اہم تنقیدی مضامین ہیں۔ان کی کتابیں بھی ہیں۔جیسے ''ادب اور زندگی''۔ ''تنقیدی حاشیے''۔''نقوش وافکار''۔''اقبال'' اور ''نکات مجنون'' وغیرہ۔ان کتابوں سے مجنون کے تنقیدی افکار اور خیالات کا تعارف ہوتا ہے۔کہیں کہیں ان کا تنقیدی اسلوب بہت تاثراتی ہو جاتا ہے۔جیسے وہ لکھتے ہیں ''اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی ہے اور وہ میر کہلاتا ہے''۔ظاہر ہے کہ اس

طرح کے تبصروں سے مضمون نگار کی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے لیکن شاعر کی شخصیت پر صحیح روشنی نہیں پڑتی ہے۔ لیکن شاعرانہ مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں ''تنقید بھی ادب کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے جذبات سے اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا''۔ بعد میں مجنون گورکھپوری نے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر بھی اختیار کیا اور کارل مارکس کے افکار کو بھی اپنایا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ کسی ادب پارے میں گھلاوٹ۔ آہنگ۔ فنی حسن۔ دل کشی اور جمالیاتی رچاؤ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ رقم طراز ہیں کہ ''ادب قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ہوتا ہے'' ان کا یہ نقطہ نظر مشہور انگریزی نقاد میتھیو آرنلڈ کے فکر کا انعکاس ہے۔ کیونکہ اس نے ادب کو زندگی کی تنقید سے تعبیر کیا تھا۔ انھوں نے آرنلڈ کے نظریات کی تائید کی ہے۔ انھوں نے ادب کو معاشرتی محرکات کا آفریدہ بھی بتایا ہے۔ انھوں نے نظیر اکبرآبادی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے روح عصر کی اہمیت اجاگر کی ہے اور وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ ''اب بھوک اور پیاس اور دوسری انسانی حقیقتوں کو ادب اور شاعری میں وہی جگہ دی جائے گی جو پہلے حسن وعشق کو دی جاتی تھی''۔ مجنون گورکھپوری کا اسلوب نگارش دل چسپ۔ شگفتہ، رواں اور دل آویز ہے اور قاری اس کی جاذبیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ انھوں نے اقبال کے شاہین پر تنقید کی ہے کہ اس سے جارحیت اور سفاکی اور قوت کے استعمال کا درس ملتا ہے۔

کلیم الدین احمد (1908 تا 1983)

اردو ادب میں کلیم الدین احمد کو مغربی ادب وتنقید کے وکیل کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ مغربی ادب اور تنقید ان کے نزدیک معیار ہے اور جو ادب یا تنقید اس معیار پر پوری نہ اترتی ہو وہ پست۔ حقیر اور کم مایہ ہے۔ کلیم الدین احمد کی ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہوئی اور پٹنہ یونیورسٹی سے انھوں نے 1930 میں ایم اے کی ڈگری لی۔ پھر وہ انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ وطن واپس آئے تو پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر بنا دیے گئے اور بعد میں شعبۂ انگریزی کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ پھر پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے اور بھاگل پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ حکومت نے انھیں پدم شری کے خطاب سے بھی نوازا۔

کلیم الدین احمد نے انگریزی ادب کے اصولوں کو جوں کا توں اردو شعرا اور ادیبوں پر

منطبق کرنے کی کوشش کی اور یہ حقیقت فراموش کردی کہ ہر ملک کے ادب کا ایک مخصوص مزاج اور اس کی تہذیبی اور ادبی روایت ہوتی ہے۔تنقید کے موضوع پر ان کی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' ایک دھماکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کی نظر میں اردو شاعری اور اردو ادب بے حیثیت اور بے قیمت ہے۔قصیدہ کو انھوں نے تملق اور خوشامد کا نمونہ قرار دیا۔مثنوی کو معقولیت سے بعید کہا۔ غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا اور اردو تنقید کے بارے میں کہا کہ اس کا وجود فرضی ہے۔یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔کلیم الدین احمد نے ترقی پسند رجحانات پر بھی تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''ادب کو سماج کا پروردہ قرار دینا بے وقوفی ہے'' اور ترقی پسند ادب پر انھوں نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ''ادب کا تعلق دماغ سے ہے پیٹ سے نہیں ہے''۔شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''تمام علوم وفنون کی طرح یہ بھی دماغی تحریکات کا نتیجہ ہے''۔کلیم الدین احمد کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کا تنقیدی شعور گہرا ہے لیکن ان کا لب ولہجہ بہت درشت ہے۔ان کا انداز تنقید منفی ہے۔چنانچہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اردو کے شعرا میں تنظیم وترتیب کا سلیقہ ناپید ہے۔وہ قومی اور ملی شاعری کو شاعری کے رتبہ سے کم تر تصور کرتے ہیں۔انھوں نے اردو کے ادبا اور شعرا اور اہل نقد کے بارے میں جو تبصرے کیے ہیں وہ بہت منفی نوعیت کے ہیں اور جارحانہ ہیں۔جیسے آل احمد سرور کے بارے میں انھوں نے یہ لکھا کہ ''وہ دسترخوان کی مکھی ہیں شہد کی مکھی نہیں''۔فراق گورکھپوری کی تنقیدوں کے بارے میں لکھا کہ ''وہ پہلے شاعر تھے اور اب نقاد بھی ہیں اور نئے روپ میں نظر آتے ہیں۔ عشق کرنا سکھاتے ہیں۔شاید وہ دلال ہیں'' احتشام حسین جیسے نقاد کے بارے میں وہ یوں رقم طراز ہیں ''جب احتشام حسین اس طرز میں لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کررہا ہے''۔ کلیم الدین احمد ہر شاعر کے لیے یہ ضروری تصور کرتے ہیں کہ وہ مغربی ادب کا مطالعہ کرے اور جو فن کار مغرب سے استفادہ نہیں کرتا اس کی تخلیق کو وہ کم مایہ۔کم عیار۔سبک۔ ناقص اور سطحی قرار دیتے ہیں۔نظیر اکبرآبادی کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ وہ ''مغربی ادب سے واقف نہ ہوسکے۔اسی لیے ان کا مطمح نظر بلند نہ تھا''۔انھوں نے ترقی پسند ادب پر بھی بہت زیادہ تنقیدیں کیں اور ان کی تنقیدوں کی وجہ سے ترقی پسندوں کو بھی ہوش کے ناخن لینے پڑے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ سنسنی خیزی ان کی سرشت میں نہیں ہے اور انھوں نے جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ

کر کے لکھا ہے۔

آل احمد سرور بھی کلیم الدین احمد کی خیال آفریں تنقید کو پسند کرتے ہیں اور دقت نظر کے قائل ہیں لیکن ان کا اعتراض یہ ہے کہ ''ان کی تنقید اور بلند ہوتی اگر وہ اپنے قدیم سرمایہ سے اس قدر بیزار نہ ہوتے۔

اختر اورینوی (1910 تا 1970)

اختر اورینوی بہار کے ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ کاکو قصبہ ان کا وطن تھا۔ وہ افسانہ نگار بھی تھے۔ ڈرامہ نویس بھی تھے۔ ناول نگار بھی تھے اور شاعر بھی تھے اور ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین اور ان کے افسانوں کی وجہ سے ان کی ادبی کاوشیں یاد رکھی جائیں گی۔ اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر وہ پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم رہے۔ 1938 میں پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے ہیں۔ ''منظر و پس منظر'' ''کلیاں اور کانٹے'' اور ''انارکلی'' اور ''بھول بھلیاں'' وغیرہ۔ ان کا ناول ''حسرت تعمیر'' 1961 میں فروغ اردو لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ان کا شعری مجموعہ ''انجمن آرزو'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی کتاب ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''قدر و نظر'' ''تحقیق و جدید تنقید'' ''کسوٹی'' ''مطالعہء اقبال'' ''مطالعہء نظیر'' ''تنقید جدید'' اور ''سراج و منہاج'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون ''میرا نظریہ فن'' میں لکھتے ہیں کہ وہ تخلیق میں سماجی میلانات اور ماحول کی معروضیت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں لیکن اس خیال کے حامل ہیں کہ ادب میں انفرادیت اور قوت تخلیق و تعمیر کی اہمیت نسبتاً زیادہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ادیب اختراعی اور جمالیاتی مطالبات سے ہم آہنگ ہو کر ہی تخلیق کے منصب پر فائز ہو سکتا ہے۔ اختر اورینوی کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے سائنس۔ عمرانیات۔ مذہب۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ذوق حسن کو عطیہ فطرت تصور کرتے ہیں اور آرٹ اور مذہب کا چشمہ فیض وجدان کو قرار دیتے ہیں۔ وہ تنقید کو ایک ذوقی چیز تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی تصورات کی اپنے مضامین میں وضاحت کی ہے۔ اختر اورینوی بحیثیت نقاد بڑی اہمیت کے حامل اس لیے ہیں کہ ان کی تحریروں میں بڑا توازن ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ترقی پسندی فیشن بن

گئی تھی وہ افراط وتفریط کے شکار نہیں ہوئے اور نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ کو ادب کا نعم البدل قرار دینے سے انھوں نے انکار کیا۔ اختر اور ینوی اخلاقی اقدار کی اہمیت کے قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ عریاں نگاری ادب پر ایک داغ ہے۔ اختر اور ینوی کے اسلوب میں حسن کاری اور سحر آفرینی پائی جاتی ہے۔ اختر اور ینوی کے تنقیدی مضامین پڑھ کر اہل ادب جو رائے قائم کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اختر اور ینوی تہذیبی ماحول اور جمالیاتی حسن دونوں کے قائل ہیں اور اچھے ادب کو ان دونوں کی کارفرمائی کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی (1917 تا 1985)

خواجہ احمد فاروقی نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے بہت غور وفکر اور توجہ کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کا وطن مراد آباد تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور حلیم مسلم کالج کانپور میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر وہ دہلی کالج آ گئے اور یہاں انھوں نے اردو کا باقاعدہ شعبہ قائم کیا اور پھر دہلی یونیورسٹی میں شعبہء اردو میں صدر رہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''کلاسیکی ادب'' کے نام سے 1953 میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ''میر تقی میر۔ حیات وشاعری'' کے نام سے کتاب لکھی جس پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا۔ ''ذوق وجستجو'' اور ''چراغ رہ گزر'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''یاد یار مہرباں'' میں بزرگوں اور دوستوں کے سوانحی حالات قلم بند کیے ہیں۔ ''اسلامک کلچر'' حیدرآباد ''فکر ونظر'' علی گڑھ کے اڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔

میر تقی میر پر خواجہ احمد فاروقی نے بڑی توجہ اور محنت سے کام کیا ہے اور عہد میر کے تاریخی حالات قلم بند کیے ہیں اور اس عہد کے تہذیبی پس منظر کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین اکثر تاثراتی تنقید معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر میر تقی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''ان کا ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر مصرع ایک خون کی بوند۔ ان کا دل مضغہء گوشت نہیں سوز عشق کا آتش کدہ ہے'' فارسی ادب کے مطالعہ نے خواجہ احمد فاروقی کے کلاسیکی ذوق کو نکھار دیا ہے۔

احتشام حسین (1912 تا 1972)

احتشام حسین ایک ایسے بلند مرتبہ دانشور اور نقاد تھے جو زندگی بھر ادبی حسن کی دریافت

اور حسن و کمال کی جستجو میں ایک دیر یاب منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ احتشام حسین شاعر بھی تھے اور افسانہ نویس بھی۔ انھوں نے سفر نامے لکھے اور ترجمہ کے فن پر عبور کا ثبوت دیا۔ علم لسانیات میں مفید اضافے بھی کیے لیکن ان کو اصلاً ایک بڑے تنقید نگار کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ ان کا وطن اعظم گڑھ تھا۔ ہائی اسکول انھوں نے اپنے وطن میں پاس کیا۔ پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ 1936 میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے پھر ریڈر ہوئے۔ پھر بعد میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر منتخب ہوئے اور صدر شعبہء اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انھوں ادب کی دنیا میں پہلے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے قدم رکھا اور 1944 میں ''ویرانے'' کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے تنقیدی مضامین پے در پے شائع ہوئے ''تنقیدی جائزے'' ''روایت اور بغاوت'' ''ادب اور سماج'' ''تنقید اور عملی تنقید'' ''ذوق ادب اور شعور'' ''عکس اور آئینے'' اور ''اعتبار نظر'' ان کی گرانقدر تصانیف ہیں، انھوں نے اردو تنقید کو ایک نئے افق سے روشناس کیا۔ ''ساحل اور سمندر'' ان کا دل چسپ اور معلوماتی سفر نامہ ہے۔ انھوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے شائع کیا اور علم لسانیات میں اضافہ کیا۔ انھوں نے کلام جوش کا انتخاب بھی شائع کیا اور ''آب حیات'' کی تلخیص بھی کی۔ ''اندھیری راتیں'' احتشام حسین کے ڈراموں کا مجموعہ ہے اور ''سلک گہر'' نظموں کا انتخاب ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تنقیدی تاریخ بھی لکھی ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے وہ اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو تنقید کو وزن اور وقار عطا کیا۔ احتشام حسین کے تنقیدی تصورات میں مارکسی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن انھوں نے قدیم ادبی سرمایہ سے محبت اور اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ وہ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کے قائل نہیں ہیں۔ احتشام حسین کی تنقیدیں ایک طرف سماجی علوم سے مربوط ہیں تو دوسری طرف اپنے دور کی جمالیات سے بھی ان کا رشتہ استوار نظر آتا ہے۔ احتشام حسین کا انداز نظر اور اسلوب بیان علمی رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے اس لیے کبھی کبھی بعض اہل ادب ان کی تحریروں میں خشکی اور بے کیفی محسوس کرتے ہیں۔ دراصل احتشام حسین مصنوعی نگینوں سے آب و تاب حاصل نہیں کرتے ہیں اور مرصع سازی اور مینا کاری سے گریز کرتے ہیں۔ وہ مارکسی تنقید سے وابستہ

رہے۔لیکن ان کی تحریریں ان کی ذہنی بالیدگی اور رچے ہوئے تنقیدی شعور کی آئینہ دار ہیں۔

آل احمد سرور (1921 تا 2002)

آل احمد سرور نے تنقید کے علاوہ ایک دانشور کی حیثیت سے اور ایک صاحب اسلوب ادیب کی حیثیت سے اور ایک دیدہ ور مصنف کی حیثیت سے اپنا مقام بنالیا ہے اور اردو زبان و ادب کو ان کی تحریروں سے بصیرت اور گہرائی و گیرائی ملی ہے۔انھوں نے تنقید کے نظریہ کو بھی حرارت اور توانائی عطا کی ہے۔حسن کی تلاش اور ہر رنگ میں بہار کے اثبات نے ان کی تحریروں کو دل کشی اور جاذبیت عطا کی ہے۔انھوں نے حسن سے مضبوط پیمانہ وفا باندھا ہے اور یہی ان کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔انھوں نے اپنی ادبیت۔شگفتگی اور سحر آفرینی سے اردو کے نثر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔بلاشبہ وہ ان ممتاز مصنفین میں ہیں جن کے اسلوب بیان اور انداز نگارش پر اردو نثر ناز کرسکتی ہے۔بدایوں ان کا وطن تھا۔پیدائش پیلی بھیت میں ہوئی تھی۔بدایوں کے بعد گونڈا میں انھوں نے تعلیم حاصل کی اور پھر آگرہ کے کالج میں داخلہ لیا۔پھر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے۔وہاں سے انھوں نے انگریزی میں اور اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور وہیں شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے۔پھر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں ریڈر مقرر ہوئے۔پھر دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے اور پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔وہ شکاگو میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر ہوئے۔وہ ادب میں کسی مخصوص نظریہ کے پابند نہیں رہے لیکن وہ ہر تحریک کے صالح اور صحت مند رجحانات کو اخذ کرنے کے قائل رہے۔ان کی دانست میں ادب کی پہلی اور آخری شرط ادبیت ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں بعد میں کچھ اور۔وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں اور نہ اشتراکیت کا پرچار۔ان کا کہنا ہے کہ جدید دور میں فن کو تہذیبی تنقید کا فرض انجام دینا چاہیے۔ان کا خیال ہے کہ اگر نقاد صرف اخلاقی پہلوؤں کو دیکھتا ہے یا صرف افکار پر توجہ کرتا ہے اور فن کے جادو اور حسن کا راز معلوم نہیں کرتا ہے تو وہ اپنے منصب کو نہیں پہچانتا ہے۔ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قدیم اور جدید تصورات کے تصادم کے اس دور میں ادبی توازن کو برقرار رکھا ہے۔وہ ان لوگوں کے بھی مخالف ہیں جو ماضی سے رشتہ منقطع کرنا چاہتے ہیں۔وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ادب سے اس کا ماضی چھین لیا جائے تو وہ ایک کٹی ہوئی

پتنگ کی طرح بے سمتی کا شکار ہو جائے گا۔ آل احمد سرور ترقی پسندی کے عروج کے زمانہ میں بھی زیادہ ترقی پسند نہ ہو سکے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ وہ اپنی تنقید کے تیشہ سے بت شکنی سے زیادہ بت تراشی کا کام لیتے ہیں۔ وہ تنقید سے ادب کو سڈول۔ خوبصورت۔ متناسب اور جاذب نظر بنانا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کا ایقان ہے کہ اچھی تنقید ادب کی طرف مائل کرتی ہے اور وہ خود تخلیقی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کم تر نہیں ہوتی۔ بلکہ خود تخلیق ہو جاتی ہے۔

آل احمد سرور نے مغربی ادب اور مغربی تنقید کا گہرا مطالعہ کیا لیکن مغربی تنقید کو اردو ادب پر مسلط نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے اردو تنقید کو نیا ذہن۔ نئی فکر۔ نئی جہت اور نیا اسلوب عطا کیا ہے۔ ان کی بہت ساری تصنیفات ہیں ''تنقیدی اشارے'' ''تنقید کیا ہے'' ''نئے اور پرانے چراغ'' ''ادب اور نظریہ'' ''عکس غالب'' ''عرفان غالب'' ''جدیدیت اور ادب'' ''تنقید کے بنیادی مسائل'' اور ''مسرت سے بصیرت تک'' وغیرہ۔ ان کتابوں سے ان کے تنقیدی مسلک اور ادبی نظریہ کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ میر غالب اور اقبال کے ساتھ انگریزی شعرا سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی آل احمد سرور ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ عبارتوں کو دل فریبی اور رعنائی عطا کرنے میں بہت کم ہم عصران کی سطح کو پہنچ سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی (1894 تا 1977)

رشید احمد صدیقی اس عہد کے صاحب اسلوب ادیب اور بذلہ سنج مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں سنجیدہ مزاح اور گلکاری اور سحر آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم جون پور میں ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے کیا اور وہیں اردو کے لکچرر۔ ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو پدم شری کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ ان کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات'' ''مضامین رشید'' ''خنداں'' ''گنج ہائے گراں مایہ'' ''آشفتہ بیانی میری'' ''جدید غزل'' ''ذاکر صاحب'' ''سہیل کی سرگزشت'' اور ''ہم نفسان رفتہ'' اہم اور مشہور کتابیں ہیں۔ وہ علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر رہے۔ نیا دور اور ادیب اور معارف میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔

رشید احمد صدیقی اردو کے ایک بلند پایہ ادیب ۔مزاح نگار اور خاکہ نگار ہیں ۔خاکہ نگاری میں ان کی دو کتابیں ''ہم نفسان رفتہ'' اور ''گنج ہائے گراں مایہ'' ہیں۔جس شخص کو رشید احمد صدیقی کا اسلوب دیکھنا ہو اور مشہور شخصیات کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو جاننا ہو اس کو یہ دونوں کتابیں خاص طور پر پڑھنی چاہیے ۔ان کی ادبیت اور معنی خیزی اور فلسفہ آمیزی اور مزاح انگیزی سے لبریز اسلوب دیکھنا ہو تو اسے ان کی دوسری کتابوں کے ساتھ ان دو کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے ۔علی گڑھ سے ان کو والہانہ لگاؤ ہے ۔اس تعلیمی ادارہ سے ان کی شیفتگی کا اظہار قدم قدم پر ہوتا ہے اور ان کی کتاب ''ذاکر صاحب'' سے ذاکر حسین صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کے ساتھ ساتھ ان سے رشید احمد صدیقی کی عقیدت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی شگفتگی ۔خندہ آفرینی اور تبسم ریزی قاری کو مسحور کر دیتی ہے ۔ان کی مزاح نگاری بہت سنجیدہ قسم کی ہے ۔انھوں پھکڑ پن اور بے اعتدالی کو کہیں راہ نہیں دی ہے ۔مزاح نگاری میں وضع داری اور شائستگی کا جلوہ اگر کسی کو دیکھنا ہو تو اسے رشید احمد صدیقی کی تحریریں پڑھنی چاہیے ۔رشید احمد صدیقی کے جملے بڑے تراشیدہ ہوتے ہیں ۔انھیں فقرے تراشنے اور ذو معنی عبارت لکھنے میں بڑی مہارت حاصل ہے ۔وہ اپنی تحریروں میں بلاغت کی ایک خاص صنعت کا استعمال کرتے ہیں یعنی ایک ہی جگہ ایسے دو لفظوں کا استعمال جو ایک حرف سے شروع ہوتے ہیں اور صوتی موسیقیت رکھتے ہیں ۔مجموعی طور پر ان کی تمام تحریریں بہت پر لطف اور انبساط پرور ہوتی ہیں ۔گنج ہائے گراں مایہ اور ہم نفسان رفتہ مرقع کشی کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں ۔گنج ہائے گراں مایہ میں انھوں نے اس ''کندن'' کی مرقع کشی کی ہے جو یونیورسٹی میں گھنٹہ بجاتا تھا۔ بڑی شخصیتوں کا خاکہ لکھنا آسان ہوتا ہے لیکن ''کندن'' کا خاکہ لکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ رشید احمد صدیقی اپنی تحریروں میں مذہب و اخلاق کے طرفدار نظر آتے ہیں اور مذہبی شخصیتوں اور علما کے بارے میں ان کا تاثر عام طور پر مؤثر اور دل فریب ہوتا ہے۔

عبدالحلیم شرر (1860 تا 1926)

عبدالحلیم شرر اردو کے ان چند ادیبوں اور ناول نگاروں میں ہیں جنھوں نے ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی بصیرت اور دیدہ وری کی یادگاریں چھوڑیں ۔ناول نگاری ۔مضمون نویسی ۔

ڈرامہ نگاری اور شعر گوئی میں شرر نے اپنی انفرادیت کے ایسے نقوش ابھارے ہیں جو ان کے نام کو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گے۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔ یہاں انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اپنے علمی کام کا آغاز اس طرح کیا کہ واجد علی شاہ کے نام بیگمات عالیات جو خطوط بھیجا کرتی تھیں ان کی ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے شروع کیا اور پھر ادبی رنگینی کے ساتھ شہزادوں کی صحبت اور شب و روز کی محفلوں نے زبان کی اصلاح میں مدد کی۔ شرر نے دہلی میں بھی تعلیم حاصل کی اور انھوں نے 1887 میں رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا اور اس میں ان کے بعض ناول قسط وار بھی شائع ہوتے رہے۔ حیدر آباد میں بھی عبدالحلیم شرر کا قیام رہا لیکن وہ دوبارہ لکھنؤ آ گئے اور پھر یہاں سے ان کی ادبی تخلیقات کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ''دل چسپ''، ''دل کش''، ''ملک العزیز ورجینا''، ''حسن انجلینا''، ''منصور موہنا''، ''قیس ولبنیٰ''، ''یوسف و زلیخا''، ''ایام عرب''، ''فردوس بریں''، ''مقدس نازنین''، ''بدر النساء کی مصیبت''، ''شوقین ملکہ''، ''فتح اندلس''، ''ماہ ملک''، ''فلپانا''، ''بغداد''، ''رومۃ الکبریٰ''، ''حسن کا ڈاکو''، ''الفانسو''، ''خوفناک محبت''، ''فاتح مفتوح''، ''بابک خرمی''، ''جویائے حق''، ''لعبت چین''، ''عزیزہ مصر''، ''طاہرہ''، ''نیکی کا پھل''، ''مینا بازار''، ''شہزادہ ءحبش'' شامل ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے اردو میں تاریخی ناول نگاری کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے برتا اور اردو ناول نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔

ہمیں یہ نقطہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تاریخی ناول تاریخ نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ناول نگار ایک خاص عہد کے حالات اور تہذیبی اور سیاسی واردات کے تناظر میں کرداروں کو ابھارتا ہے اور واقعات کی ایک جھلک دکھاتا ہے اور ماضی کے جھروکے کھول دیتا ہے۔ اردو ادب کے آئینہ میں تاریخ کی جھلک دیکھنے اور دکھانے والوں میں سب سے پہلے عبدالحلیم شرر کا نام لیا جاتا ہے۔ تاریخی ناول نگاری کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ تاریخی ناول تاریخ نہیں ہوتے لیکن قاری ان میں تاریخی صداقتیں تلاش کر لیتا ہے۔ شرر کے تاریخی ناولوں کی تعداد 34 ہے۔ انھوں نے طبع زاد ناولوں کے علاوہ ناولوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ''منصور موہنا'' میں محمود غزنوی کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ''فلورا فلورنڈا'' میں پس منظر اسپین کی سرزمین ہے جب وہاں

عبدالرحمٰن ثانی کی حکومت تھی۔عیسائیوں اور مسلمانوں کے انداز فکر اور معتقدات کا ٹکراؤ اس ناول کی اساس بن گیا ہے۔''ایام عرب'' دو حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے زمانہ قصہ کا آغاز بازار عکاظ سے ہوتا ہے۔ایام عرب کا موضوع طلوع اسلام سے قبل کا عربی ماحول ہے۔عربوں کے طور طریق ۔جہالت ۔مہمان نوازی اور ان کے طرز رہائش اور انداز فکر کی اس ناول میں بڑی مؤثر عکاسی کی گئی ہے۔''فردوس بریں'' عبدالحلیم شرر کا ایک اچھا اور فنی اعتبار سے قابل توجہ ناول ہے۔اس کے قصہ کا تعلق فرقہ ء باطنیہ سے ہے۔اس ناول کے ہیرو ''حسن'' اور اس کی ہیروئن ''زمرد'' ہے۔ فرقہ ء باطنیہ کا بانی حسن بن صباح تھا۔فردوس بریں میں شرر نے فرقہ ء باطنیہ کی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔یہ ناول خاصا دل چسپ ہے۔عبدالحلیم شرر کے معاشرتی ناول بھی ہیں جیسے ''دل چسپ'' اور ''دل کش'' اور ''بدر النساء کی مصیبت'' ان ناولوں میں شرر نے اپنے عہد کی معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کیا ہے۔ان ناولوں میں عبدالحلیم شرر ایک مصلح کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ شرر کے مضامین کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔شرر کے اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو ان کی عبارت آرائی اور پر لطف اور شگفتہ نثر ہے۔ان کے مضامین ''بزم قدرت'' ''چاندنی رات'' ''غرور حسن'' ''خیال یار'' ''بوئے وفا'' ''تیر نظر'' اور ''صبح چمن'' شرر کی رنگین اور شگفتہ انشا پردازی کے حسین نمونے ہیں۔ شرر نے آخری دور میں سوانح عمریاں اور تاریخ کے موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ''خواجہ معین الدین چشتی'' ''تاریخ یہود'' ''ابوالحسن'' اور ''تاریخ خلافت'' بہت مشہور و مقبول ہیں۔

عزیز احمد (1914 تا 1978)

ہندوستان میں بیسویں صدی کی پانچویں دہائی تک اردو ناول کی تاریخ میں جو سب سے اہم اور معتبر نام ہے وہ عزیز احمد کا ہے۔عزیز احمد ایک مفکر۔ایک دانشور اور ایک ادیب تھے۔ افکار کی دنیا میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور جو تحریکیں اٹھی تھیں ان سے وہ پورے طور پر باخبر تھے۔ اقبال پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں ان کتابوں میں جو چند نام بہت زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں ان میں عزیز احمد کی کتاب ''اقبال اور نئی تشکیل'' ہے۔فکشن کی دنیا میں ایک بہت بڑے دانشور کی حیثیت سے عزیز احمد نے قدم رکھا۔ان کی ادبی صلاحیتیں ان کے ناولوں میں بروئے کار آئی ہیں۔

ان کے اندر کردار نگاری۔ فضا آفرینی اور جزئیات کی پیش کشی کا اچھا سلیقہ ہے۔ ان کا اصل وطن تو بارہ بنکی اتر پردیش تھا لیکن ان کے والد بشیر احمد وکالت سے وابستہ ہو گئے تھے اور سرزمین حیدر آباد کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ عزیز احمد نے تعلیم کی ابتدائی منزلیں حیدر آباد میں طے کیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے کیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن روانہ ہو گئے۔ وہ 1938 میں لندن سے حیدر آباد واپس آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہء انگریزی میں ریڈر مقرر ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد عزیز احمد پاکستان چلے گئے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

عزیز احمد نے ایک کامیاب ناول نگار کی حیثیت سے ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ انھوں نے اردو ناول کی سمت اور رفتار کو نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔ عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی''، ''گریز''، ''آگ'' اور ''شبنم'' نے اردو فکشن میں ان کا تشخص قائم کیا ہے۔ عزیز احمد نے روایتی انداز سے انحراف کیا ہے اور مواد۔ ہیئت اور اسلوب میں جدت اور ندرت کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مطالعہ اور ان کا مشاہدہ دونوں وسیع تھا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں حقیقی زندگی کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ ان کی عصری حسیت ان کے ناولوں اور افسانوں میں تہذیبی شعور کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا ایک ناول ''ہوس'' ہے جو پردہ کی مخالفت میں لکھا گیا ہے لیکن اس طرح سے کہ فن پر مقصدیت کو غالب آنے نہیں دیا گیا ہے۔ ہوس عزیز احمد کا شاہکار ناول تو نہیں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ہوس اور ان کے دوسرے ناول ''مرمر'' اور ''خون'' کے بارے میں عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ اس دور کے ناول ہیں جب اعصاب پر جنسی ہیجان غالب رہتا ہے۔ عزیز احمد میں جذبات نگاری کا سلیقہ موجود ہے۔ ان کا ایک ناول ''گریز'' بھی ہے۔ بعض نقادوں کو اس ناول میں شعور کی رو کی جھلک نظر آتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک میں ''گریز'' کو سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' کی ارتقائی شکل سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن وہ عزیز احمد کی عریاں نگاری کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس ناول سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عزیز احمد کو ناول کی تکنیک پر عبور حاصل ہے۔ عزیز احمد کا ناول ''آگ'' کشمیری زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور اس ناول میں ہندوستانی سیاست کے نشیب و فراز اور اس کی اہم تبدیلیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ آگ میں تین نسلوں کی کہانی

بیان کی گئی ہے۔عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا پس منظر حیدرآباد ہے جہاں عزیز احمد کی زندگی کا قابل لحاظ حصہ گزرا۔حیدرآباد کی تہذیب اور اس کے خدوخال کو ناول نگار نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ناول کے پس منظر میں ابھارا ہے۔اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس میں کرداروں کی کثرت بھی ہے۔

عزیز احمد کے ناولٹ میں ''تیری دلبری کا بھرم'' ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' قابل ذکر ہے۔''بیکار دن اور بیکار راتیں'' ''اور رقص ناتمام'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ حیدرآبادی طرز تکلم اور بول چال کے نمونے عزیز احمد کی تحریروں میں محفوظ ہوگئے ہیں۔''تصور شیخ'' ''باغبان'' ''کٹھ پتلیاں'' اور ''رومۃ الکبریٰ کی ایک شام'' کا عزیز احمد کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔عزیز احمد شاعر بھی ہیں۔نقاد بھی ہیں۔ان کی ایک کتاب ''ترقی پسند ادب'' ہے۔پھر ان کی ایک دوسری کتاب ''اقبال اور پاکستانی ادب'' ہے۔ان کی کتاب ''اقبال نئی تشکیل'' کا شمار اقبالیات کے موضوع پر اہم کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

قرۃ العین حیدر (1928 تا 1999)

اردو کی منفرد مصنفہ۔دانشور۔افسانہ نگار۔ناول نگار قرۃ العین حیدر نے اپنے تجربات ومشاہدات اور اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری کے وسیلہ سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔قرۃ العین حیدر کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی۔ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو کے مشہور انشائیہ نگار اور افسانہ نویس تھے۔''کار جہاں دراز ہے'' میں قرۃ العین حیدر نے اپنے آباء واجداد اور خاندان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر سجاد حیدر رسالہ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' وغیرہ میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔قرۃ العین حیدر نے دہرہ دون میں کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ کے کالج میں داخلہ لیا اور 1947 میں انگریزی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔تقسیم ملک کے بعد وہ کچھ عرصہ پاکستان میں مقیم رہیں۔لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہندوستان واپس آگئیں۔انھوں نے انگریزی صحافت میں کام کیا اور السٹریٹیڈ ویکلی کی مدیر معاون رہیں۔وہ شعبہء اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ویزیٹنگ پروفیسر رہیں۔ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''ستاروں سے آگے'' ''شیشے کے گھر'' ''پت جھڑ کی آواز'' ''روشنی کی

رفتار''، ''جگنوؤں کی دنیا'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ناولوں میں ''میرے بھی صنم خانے'' ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''دل ربا''، ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ'' مشہور ہیں۔ ان کے رپورتاژ میں ''ستمبر کا چاند''، ''کوہ ودمان''، ''گل گشت'' اور ''خضر سوچتا ہے'' معروف ہیں۔ تراجم میں ''ہمیں چراغ ہمیں پروانے''، ''آدمی کا مقدر''، ''کلیسا میں قتل''، ''تلاش'' وغیرہ قابل قدر ادبی کاوشیں ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کتابیں تصنیف کیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' سے لے کر ''چاندنی بیگم'' اور ''گردش رنگ چمن'' میں وقت کی گریز اں نوعیت کا احساس ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں وقت کی لہروں اور انسانی حافظہ کی نقش گری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے رجحان نے تقویت پائی ہے۔ اردو فکشن میں اس کی سب سے اچھی مثال ''آگ کا دریا'' ہے جس میں شعور کی رو کی کارفرمائی سے ایک نئی تکنیک معرض وجود آئی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے وقت اور انسانی وجود کی اس میں شرکت زندگی کے انجام یعنی موت اور نسل انسانی کی مسلسل بقا کو آگ کا دریا کا مرکز اور محور بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ندی نے وقت کے استعارہ کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ وقت کا فلسفہ قرۃ العین حیدر کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع ہے۔

شعور کی رو نفسیات کی ایک اصطلاح ہے جسے ولیم جیمس نے وضع کیا تھا اور تراشا تھا۔ آگ کا دریا میں کہانی کا آغاز ڈھائی ہزار سال قبل کی ہندوستانی تہذیب سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں کی آمد ہوتی ہے پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط ہوتا ہے۔ پھر یورپ کی تہذیبی بالا دستی آتی ہے۔ پھر ملک کی تقسیم کا زمانہ آتا ہے۔ اس پورے تاریخی دور کی تہذیبی عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔ یہ تاریخ نہیں ہے لیکن تاریخ کے پس منظر میں کرداروں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ایک سوانحی ناول بھی ہے جس کا نام ہے ''کار جہاں دراز ہے'' اس میں کوئی منظّم پلاٹ نہیں ہے۔ تاریخی اور تہذیبی تناظر میں بلیغ انداز میں واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ کار جہاں دراز ہے نہ تو پورے طور پر سوانح ہے اور نہ پورے طور پر تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان میں آنکھ مچولی ہے۔ قرۃ العین حیدر کو ادب کی دین یہ ہے کہ ان کا اسلوب علامتی طرز بیان رکھتا ہے۔ ان کی تخلیقات کے نام بھی علامتی ہیں۔ ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''

''شیشے کے گھر'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' ''آگ کا دریا'' اور ''گردش رنگ چمن'' علامتی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب کا ایک وصف وہ منظر کشی بھی ہے جو واقعات و تجربات کے پس منظر کا کام دیتی ہے اور اس میں ایمائیت کا عنصر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں رمزیت۔ ایمائیت اور علامتی طرز خاص طور پر نمایاں ہے اور یہ ان کے اسلوب بیان کی خصوصیت ہے۔

نسیم حجازی (1914 تا 1996)

نسیم حجازی جن کا اصل نام محمد شریف ہے۔ 19/مئی 1914 کو سوجان پور نزد دھاریوال۔ ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری محمد ابراہیم محکمہ آب پاشی میں ملازمت کرتے تھے۔ آبا و اجداد کی ذات آرائیں تھیں جس کی بابت تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کے ساتھ آنے والے افراد میں آرائیں بھی شامل تھے جن کا حسب و نسب شہید احد حضرت یسار الراعی اور حضرت اسلم اسود الراعی سے جا کر ملتا ہے اور اسی مناسبت سے نسیم حجازی نے اپنے عربی کے استاد غلام مصطفیٰ کے مشورے سے اپنا قلمی نام نسیم حجازی اختیار کیا اور بعد میں اسی نام سے ان کی شہرت ہوئی۔

نسیم حجازی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے کچھ فاصلے پر حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم مشن ہائی اسکول دھاریوال ضلع گورداس پور سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان 1932 میں پاس کیا۔ بعد ازاں 1938 میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اسی دوران لکھنے لکھانے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ اپنا پہلا افسانہ ''شودر'' تحریر کیا جو ماہنامہ ''حکایت الاسلام'' میں جنوری 1936 میں شائع ہوا۔ اگلے ماہ کے شمارے میں ان کا ایک اور افسانہ ''جستجو'' شائع ہوا۔ انھوں نے اپنے ان دونوں افسانوں میں ہندو معاشرے میں عدم مساوات کے قضیہ کو اجاگر کیا۔ جہاں ایک جیسا جسم رکھنے کے باوجود ذات پات کی بنیاد۔ انسانوں کو اونچی نیچی ذات میں تقسیم کرتی ہے۔ ہندو معاشرے میں پائی جانے والی اس غیر خدائی تقسیم کا انھیں اتنا کرب تھا کہ انھوں نے اسی موضوع پر اپنا ایک اور افسانہ ''انسان اور دیوتا'' کے نام سے سپرد قلم کیا۔ نسیم حجازی نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ تحریک پاکستان کی تائید میں انھوں نے کئی پرزور مقالات سپرد

قلم کیے جس کی وجہ سے انھیں بہت سی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا اور بہت سی تلخ حقیقتوں اور تجربات سے وہ گزرے جس کو انھوں نے اپنے دو ناولوں ''پردیسی درخت'' اور ''گم شدہ قافلے'' میں فن کی باریکی اور رنگینی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبا ان دونوں ناولوں کو ان کی زندگی کے ترجمان قرار دیتے ہیں۔ نسیم حجازی کی شہرت ایک تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مسلم ہے لیکن ان کی عملی زندگی کا آغاز بہ حیثیت صحافی ہوا۔ وہ ابتدا میں کراچی کے روز نامہ ''حیات'' سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد 1934 سے 1948 تک ہفت روزہ ''تنظیم'' جو کوئٹہ سے شائع ہوتا تھا اس سے منسلک رہے۔ اسی دوران راولپنڈی سے شائع ہونے والا روزنامہ ''تعمیر'' میں بھی 1940 سے 1952 تک ان کے قلم سے نکلی ہوئی تحریریں شامل اشاعت رہیں۔ صحافت کے میدان میں ان کا اصل کام اخبار روز نامہ ''کوہستان'' کے حوالے سے یاد رکھنے کے قابل ہے۔ انھوں نے کوہستان کے اڈیٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ یہ اخبار بہ یک وقت راولپنڈی۔ لاہور اور ملتان سے شائع ہوتا رہا۔ مگر یہاں بھی انھیں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ 1966 میں مجبوراً اس اخبار سے علاحدہ ہو گئے۔

تاریخی ناول نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اس میں ماضی کے واقعات۔ تاریخی کردار اپنے حقیقی روپ میں زمانی تصرف کے بغیر لیکن تخیل کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ ناول نگار کو تاریخ میں کسی طرح کے تصرف کے بغیر فن کے لوازمات کو برتتے ہوئے اپنے مقصد کو خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ انھیں خوبیوں کے ساتھ اگر نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا جائزہ لیں تو وہ ہمیں ایک کامیاب قلم کار کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ نسیم حجازی نے اوائل عمری ہی میں علامہ شبلی نعمانی کی الفاروق کا مطالعہ کیا تھا جس کی بدولت تاریخ اور تاریخی حقائق سے ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ جس کے بعد انھوں نے ادب کے تقریباً تمام بڑے ناول نگاروں کی کاوشوں کا عمیق مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیشروؤں کی خامیوں کو بغور محسوس کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے ان اغلاط سے دامن بچایا۔ علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے افکار کا بھی ان پر کافی اثر پایا جاتا ہے۔ موضوعات کا بہتر انتخاب اور قلم پر ان کی گرفت قارئین کے ایک بڑے حلقے میں ان کی پذیرائی کا باعث بنی۔ نصف صدی تک اپنے قلم کے سحر سے قارئین کو

مسحور رکھنے والے اس ناول نگار نے بہت سے ناول یادگار چھوڑے ہیں۔ ''محمد بن قاسم''۔ ''خاک اور خون''۔ ''آخری چٹان''۔ ''شاہین''۔ ''آخری معرکہ''۔ ''قافلہ حجاز''۔ ''داستان مجاہد''۔ ''انسان اور دیوتا''۔ ''قیصر و کسریٰ''۔ ''اور تلوار ٹوٹ گئی''۔ ''اندھیری رات کے مسافر''۔ ''یوسف بن تاشفین''۔ ''معظم علی''۔ ''کلیسا اور آگ''۔ ''گم شدہ قافلہ''۔ ''پورس کے ہاتھی'' اور ''پردیسی درخت'' ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے قلم کی کاوشوں میں ''ثقافت کی تلاش''۔ ''سفید جزیرہ''۔ ''سو سال بعد''۔ ''پاکستان سے دیار حرم تک'' نام بھی شامل ہیں۔

''داستان مجاہد'' میں تاریخ اسلام کی پہلی صدی کے ربع آخر سے دوسری صدی ہجری کے ابتدائی عہد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تاریخ اسلام کے اہم کردار عبدالملک بن مروان۔ حجاج بن یوسف۔ قتیبہ بن مسلم۔ موسیٰ بن نصیر۔ طارق بن زیاد اور سلیمان بن عبدالملک اس میں شامل ہیں۔ ان کے ناول ''محمد بن قاسم'' جو اپنے نام ہی سے مضمون کا احاطہ کرتا ہے اس میں محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد اور یہاں ان کی فتوحات کا اور ان کے ساتھ یہاں کے باشندوں کے والہانہ لگاؤ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ''آخری چٹان'' میں تاریخی کردار کے طور پر چنگیز خان۔ ہلاکو خان اور جلال الدین خوارزشاہ کو ایک دوسرے سے نبرد آزما دکھایا گیا ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے یہ عہد آخری خلیفہ عباسی کا ہے جب اہل بغداد مناظرے بازی اور غیر اسلامی رسومات میں گھر چکے تھے اور ان میں اتحاد کا فقدان تھا۔ ''انسان اور دیوتا'' میں ہندو معاشرے کی تاریخی اور معاشرتی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس ناول میں ہندو دھرم کے نام پر ذات پات کا نظام اور اچھوتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ''شاہین'' غرناطہ مسلمانوں سے چھن جانے کی داستان کا الم ناک باب ہے۔ ''خاک اور خون'' تقسیم ہند کے موقع سے وقوع پذیر ہوئے فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا ناول ہے لیکن اس کے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے سے تعلق رکھنے والے ناولوں میں ''آخری معرکہ''۔ ''معظم علی'' اور ''تلوار ٹوٹ گئی'' قابل ذکر ہیں۔ ''آخری معرکہ'' میں ہندوستان میں محمود غزنوی کی فتوحات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''معظم علی'' میں ہندوستان کے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے تاریخی واقعات خوبصورت پیرائے میں مرقوم ہیں۔ ''اور تلوار ٹوٹ گئی میں'' ٹیپو سلطان کی دلیری اور شجاعت کے ساتھ ساتھ ان سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے

جو ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے خاتمے اور انگریزوں کی پروردہ حکومتوں کے قیام کا باعث بنیں۔

نسیم حجازی کا مقصد ابتدا سے آخر تک اسلام کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ناولوں میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کو خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا منصب پھر سے حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی انھیں اردو کا بہترین ناول نگار قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

> ''انھوں نے اسلام کی عظمت رفتہ کو اپنے قلمی جہاد سے معاشرے کے عام انسان کے شعور کا حصہ ایسی سحر انگیزی کے ساتھ بنایا ہے کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد دوسرا ناول نگار اس سطح پر نظر نہیں آتا''۔

نعیم صدیقی (1961 تا 2002)

جناب نعیم صدیقی ماہنامہ سیارہ پاکستان کے ایڈیٹر تھے۔ وہ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور اسی کے ساتھ بہت بڑے ادیب نثر نگار اور صحافی بھی تھے۔ وہ اردو ادب کی تمام اصناف پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری صحافت ہو یا تنقید یا تحقیق ہر میدان میں انھوں نے اپنی فتوحات کے جھنڈے بلند کیے۔ جب وہ شعر کہنے پے آتے تو ایسا لگتا کہ وہ صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کے نصف درجن شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک مجموعے کا نام ہے ''شعلۂ خیال'' اور دوسرے مجموعے کا نام ہے ''بارود اور ایمان''۔ انھوں نے نعتیں بھی لکھی ہیں اور ان کا پورا مجموعۂ کلام بہت با مقصد ہے۔ نعیم صدیقی کا دل جذبۂ عشق رسول سے معمور تھا، اس کا اظہار ان کے کلام ''نور کی ندیاں رواں'' کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ نعیم صدیقی کے یہاں وفور جذبات کے باوجود اعتدال پایا جاتا ہے۔ نثر میں سیرت کے موضوع پر ان کی تصنیف ''محسن انسانیت'' اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے اور حسن زبان و بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ نعیم صدیقی نے افسانوی اور شعری مجموعوں کے علاوہ دیگر تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں، تحریکی شعور، حق و باطل، بنیاد پرستی، سید انسانیت۔ ان کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کتابچے ہیں جو عصری مسائل میں ہماری رہنمائی

کرتے ہیں۔ جیسے ہمہ زندگی، بنیاد پرستی، تحریکی کام کا خاکہ، تعمیر سیرت کے لوازم، کمیونیزم یا اسلام، ہندوستان کے فسادات اور ان کا علاج، اپنی اصلاح آپ، پاکستان کے مشہور ادیب و ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''جناب نعیم صدیقی کا تعلق ہمارے ان مشاہیر اہل قلم سے ہے جن کی تحریروں میں حیران کن تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن ان حیران کن تنوع میں ہر جگہ فکر و فرہنگ کی ایک مرکزی رو دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی ادبی تحریریں ایمان و ایقان سے رنگ و آہنگ حاصل کرتی ہیں۔ ان کی ادبی اور اسلامی تحریریں ادبی محاسن کا بحرۂ وافر رکھتی ہیں''۔

نعیم صدیقی نے ملک نصر اللہ خاں عزیز کے اخبار مسلمان کے لیے کام کیا۔ پھر 1942 سے رسالہ ترجمان القرآن سے وابستہ ہوئے۔ 1948 سے 1950 تک ترجمان القرآن کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس زمانے میں مولانا مودودی جیل میں تھے۔ پھر ایک طویل عرصے تک ''چراغ راہ'' کے مدیر رہے۔ 1950 میں ہفت روزہ شہاب جاری کیا۔ اگست 1962 میں ادبی ماہنامہ سیارہ جاری کیا جو ہنوز جاری ہے۔ ان کی کچھ اور بھی معروف تصنیفات ہیں جن کا ذکر مفید ہوگا: عورت معرض کشمکش میں۔ معرکۂ دین و سیاست۔ اقبال کا شعلۂ نوا۔ معروف و منکر۔ شعلۂ خیال۔ پھر ایک کارواں لوٹا۔ ٹھنڈی آگ۔ شعاع جمال۔ ان کی بہت سی تصنیفات بہت مقبول ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت ''محسن انسانیت'' کو حاصل ہوئی۔ وہ جتنے اچھے نثر نگار تھے اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ اگر تقابلی مطالعہ کرنا ہو تو ان کی نظم ''یروشلم یروشلم'' ان سینکڑوں نظموں سے کیا جا سکتا ہے جن کا موضوع فلسطین ہے اور فیض احمد فیض جیسے شاعروں نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن نعیم صدیقی کی نظم ان سب میں ممتاز ہے۔

مولانا ماہر القادری (ولادت 30 جولائی وفات 12 مئی 1978)

بیسویں صدی میں برصغیر کے تناظر میں جن شخصیات نے علمی۔ ادبی اور فکری میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں ایک نام مولانا ماہر القادری کا بھی ہے۔ انھوں نے کچھ عرصے تک حیدرآباد میں بھی قیام کیا جہاں ان کو علمی اور ادبی فضا اور مشاہیر کی صحبت میسر آئی۔

مولانا ماہر القادری بہت بڑے نثر نگار۔ نقاد اور زبان و بیان کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ بہترین زبان اور فکر کی بلندی کے سبب علمی اور ادبی فضا پر چھا گئے۔ حیدرآباد میں رہے تو انھیں قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کی صحبت میسر رہی۔ بعد میں وہ مولانا مودودی کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصے انھوں نے بمبئی میں بھی قیام کیا اور انھوں نے بعد میں ترقی پسند تحریک کی سخت مخالفت کی اور حلقۂ فکر و نظر کی بنیاد ڈالی، اسلامی ادب کا رخ اختیار کیا۔ جس نے بعد میں منظّم ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

مولانا ماہر القادری اردو زبان کے سچے عاشق و شیدائی تھے وہ زبان کو تہذیب و ثقافت کا ایک اہم شعار تصور کرتے تھے اور وہ زبان کے سلسلہ میں کسی بھی قسم کی بے پرواہی اور کوتاہی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماہنامہ فاران میں سینکڑوں کتابوں پر نقد اور تبصرے لکھے اور نقد و تبصرہ کا اعلیٰ معیار قائم کیا، ان کو زبان اور روزمرہ پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ مشہور ادبا اور اہل قلم کی غلطیوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ وہ جتنے بڑے ادیب اور نقاد تھے۔ اتنے ہی بڑے شاعر بھی تھے۔ اردو زبان و ادب میں نعتیہ شاعری کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی ممکن نہیں کہ ماہر القادری کی مشہور زمانہ نعت اور سلام کو نظر انداز کیا جا سکے۔ جس کا مصرع یہ ہے ؎

''سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دست گیری کی''

اس مشہور زمانہ نعت و سلام کے علاوہ ناول کے انداز میں ان کی سیرت پر کتاب نا قابل فراموش ہے جس کا نام ہے ''در یتیم''۔ ''یاد رفتگان'' بھی ان کی مشہور کتاب ہے۔ ماہر القادری کے تبصروں کو دو ضخیم جلدوں میں ''ماہر القادری کے تبصرے'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے زبان و بیان کی رائج غلطیوں کے بارے میں کافی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(چالیس اردو کے ادبا اور نثر نگاروں کا تذکرہ)

مراجع باب اول و دوم

(اردو کے شعرا) دوم (اردو کے ادیب اور نثر نگار)
1. آب حیات، محمد حسین آزاد
2. تاریخ ادب اردو، سیدہ جعفر
3. اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید
4. تاریخ ادب اردو، پروفیسر نور الحسن نقوی
5. مرقع شعرا اردو، محسن حیدر آبادی۔

باب۔سوم

عربی شعرا

موضوع کا تعارف

عربی ادب کی تاریخ بہت قدیم تاریخ ہے اور اس کی ابتدا دور اسلام سے کافی پہلے سے ہوئی ہے۔ دور جاہلیت کی شاعری بھی بہت طاقتور اور فصیح و بلیغ شاعری ہے اس کا بڑا حصہ آج بھی محفوظ ہے اور پوری دنیا میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے دور جاہلیت کے مزاج اور ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں شعرا قوم کے دانشور اور نمائندہ ہوتے تھے اور ہر قبیلہ اپنے شاعر پر فخر کرتا تھا اور شاعر اپنے قبیلہ پر۔ شاعر کا کلام قبیلہ والوں کے ذریعہ دور تک اور دیر تک پھیلتا تھا اور اشعار لوگوں کے نوک زبان ہوتے تھے۔ اسلام نے آنے کے بعد عربی زبان و ادب کو ایک نیا رخ دیا اور ایک نئی تہذیب عطا کی۔ اسلام کا انقلاب ایک عظیم انقلاب تھا۔ اس کے اثرات دنیا کی تمام تہذیبوں پر پڑے۔ یورپ کی تاریکیاں اسلام کی شعاؤں سے دور ہوئیں اور یورپ میں ایک نیا انقلاب آیا اور وہ قرون مظلمہ کے دور سے نکل کر عمل و آگہی کے دور میں داخل ہوا۔ عربوں میں اس کے اثرات ایسے پڑے کہ جاہلی شعر و ادب کا رخ بدل گیا اور عربی زبان فکر و نظر کی ایک نئی دولت

سے مالا مال ہوئی۔ اسلام نے فکری حیثیت سے عربی شاعری کا رخ بدل دیا۔ جاہلی شاعر صحرا میں خیمے لگاتا تھا اور اونٹوں اور بکریوں کے درمیان زندگی گزارتا تھا۔ وہ اپنی شاعری میں پہاڑوں اور چشموں کا ذکر کرتا تھا اور میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کے قصے سناتا تھا۔ شراب پینے اور اپنی محبوباؤں سے ملنے کا ذکر کرتا تھا۔

اسلام نے آنے کے بعد عربی شاعری میں کئی طرح کی تبدیلیاں کیں۔ زبان آسان کی۔ فحش نگاری اور خمریات پر پابندی لگائی۔ اسلامی فکروں کو شاعری میں رائج کیا قبائلی تعصب کو کم کیا۔ عربی شاعری میں تبدیلی کی۔ اس کی بہتر مثال حضرت حسان بن ثابت کی شاعری ہے۔ جب اموی دور آیا تو قبائلی تصور اور عصبیت کا دور پھر لوٹ آیا۔ ہجو گوئی شروع ہوئی اور سیاسی شاعری کو رواج ملا۔ کچھ شاعر اہل بیت کے طرف دار تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی حمایت میں شاعری کرتے تھے۔ کچھ حضرت علی کے عقیدت مند تھے۔ مختلف فرقے بنوامیہ کے دور میں پیدا ہوئے اور ہر فقہ کے کچھ شاعر ہوا کرتے تھے۔ جو اپنے فرقہ کے نمائندہ ہوتے تھے۔ بنوامیہ کے دور میں غزل گوئی بھی اپنے عروج پر پہنچی گویا مدح گوئی اور ہجو گوئی اور مرثیہ نگاری اور عشقیہ شاعری کے نمونے بنوامیہ کے دور میں ملتے ہیں۔

بنوعباس کے زمانے میں بھی غزلیہ شاعری اور فحش گوئی کا سلسلہ جاری رہا اور بشار اور ابونواس جیسے شعرا پیدا ہوئے۔ پھر یونانی فلسفہ کے اثرات سے فلسفہ عربی شاعری میں داخل ہوا اور ایک نیا انداز نظر پیدا ہوا۔ متنبّی اور معری اور ابوتمام نے یونانی فلسفہ کو عربی شاعری میں داخل کیا اور عربی شاعری کو نئی وسعت عطا کی اور نئے معانی اور نئے انداز نظر عربی شاعری میں پیدا ہوئے۔ بدلتی ہوئی تہذیب ایرانی اور یونانی تہذیب کے اثرات بھی عربی شاعری پر پڑے۔ پھر عہد آخر میں 1798 میں جب نپولین کا مصر پر حملہ ہوا اور وہ تین برس مصر میں مقیم رہا۔ تو اس کے بعد بہ تدریج فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب کے اثرات عربی شعر و ادب میں داخل ہوئے اور اس طرح سے مغربی زبان و ادب اور وہاں کی ادبی تحریکات کو عربی شاعری میں اور زبان و ادب میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ عرب ملکوں سے کئی قافلے مغربی ملکوں کے شہروں میں پہنچے اور انھوں نے وہاں کے ادب سے استفادہ کیا۔ لبنان کے کچھ عربی شعرا اور ادبا امریکہ میں جا کر مقیم ہوئے اور انھوں نے

عربی زبان کوایک نیا طرز اور نیا اسلوب عطا کیا۔انھوں نے امریکہ میں عربی ادب کی جو تخلیق کی اسے مہجری ادب کہتے ہیں۔مہجری ادب کے کئی ممتاز شعرا اور ادبا ہیں۔عرب ممالک میں مغربی ادب سے متأثر ہوکر کے کئی تحریکیں اٹھیں۔جیسے :تحریک ابولو اور تحریک الدیوان۔غرض یہ کہ عربی زبان وادب کا رنگ اور آہنگ ہر زمانے میں بدلتا رہا اور اس میں اپنے اپنے زمانے کے مزاج اور معاشرے کی عکاسی ہوتی رہی۔

ہم عربی زبان وادب کی تاریخ اور شعرا کا تذکرہ صدر اسلام کی شاعری سے کریں گے۔ لیکن جاہلی دور کی شاعری کے ایک دو نمونے بھی پیش کریں گے۔جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ اسلام کا ابر کرم دنیا کے ہر خطہ میں جا کر برسا۔سب سے پہلے اس کی بارش عرب معاشرے میں ہوئی اور اس نے معاشرے میں اعلیٰ اقدار کو رائج کیا اور اسلام میں فکر ونظر کے پیمانے بدل دیے۔رنگ ونسل کے بتوں کو توڑ دیا۔خمریات کا تذکرہ موقوف ہوا۔اسی طرح سے بت پرستی اور شرک کے مضامین بھی بند ہوئے۔شاعری اسلام کی تائید میں استعمال کی گئی۔جہاد پر ابھارنے کے لیے شعر کا استعمال ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور مدح سرائی میں اشعار کہے گئے۔

امرأ القیس (۔560ء)

امرالقیس یمن کا رہنے والا تھا لیکن اس کی زندگی نجد میں گذری اسے بچپن ہی سے شعر وشاعری کا ذوق تھا۔اس کی شاعری میں الفاظ بہت پرشوکت ہوتے ہیں شعروں کی بندش بہت عمدہ ہوتی ہے خیالات میں ندرت ہے۔حسن تشبیہ بھی ہے۔محبوب کے کھنڈروں پر رونے کی رسم سب سے پہلے اس کی شاعری میں نظر آتی ہے۔اس کی شاعری میں عورتوں سے عشق کا تذکرہ بہت ہے اور وصل ووصال کے مناظر ہیں کہیں آوارگی کی لذت ہے کہیں بے حیائی کی حسرت ہے۔ راتوں کا اور میدان جنگ کا اور گھوڑوں کا تذکرہ اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔اس کی مشہور نظم ہے یا معلقہ ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل

بسقط اللوى بين الدخول فحو مل

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے دونوں ساتھیو ذرا رک جاو ہم اپنے محبوب اور اس کے جائے قیام پر

تھوڑا آنسو بہالیں۔اس طویل معلقہ میں غزلیہ اشعار بہت ہیں مثال کے طور پر یہاں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

أفاطم مهلا بعض هذا التدلل
وان كنت أزمعت صرمى فأجملى
اغرك منى أن حبك قاتلى
وأنك مهما تأمرى القلب يفعل
وما ذرفت عيناك الا لتضربى
بسهميك فى اعشار قلب مقتل

حضرت کعب بن زہیرؓ (متوفی 26ھ)

حضرت کعب کا پورا نام عقبہ بن کعب بن زہیر بن ابی اسملي مزینی ہے۔ وہ ایک شاعر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ چونکہ عربوں میں شاعری کا بہت رواج تھا اس لیے اکثر خاندان کے بہت سے افراد شاعر ہوا کرتے تھے۔ حضرت کعب بھی شاعر تھے ان کے والد بھی شاعر تھے جن کا نام زہیر تھا اور ان کے بھائی بھی شاعر تھے اور ان کے بھائی نے جن کا نام بجیر تھا۔ اسلام قبول کر لیا تھا۔ جب کعب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہجو کی تو اس وقت ان کے بھائی نے ان کو نصیحت کی تھی کہ جاؤ حضور کے پاس اور معافی مانگو اور اسلام لے آؤ۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان کی سفارش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خون معاف کر دیا اور کعب نے اسلام قبول کیا اور ایک شاندار قصیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ حضور نے خوش ہو کر اپنی چادر ان کو اڑھا دی۔ یہ چادر ان کے خاندان میں ایک قیمتی یادگار کے طور پر رہی اور پھر امیر معاویہ نے چالیس ہزار درہم دے کر یہ چادر خرید لی۔ پھر یہ چادر ایک بہت قیمتی یادگار کے طور پر خلفائے بنی امیہ کے درمیان اور پھر بنو عباس کے درمیان نسل در نسل منتقل ہوتی رہی اور پھر وہ ترکی کے خلفا کے پاس پہنچ گئی اور وہاں اس میوزیم میں موجود ہے جس میں صحابہ اکرام کے زمانے کے آثار اور تبرکات پائے جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ جو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے اور اس قصیدہ میں عربی قصائد کے انداز پر پہلے تشبیب اور پھر گریز اور

پھر مقصود کلام کا ذکر ہے۔اس کا جو پہلا شعر ہے وہ اس طرح ہے ۔

بانت سعاد فقلب الیوم مبتول
متیم أثرها لم یفدی مقبول

(داغ فرقت دے دیا اور اس کے ہجر میں آج میرا دل زخمی ہے۔اس کے چلے جانے کی وجہ سے میں محبت میں فاتر العقل ہو گیا ہوں اور میں محبت کی بیڑی میں بندھا ہوا ہوں آزاد نہیں ہوں)

قصیدہ بانت سعاد کے دوسرے اشعار کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

محبت میں میرا حال یہ ہوا کہ میرے جو تمام دوست احباب تھے۔جن سے امیدیں وابستہ تھیں وہ سب چھوڑ کر کے چلے گئے۔

ہم نے اپنے احباب کو جو ہمیں نصیحت کرتے تھے۔یہ کہا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور اللہ کے یہاں جو مقدر ہے وہ ہو کر کے رہے گا۔

محبت میں اگر موت بھی آ گئی تو کیا ہوا ہر ابن آدم خواہ وہ جتنے دن بھی زندہ رہے ایک دن دفن کے لیے اسے تابوت پر اٹھا کر لے جایا جائے گا۔

میرے مخبروں نے یہ بتایا کہ رسولؐ اللہ نے مجھے دھمکی دی ہے کہ مگر میرے نزدیک مجھے ان سے معافی کی امید زیادہ ہے۔

ٹھہرو! تم کو جس نے ہدایت دی ہے اس نے آسمان سے قرآن بھی نازل کیا ہے۔جس میں وعظ و نصیحت کی باتیں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

لات و عزّیٰ کو چھوڑ کر اگر تنہا اللہ سے لو لگاؤ تو نجات ہو جائے گی قیامت کا دن جب آئے گا تو وہاں نجات یافتہ لوگ صرف مسلمان ہوں گے۔

قصیدہ بردہ اس قصیدے کو اس لیے کہتے ہیں اسے سن کر آنحضرت ﷺ نے بردہ یعنی چادر شاعر کعب بن زہیر کو پیش کی تھی۔عربی شاعری میں فنی حیثیت سے بھی اس قصیدے کی اہمیت ہے اور اس کے زبان و بیان کی چمک دمک کا اندازہ اصل عربی قصیدے کو پڑھ کر کے ہوتا ہے۔نہ کہ اس کے ترجمے کو پڑھ کر کے۔اس میں عربی زبان کی بہترین تعبیرات ہیں اور کہیں کہیں مشکل

الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ پورے اسلامی تاریخ میں اس قصیدے کی بڑی اہمیت رہی ہے اور ہر دور میں اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔اس کے اندر شیرینی ہے اور شعر کا فن مکمل طور پر موجود ہے۔

لبید بن ربیعہ (وفات 40 ہجری)

لبید کا تعلق بنی کلاب کی ایک شاخ سے ہے جو سیادت اور شرف کے لیے مشہور ہے اس شاعر کو شروع سے اپنی خاندانی وجاہت کا اور برتری کا احساس تھا۔عنفوان شباب سے ہی اس کا امرا حیرہ کے دربار میں آنا جانا تھا۔شعر وادب کی ٹریننگ اس دربار میں اسے حاصل ہوئی۔حیرہ کے دربار میں اس کا آنا جانا تھا۔جب اسلام کا دور شروع ہوا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے شاعری ترک کردی تھی۔اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے قرآن سے گہرا تعلق قائم کیا اور ہر وقت تلاوت میں مشغول رہنے لگا تھا۔لبید کی شاعری میں فخر ومباہات کا عنصر موجود ہے۔البتہ ہجو اور مدح سے اس کا تعلق نہیں تھا اس نے خاندان کے لوگوں کے حالات اور امتیازات کا ذکر کیا ہے۔محاسن اور شجاعت کا خاص طور پر تذکرہ ہے۔جاہلی دور کی شاعری میں نامانوس الفاظ کا استعمال بھی اس نے کیا ہے،تشبیب بھی ہے اور صحرا میں اونٹوں پر سفر کا تذکرہ ہے اور پھر گریز کے بعد اپنے قبیلہ کی تعریف کا موضوع شروع ہوتا ہے۔اسلام قبول کرنے کے بعد آخرت اور مرنے کے بعد حساب و کتاب کا ذکر بھی اس کے اشعار میں موجود ہے لبید کے بعض اشعار کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

> تقویٰ کا تحفظ نیک لوگ کرتے ہیں مرنے کے بعد سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے معاملات کی ابتدا اور انتہا سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔زندگی میں کوئی بھلائی اور نیکی اب نظر نہیں آتی ہے ہر سو فریب ہے اور نفس پرستی کا دور دورہ ہے زمانہ میں وہی ہوتا ہے جو تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے اس کے آگے ''یرمرم اور تعاز'' کے پہاڑ بھی بے بس ہیں۔

لبید کے بعض اشعار حضور اکرم ﷺ کو پسند تھے اور آپ نے جن اشعار کی تعریف کی وہ اشعار یہ ہیں ۔

الا کل شیء ما خلا الله باطل وکل نعیم لا محالة زائل

وکل اناس سوف تدخل بینهم دویهیة تصفر منها الانامل

یعنی اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے اور ہر نعمت وراحت وآسائش کی عمر تھوڑی

ہے اور بنی نوع انسان کے درمیان موت داخل ہوجاتی ہے جس سے
ہاتھوں کی انگلیاں زرد پڑ جاتی ہیں۔

حضرت خنساءؓ (متوفی 34 ہجری)

اسلام کے دور جاہلیت میں بڑے ماہر اور آزمودہ کار شعرا ہوئے اور ان کا کلام عربی شعروادب کی تاریخ میں آج بھی زندہ وتابندہ ہے۔لیکن ہم نے مشاہیر شعروادب کی زمرہ بندی میں اسلامی عہد سے آغاز کیا ہے۔عہد اسلامی کی بہت ممتاز اور مشہور شاعرہ حضرت خنساءؓ تھیں۔ جو اگر چہ دور جاہلیت میں بھی اپنے کلام بلاغت نظام کے ذریعہ مشہور ہو چکی تھیں۔لیکن خلافت راشدہ اور بنوامیہ کے عہد میں ایک طویل عرصے تک وہ بقید حیات رہیں اور ایک اعلیٰ درجہ کی مرثیہ نگار کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی۔ان کے دو بھائی تھے۔ایک کا نام صخر تھا اور دوسرے کا نام معاویہ تھا اور ان دونوں کے قتل پر حضرت خنساءؓ نے بڑے جاندار اور شاندار مرثیے کہے۔جس میں ان کے غم کے جذبات نظر آتے ہیں۔چونکہ ان کو اپنے بھائیوں سے بڑی محبت تھی۔اس لیے ان کے جذبات میں جوش بھی ہے اور صداقت بھی ہے۔حضرت خنساءؓ اسلام لے آئیں اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔تو حضور نے ان سے کہا کہ تم اپنا کلام سناؤ تو حضرت خنساءؓ نے اپنا کلام پیش کیا۔ان کا ایک مشہور مرثیہ ہے جس میں انھوں نے کہا۔

عینی جودا ولا تجمدا
الا تبکیان لصخر الندي

(میری اے دونوں آنکھوں آنسوؤں کا سیل بہاؤ اور خشک نہ ہو جاؤ۔کیا تم
صخر جیسے فیاض اور سخی شخص کے لیے نہ روؤ گی)

حضرت خنساء کے چند اشعار کے اردو ترجمہ یہ ہے:

جب قوم کے لوگ عزت اور سربلندی کے لیے پیش قدمی کرتے ہیں تو وہ
بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا ہے بلکہ اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔
اور پھر وہ شخص سب سے زیادہ شرف اور عزت حاصل کرنے کے بعد ایک
حال پر نہیں رکتا بلکہ اور اونچا اٹھتا جاتا ہے۔

جو معاملات مشکل اور لاینحل ہو جاتے ہیں وہ میرے بھائی صخر کے حوالے
کر دیے جاتے ہیں تا کہ وہ اپنی ناخن تدبیر سے ہر عقدہ لاینحل کو حل کر
لے۔ اگر چہ وہ عمر میں سب سے چھوٹا ہے۔
اور جب شرف اور عزت کا کہیں ذکر کیا جائے گا تو تم پاؤ گے وہ سر سے پیر
تک شرف و عزت میں ملبوس ہے۔

حضرت خنساؓء وہ صحابیہ ہیں جنھوں نے جنگ قادسیہ کے موقع پر اپنے چار بیٹوں کی شہادت کی باری باری سے خبر سنی۔ چار بیٹوں کا شہید ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس غم سے فضا تاریک اور بادل اشک ریز ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹوں کے انتقال کی خبر سنی اور اللہ کی حمد بیان کی اور یہ کہا کہ اللہ نے مجھے شرف اور افتخار بخشا۔ پھر بیٹوں کی شہادت پر وہ صبر و ضبط سے کام لیتی رہیں۔

حضرت حسان بن ثابت (54ھ)

حضرت حسان بن ثابت انصاری ایک بڑے شاعر تھے۔ وہ عہد اسلام سے قبل تقریباً ساٹھ برس کی زندگی بسر کر چکے تھے اور کم و بیش اتنی ہی مدت اسلام کے بعد بقید حیات رہے اور شاعر اسلام اور شاعر رسول کا لقب انھوں نے حاصل کیا۔ عہد اسلام سے پہلے ان کا شمار کہنہ مشق شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ عہد جاہلی میں حیرہ اور غسان کے درباروں سے وابستہ رہے اور بادشاہوں کے لیے انھوں نے شاندار قصیدے لکھے۔ اور بڑی دولت کمائی۔ ان کے پاس سیم و زر کا انبار لگ گیا اور جب وہ اسلام لائے تو پر جوش اسلامی شاعر بن گئے۔ قریش کے شعرا کو ہجو گوئی میں بڑی مہارت تھی اور انھوں نے اس کو اسلام کی مخالفت کا ذریعہ بنایا ہے اور حضور اکرم ﷺ کے خلاف ہجویہ اشعار کہے جانے لگے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس قوم کو کیا ہو گیا ہے جو تلوار سے ہماری حفاظت کرتی ہے لیکن زبان سے ہماری مدافعت نہیں کرتی۔ یہ سن کر حسان بن ثابت کھڑے ہوئے اور بولے کہ میں اس کام کے لیے تیار ہوں حضور نے فرمایا تم قریش کی ہجو کرو اور جبریل امین کی مدد تمھیں حاصل ہوگی۔ پھر حضور نے ان سے پوچھا کہ آخر تم کیسے قریش کی ہجو کرو گے جب کہ میں بھی قریشی ہوں۔ حضرت حسان نے جواب میں یہ کہا کہ میں قریش کی ہجو

کروں گا اور میں آپ کو اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جاؤ یہ کام کرو اور ابو بکر سے بھی ملو کیونکہ وہ قریش کے نسب سے واقف ہیں اور علامہ ہیں۔ علامہ جاہلیت میں اس شخص کو کہتے تھے جو نسب کا ماہر ہو۔ چنانچہ حضرت ابو بکر کی مدد سے حضرت حسان قریش کے نسب سے اور ان کی یہ ہجو ان پر تلوار سے زیادہ گراں گذرتی۔ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ قریش کی ہجو کرنے لگے ان کے لیے مسجد نبوی میں ممبر نصب کیا جاتا تھا اور وہ اس پر بیٹھ کر قریش کی ہجو کرتے تھے اور ان کا جواب دیتے تھے اور خود حضور اکرم ﷺ حضرت حسان کی شاعری کو سنتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ بہت سے شعرا کا کلام سنا ہے اور فرمائش کر کے بھی سنا ہے۔ اگر چہ آپ شاعر بالکل نہیں تھے اور نہ یہ چیز آپ کی شایان شان تھی۔ لیکن اس سے شعری ذوق کی ہمت افزائی ضرور ہوتی ہے۔

حضرت حسان بن ثابتؓ بہت بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے تمام غزوات نبوی پر نظمیں لکھی ہیں۔ جب کبھی کوئی غزوہ ہوتا تو اس غزوہ کے بارے میں آپ کے اشعار منظر عام پر آتے اور لوگ ان کو سنتے۔ اس لیے ان کی شاعری اسلامی تاریخ کا آئینہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اسلام کی ترجمانی اور پیغمبر اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا۔ اسلامی غزوات میں ان کی لفظی شرکت ہمیشہ رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ ایک خاص قسم کی نفسیات کے آدمی تھے اور جنگ اور خونریزی سے ڈرتے تھے۔ اس لیے کبھی کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے لیکن ان کی اس لفظی شرکت کا بھی اعتراف کیا گیا اور حضور ﷺ نے ہر جنگ میں ایک مجاہد کا حصہ ان کو بھی عطا فرمایا۔

غزوہ خندق میں ایک قلعہ میں عورتوں اور بچوں کو حفاظتی خیال سے رکھا گیا تھا اور جتنے مسلمان مرد تھے وہ جنگ کے لیے خندق کی طرف چلے گئے تھے اسی قلعہ میں حضرت حسانؓ بھی تھے۔ کیونکہ جنگ کرنا اور شمشیر زنی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک یہودی قلعہ کے نیچے آ کر گشت کرنے لگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہاں لڑنے والے موجود ہیں یا نہیں۔ حضرت کی پھوپی حضرت صفیہؓ نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ دیکھو یہودی گشت کر رہا ہے۔ باہر نکلو اور اسے قتل کر دو۔ حضرت حسانؓ بولے کہ آپ جانتی ہیں کہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔ حضرت صفیہ نے تلوار اٹھائی اور باہر نکل کر اس یہودی کو قتل کر دیا اور لوٹ کر آئیں اور بولیں کہ جاؤ اور اس یہودی کے

ہتھیار وغیرہ لوٹ لو۔ حضرت حسانؓ یہ بھی نہیں کر سکے۔ ایک موقع پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے حضور ﷺ کے سامنے کچھ اشعار سنائے۔ اس میں ایک شعر کا مفہوم یہ تھا کہ دشمن ہم کو دیکھ کر اس طرح پگھل جاتا ہے جیسے نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ مسکرا دیے کیونکہ حضورؐ کو جنگ سے ان کی کنارہ کشی کا حال معلوم تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت حسان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ غالباً کسی بیماری کے سبب ان کے قلب کی یہ حالت ہوگئی تھی۔

حضرت حسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ پہلے اسلامی شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں اسلامی اصطلاحات یعنی صلوٰۃ وصوم۔ زکوٰۃ اور عقائد کا استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں اسلام کی روح پوشیدہ ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ اسلام کے مشن کی ترجمانی کی ہے۔ حضور ﷺ حضرت حسانؓ سے ان کی اسلامی شاعری کے سبب اور اسلام کے دفاع کے لیے شاعری کرنے کے سبب خاص طور پر محبت کرتے تھے اور جب بادشاہ مصر مقوقش نے حضور ﷺ کے پاس خیر سگالی کے طور پر دو لونڈیاں تحفے میں بھیجیں تو حضورؐ نے ایک حضرت حسان کو ہدیہ کر دیا۔ ان دونوں میں ایک کا نام معریہ قبطیہ جو حضور ﷺ کے پاس رہیں اور دوسری کا نام سیرین تھا۔ اس دوسری سے حضرت حسان کے یہاں حضرت عبدالرحمٰن بن حسانؓ پیدا ہوئے جو شاعر بھی تھے۔

حضرت حسان بن ثابت کی شاعری جاہلی دور کی بھی شاعری ہے اور اسلامی دور کی بھی شاعری ہے۔ وہ شاعر رسول تھے اور انھوں نے حضور ﷺ کی تعریف وتوصیف میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔ چند اشعار کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے:

> ''حضور پرنور ہیں آپ کے شانوں پر خاتم نبوت ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک شہادت ہے یہ وہ مہر نبوت ہے۔ جو چمکتی ہے اور گواہی دیتی ہے۔ اللہ نے حضور کے نام محمد کو اپنے نام سے نکالا تا کہ ان کو عظمت دے تو عرش پر جو جلوہ افروز ہے وہ محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔ ہمارے پاس عرصہ دراز کے بعد ایک پیغمبر آیا۔ جب زمین میں شرک ہو رہا تھا اور بت پوجے جا رہے تھے۔ ایسی تیرا اور تار فضا میں وہ نبی روشن چراغ بن کر کے آیا اور اس کے ذریعہ ہدایت کا دروازہ کھلا اور اندھیروں میں وہ اس طرح چمکتا ہے جیسے

ہندی تلوار چمکے اور اس نبی نے ہم کو جہنم کی آگ سے ڈرایا اور جنت کی
خوش خبری سنائی اور ہم کو دین اسلام کی تعلیم دی۔ ان سب نعمتوں پر ہم اللہ
کی تعریف کرتے ہیں۔

عمرو بن ربیعہؓ (23 تا 93ھ)

عمرو بن ربیعہ اموی دور حکومت کا بہت بڑا غزل گو شاعر ہے۔ اس کے کلام نے آسان زبان و بیان کی وجہ سے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اور پھر جس طرح آج کے زمانے میں بہت سے مطرب و مغنی شعرا کی غزلیں پڑھتے ہیں اور اس کی وجہ سے شعرا کے کلام کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے کچھ گانے والیاں تھیں جو عمرو بن ربیعہ کا کلام ترنم اور موسیقی کے ساتھ پڑھتی تھیں اور خود اس نے اپنے گھر میں دو مغنیہ کو غزلیں پڑھنے کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ عمرو بن ربیعہ کے گھر میں بغوم اور اسماء نام کی دو مغنیہ رہتی تھیں جو اس کے غزلیہ اشعار گایا کرتی تھیں اور خود عمرو بن ربیعہ نے اپنے فن کو غنائی ذوق کا تابع بنا دیا تھا۔ وہ اوزان اور بحور اور الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں مغنیوں کی سہولت کا پورا خیال رکھتا تھا۔ اس لیے اس کے اشعار کی زبان آسان ہے اور الفاظ سبک اور شیریں نظر آتے ہیں اور اس میں کہیں تصنع اور تکلف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

عمرو بن ربیعہ کی پرورش خوش حالی اور خوش جمالی کے ماحول میں ہوئی اور انگریزی محاورہ کے مطابق وہ سونے کا چمچا منہ میں لے کر پیدا ہوا۔ اس نے غزل گوئی کو اپنے فن کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ اس کا سارا کلام خواتین اور ان کے حسن کے ذکر سے لبریز ہے۔ یہاں تک کہ ایام حج میں جو عورتیں حج کے لیے آتیں اپنی غزلوں میں وہ ان کا نام لیتا اور ان کے نام سے تشبیب کرتا تھا اور عمرو بن ربیعہ کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریشی عورتیں زیور اور زینت آرائش و زیبائش اور خوشبو وغیرہ کی کس قدر دلدادہ تھیں۔ عمرو بن ربیعہ کی غزلیں ایوان غزل ہی میں نہیں بلکہ گلی کوچوں میں بھی گائی گئیں۔ اس کی شاعری پر بعض اہل فقہ نے پابندی لگانے کی بھی بات کی تھی اور یہ مطالبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں اتنا شدید ہو گیا تھا کہ انھوں نے عمرو بن ربیعہ کو حجاز سے نکلوا دیا اور اسے جلاوطن کر دیا اور یمن بھیج دیا۔

عمرو بن ربیعہ کی شاعری مؤثر شاعری ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ اس کی زبان آسان ہے اور اس کی شاعری عربی غزل کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس نے اپنی غزلوں کے ذریعہ مراسلت کا بھی کا م لیا۔ اس نے اپنی معشوقہ ثریا کو چند شعر لکھ کر کے بھیجے جن کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

> میں یہ خط اپنے دل کی روشنائی سے اور اپنے وطن سے لکھ رہا ہوں۔ یہ ایک محبت کرنے والے غمگین اور غم آشنا شخص کا خط ہے۔ یہ خط لکھنے والا غم زدہ ہے۔ غم ہے اور غم کی تنہائی ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہے۔ آتش شوق کو محبت کی آگ ہمیشہ تیز رکھتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو گردن اور جگر کے درمیان سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور حال یہ ہے کہ محبت کرنے والا اپنے دل کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھ کی اشک فشانی محسوس کر رہا ہے۔ میں اپنے شہر کا ایک عاشق زار ہوں اور تمھیں با دیدہ نم اور بصد حسرت وغم خط لکھ رہا ہوں۔

ابوالفرج اصفہانی نے اپنی کتاب اغانی میں لکھا ہے کہ اس منظوم خط کا جواب ثریا نے بھی منظوم طریقہ سے دیا تھا اور عمرو بن ربیعہ نے منظوم عشقیہ مراسلت کو سب سے پہلے ادب میں متعارف کرایا۔

اخطل (95ھ)

بنوامیہ کے دور میں جو بڑے شعرا شعروادب کے آسمان پر چھا گئے۔ ان میں جریر اور فرزدق کے ساتھ اخطل کا بھی نام ہے۔ وہ بڑا شاعر ہے اور اس نے خلفا کے دربار میں ایسی رسائی حاصل کی کہ وہ ملک الشعرا بن گیا۔ اس کا تعلق قبیلہ بنی تغلب سے تھا اور بنی تغلب عیسائیوں کا قبیلہ تھا۔ اس لیے وہ خود بھی عیسائی تھا۔ لیکن اس کو اتنی ترقی ملی کہ وہ ملک الشعرا بن گیا۔ عرب قبائل میں عصبیت بہت تھی اور اسلام نے اس پر قابو تو پایا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ عصبیت لوٹ آئی۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے عہد کے بعد فوراً عصبیتوں کی آگ پھر سے بھڑک اٹھی۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کے صاحب زادے حضرت عبدالرحمٰن بن حسان انصاریؒ شاعر تھے اور انھوں نے یزید کی بہن کی ہجو لکھی۔ تو یزید نے ایک ایسا شاعر تلاش کیا جو انصار کی ہجو کر سکے۔ چنانچہ اخطل کی شکل میں

یہ شاعر تلاش کرلیا گیا اور اس نے دربار سے مالی منفعت کے حصول کے لیے انصار کی ہجو لکھی اور اس نے انصار کی ہجو کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی بھی ہجو کر ڈالی۔ کیونکہ وہ عیسائی تھا اور یزید نے قبائلی تعصب کے جذبہ کے تحت یہ سب کچھ برداشت کرلیا۔ چنانچہ اخطل نے کہا:

قریش سب مکارم اخلاق اور عزت وسربلندی کی متاع اپنے ساتھ لے گئے اور انصار کی پگڑیوں میں ملامت کا پلندہ باقی رہ گیا۔ انصار کہتے ہیں کہ میں نہ اپنی خوشی سے رمضان کا روزہ رکھنے والا ہوں اور نہ قربانی کا گوشت کھاتا ہوں۔

اخطل عیسائی تھا اور اسلام کی شوکت وعزت کے زمانے میں بھی وہ مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس کے بچپن کا زمانہ خاندانی پریشانیوں میں گذرا تھا۔ لیکن بنوامیہ کے دربار سے وابستہ ہونے کے بعد اس کو عزت اور دولت ملی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ انصار کے خلاف اخطل کی ہجو گوئی عام ہوئی تو نعمان بن بشیرؓ اور دوسرے انصاری حضرات حضرت معاویہؓ کے پاس آئے جو خلیفہ تھے اور مطالبہ کیا کہ اخطل کی زبان کاٹ کر کے ہمیں دے دی جائے۔ لیکن حضرت معاویہ ؓ کا بیٹا یزید حائل ہوگیا اور اس نے اخطل کی مدافعت کی۔ اخطل کی ترقی شاہی دربار میں اور بھی زیادہ ہوئی جب عبدالملک بن مروان نے اپنے دور حکومت میں اخطل کو سرکاری شاعر بنالیا اور ان سے عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف ہجویہ اشعار لکھوائے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ عبدالملک بن مروان سے برسر جنگ تھے اور حضرت حسین کی طرح بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ لیکن آخر کار حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شکست ہوئی اور انھیں تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ عرب شعرا کی قدر دانی عرب معاشرے میں بہت زیادہ تھی اور ان سے قبائل کے خلاف جنگ بھڑکانے کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ قصیدہ ہو یا مرثیہ یا ہجویہ اشعار ان سے عرب بہت زیادہ متأثر ہوتے تھے اور ان قصائد کی حیثیت ایسے صحیفہ کی ہوتی تھی جو کسی کی مدح میں یا قدح میں لکھا گیا ہو۔ پھر ان قصائد کا دور دور تک چرچا ہوتا تھا اور معاشرے میں زبان زد ہوجاتا تھا۔ بچے بھی اسے سنتے اور سناتے تھے اور گانے والیاں اس کو گاتی تھیں۔ خلافت راشدہ کے بعد موسم بالکل بدل گیا تھا۔ اخطل شراب پی کر خلیفہ کے دربار میں آتا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور خلیفہ کی طرف سے اس پر زر وجواہر لٹائے جاتے۔ خاص طور پر اخطل

بادشاہ سے اتنا قریب تھا کہ بے جھجک گردن میں سونے کی صلیب لٹکائے بغیر کسی پیشگی اجازت کے دربار میں داخل ہوتا اور اس کی ڈاڑھی سے شراب کے قطرے ٹپک رہے ہوتے۔

اخطل بڑا شاعر تھا۔ اس کا کلام زبان و بیان کی غلطیوں سے پاک ہے۔ اس کی لفظی ترکیبیں۔ خوبصورت ہیں۔ الفاظ دلکش ہیں۔ اس نے طویل نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کے مدحیہ قصائد بھی ہیں اور اس نے ہجویہ شاعری بھی کی ہے اور ان سب کے ساتھ وہ امام خمریات بھی ہے۔ اس نے شراب کی تعریف میں بھی بہت سے اشعار کہے ہیں۔

بنوامیہ کے دور میں جریر اور فرزدق دو بڑے ہجو گو شاعر تھے۔ ایک دن اخطل سے کسی نے پوچھا کہ جریر اور فرزدق میں کون بڑا شاعر ہے۔ اخطل نے جواب دیا کہ جریر فرزدق سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے اس محاکمہ سے فرزدق ناراض ہو گیا اور اس نے اخطل کی ہجو لکھی اور پھر اخطل نے ہجو کا جواب دیا۔ اس طرح سے ایک ہجو کے بعد دوسری ہجو کا سلسلہ غزل اور جواب آں غزل کی طرح دراز ہوتا گیا۔ لیکن اس کی وجہ سے عربی شاعر کو فروغ ہوا۔ جس طرح اردو شاعری میں دبیر و انیس کی کشاکش سے اردو ادب کو فروغ ہوا۔

فرزدق (110ھ)

بنوامیہ کے دور میں جریر فرزدق اور اخطل تین بڑے شاعر تھے۔ ان میں سے تیسرا بڑا شاعر فرزدق ہے۔ جس نے فخریہ قصائد لکھے اور اپنے آباواجداد پر فخر کیا۔ فرزدق کی شاعری پرشکوہ تعبیرات اور الفاظ سے بھری ہوئی ہے اور اس نے اس قدر عربی محاوروں اور ترکیبوں کا استعمال کیا ہے کہ یہ کہا جانے لگا کہ: ''**لو لا الفرزدق لذهب ثلث العربية** ''یعنی اگر فرزدق نہ ہوتا تو ایک تہائی عربی کے الفاظ ضائع ہو جاتے۔

فرزدق کی شہرت اس کے ہجویہ اشعار کی وجہ سے ہے بنی کلیب کی ہجو میں اس کے یہ اشعار ملاظہ ہوں ۔

ولو ترمی بلؤم بنی کلیب
نجوم اللیل ما وضحت لسار
ولو یرمی بلومهم نهار
لدنس لومهم وضح النهار

یعنی اگر بنو کلیب کی کمینگی رات کے ستاروں کو لگ جائے تو ان کی روشنی ختم ہو جائے۔ اگر ان کی کمینگی دن کو لگ جائے تو اس کی چمک مدھم پڑ جائے۔

جس طرح سے لکھنؤ کی اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں انیس اور دبیر کا نام آتا ہے اور ان دونوں کے ماننے والے انیسی اور دبیری کہلاتے تھے۔ اسی طرح سے فرزدق کے ماننے والے اس دور میں فرزدقیہ کہلاتے تھے اور جریر کے ماننے والے جریریہ کہلاتے۔ جریر اور فرزدق کے درمیان بساط قرطاس پر گھمسان کی جنگ جاری تھی۔ قصائد پر قصائد اس طرح ڈھل رہے تھے۔ جیسے میدان جنگ میں گولہ باری کی جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ سارا معاشرہ جریر اور فرزدق کے درمیان حمایت اور مخالفت کا معاشرہ بن گیا۔ ان دونوں شاعروں کے درمیان شعری مناظرہ کا بازار ایک عرصہ تک گرم رہا۔ فرزدق اور جریر میں ایک فرق یہ تھا کہ فرزدق حضرت علی کے طرفدار تھے اور خلافت کو حضرت علیؓ کا حق تسلیم کرتے تھے اور حضرت علیؓ کی اولاد سے عقیدت اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ یہ بنی امیہ کی نظر میں بہت بڑا جرم تھا۔ لیکن چونکہ فرزدق اموی خلیفہ کی مدح میں قصائد لکھا کرتا تھا۔ اسی لیے وہ انعام بھی پاتا تھا۔ لیکن فرزدق اہل بیت کی قصیدہ خوانی سے زیادہ شاہی دربار کی تعریفیں کرتا تھا اس لیے وہ حکومت میں باریاب تھا اور ناموری سے بھی بہرہ ور ہوتا تھا۔

اموی دور کی شاعری کا مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک حج کرنے آیا تھا اور بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ کہ لوگ ہٹ جائیں تو حجر اسود کو بوسہ دے۔ اتنے میں حضرت علی زین العابدینؓ تشریف لائے ان کو دیکھتے ہی سارا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا اور انھوں نے بہت سہولت کے ساتھ حجر اسود کو بوسہ دیا۔ یہ دیکھ کر ہشام بن عبدالملک نے جو خلیفہ تھا حقارت سے پوچھا یہ کون شخص ہے جسے دیکھتے ہی حجر اسود کے پاس کی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس کا یہ سوال تجاہل عارفانہ تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ حضرت علی زین العابدینؓ ہیں۔ فرزدق کی رگ شاعری پھڑک اٹھی اور اہل بیت کی محبت کے جوش میں اس نے ایسا قصیدہ کہا کہ جو آج تک پڑھا جاتا ہے اور جس کی لے کبھی کم نہیں ہوتی ہے۔ اس قصیدے کا ایک شعر یہ ہے ؎

هذا الذی یعرف البطحاء وطأته
والبیت یعرفه والحل والحرم

یعنی یہ وہ شخص ہے کہ وادی بطحا اس کے قدم کی چاپ کو پہچانتی ہے اور بیت اللہ بھی جس سے آشنا ہے اور حل وحرم جس سے پورے طور پر واقف ہیں۔ اس قصیدے کو سن کر بادشاہ کو طیش آ گیا اور اس نے شاعر کو قید میں ڈال دیا۔ پھر چند ماہ کے بعد اس کو رہا کر دیا۔ امام زین العابدینؒ نے دینار سے بھری ہوئی تھیلی اس کو بھیجی تو فرزدق نے کہا کہ میں نے یہ قصیدہ اہل بیت کی محبت میں کہا تھا اور تھیلی واپس کر دی۔

فرزدق کی ایک چچازاد بہن تھی اور مالدار بھی تھی اور اس کا نام نوار تھا۔ فرزدق نے اس سے شادی کر لی تھی اور بعد میں اس کو طلاق بھی دے دی تھی۔ اس نے نوار پر ایک نظم بھی کہی ہے۔ فرزدق نے آخر میں اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی اور زاہدانہ زندگی گزارنے لگا تھا۔ عورتوں کی طرف اس کا میلان ضرور تھا لیکن اس کے مزاج میں مذہبیت بھی تھی اور عصر اموی کے تین بڑے شعرا میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔

جریر (110ھ)

جریر عصر اموی کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اس نے طویل عمر پائی اور عربی شاعری کے ذخیرے میں اس نے اپنی طویل نظموں سے اضافہ کیا۔ تقریباً ہر موضوع سے متعلق اس کا کلام پایا جاتا ہے۔ عربی شاعر کے موضوعات مدح۔ ہجو۔ وصف۔ فخر اور غزل ہوا کرتے تھے۔ ہر موضوع سے متعلق اس کی نظمیں ہیں۔ جریر کا تعلق بنی تمیم سے تھا۔ جریر کے ہجویہ اشعار معاشرے میں خوب پھیلتے تھے۔ ایک شخص نے جریر کی ٹوپی چھین لی۔ جریر نے اس کے خلاف دوسو اشعار کی ہجو کہی اور اسے ذلیل کیا۔ چنانچہ اس کے ہجویہ شاعری کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

فغض الطرف انک من نمیر
فلا کعباً بلغت ولا کلابا

ترجمہ: تو شرم سے اپنی آنکھ نیچے جھکا لے اس لیے کہ تو نمیر کے قبیلے سے ہے۔ تیری بساط ہی کیا ہے نہ تو تو کعب کے قبیلے تک پہنچ سکا اور نہ بنی کلاب کی ہمسری کر سکا۔

جریر فرزدق پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے:

خذوا کحلا ومجمرة وعطرا فلستم یا فرزدق بالرجال

سرمہ اور خوشبو کی انگیٹھی اور عطر سے شوق کرو کیونکہ فرزدق تم لوگ مرد نہیں ہو۔

جریر نے عبدالملک بن مروان کی شان میں ایک مشہور قصیدہ لکھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ۔

الستم خیر من رکب المطایا

واندی العالمین بطون راح

ترجمہ: جن لوگوں نے زمین پر بادشاہت کی ہے کیا تم ان میں سب سے بہتر نہیں ہو اور کیا تم سخاوت میں سارے عالم سے زیادہ سخی نہیں ہو؟

یہ قصیدہ سن کر کے عبدالملک بہت خوش ہو گیا اور بولا کہ بے شک ہم ایسے ہی ہیں اور پھر اس نے مال و دولت سے جریر کا گھر بھر دیا۔ فرزدق اور جریر کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے جریر عفت مآب تھا اور اس کی شاعری میں نرمی اور رقت تھی جبکہ فرزدق کی شاعری پتھر کی طرح سخت تھی اسی لیے ان دونوں شاعروں کے درمیان ایک ناقد نے اپنا یہ فیصلہ سنایا ہے: ''**جریر یغرف من بحر والفرزدق ینحت من صخر**''یعنی جریر سمندر سے پانی لیتا ہے اور فرزدق چٹان سے پتھر تراشتا ہے اور جریر نے اسی (80) عربی شاعروں کا مقابلہ کیا اور سب پر غالب آ گیا البتہ اخطل و فرزدق جریر کے ہم پلہ شاعر تھے جریر اور فرزدق کے ہجویہ کلام کو جنھیں نقائض بھی کہتے ہیں تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے ان قصائد سے عربی زبان اور اس کی تعبیرات اور اس کے الفاظ کو وسعت حاصل ہوئی ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں جو ماحول تھا ملوکیت کے دور کے شروع ہوتے ہی وہ ماحول ختم ہو گیا۔ اب ایک دوسرے پر بہتان تراشی عیب چینی اور تہمت دہی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ انساب پر فخر کیا جانے لگا۔ قبائلی عصبیت کی آگ بھڑک اٹھی اور فسق و فجور کا آزادانہ ماحول خاص طور پر بادشاہ اور امرا کے دربار میں پھیل گیا تھا۔ اگر چہ کہ معاشرے میں بہت سے زاہد مرتاض اور عبادت گزار اور متقی اور پاکباز لوگ بھی کم نہ تھے۔ لیکن سیاست و اقتدار کے ایوانوں میں آسمان و زمین کا فرق پیدا ہو گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ جاہلیت اسلام سے انتقام لینے پر آمادہ ہے۔

طفیلہ (59ھ)

شاعر کا پورا نام ابوملیکہ جرول بن اوس عبسی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق خاندان عبس سے تھا۔ لیکن اس کا صحیح نسب معلوم نہیں ہے۔ اس نے عزت و شرافت کی زندگی نہیں گزاری۔ اس نے مظلومی۔ حرماں نصیبی اور ذلت و خواری کے آغوش میں پرورش پائی۔ اسے اپنے گھر والوں کا تعاون بھی نہیں ملا اور نہ قوم کا سہارا۔ عربوں کی زندگی میں شاعری سب سے زیادہ مقبول چیز تھی اور جو شخص شاعر ہو جاتا تھا۔ اسے دولت حاصل کرنا آسان ہو جاتا تھا۔ چونکہ وہ کسی قبیلہ کے سردار کی تعریف کرتا تو زر و سیم سے اس کا دامن بھر دیا جاتا۔ بہت سے قبائل شاعر کے ہجو سے ڈر کر کے اس کی مالی مدد کیا کرتے تھے۔ اس لیے عرب معاشرے میں شاعری سب سے زیادہ قیمتی ہنر تھا اور اس کی حیثیت آزمودہ ہتھیار کی تھی۔ شاید ہی دنیا کے کسی معاشرے میں شاعری کو اتنی اہمیت دی گئی ہو جتنی عرب معاشرے میں اسے حاصل تھی۔ بلکہ عربوں کی قومی تاریخ کے حوالے شعر میں ملتے ہیں۔ اسی لیے مشہور محاورہ ہے ''**الشعر دیوان العرب**''۔

جہاں تک زیر تذکرہ شاعر کی بات ہے تو اسے راویوں نے بہت برا کہا ہے۔ اسے بدخلق۔ کنجوس۔ بدشکل۔ پست قد۔ بدوضع۔ بددین۔ حریص۔ بھکاری اور کمینہ تک کہا گیا ہے۔ اس کا حال یہ تھا کہ اس نے اپنی ماں اپنی بیوی اور بچوں تک کی ہجو کہہ ڈالی ہے۔ صرف شاعری اس کا ہنر تھا اور شاعری کی بدولت اس کا اثر تھا۔ لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ جب اسلام کی اشاعت ہوئی تو ہوا رخ دیکھ کر کے وہ بھی مسلمان ہو گیا اور بعد میں مرتد ہو گیا اور پھر دوبارہ غیر مستحکم عقیدے کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ اس کی زبان مسلسل لوگوں کی ہجو اور آبروریزی میں مشغول رہی۔ حضرت عمرؓ نے اسے ہجو یہ شاعری کرنے سے روکا۔ اس نے کہا کہ میں تو اسی شاعری کے ذریعہ دولت کماتا ہوں۔ لوگ مجھ سے ڈر کر میری مدد کرتے ہیں۔ اگر میں شاعری چھوڑ دوں گا تو میرے بال بچے بھوک سے مر جائیں گے۔ چنانچہ خلیفہ وقت نے اسے تین ہزار روپے دیے اور ہجو یہ اشعار نہ کہنے کی تاکید کی۔ حضرت عمرؓ کے خوف سے ان کی زندگی میں اس نے ہجو یہ اشعار نہیں کہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد اسی بے راہ روی کی روش پر وہ واپس آ گیا۔

یہ شاعر اپنے اخلاق و کردار میں خواہ کیسا ہی ہو اس کی شاعری پر زور اور خوش اسلوب

اورخوش آواز قافیہ والی ہے۔اس نے اس دور کی شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن اپنی کم ظرفی اور دور پسندی کے مزاج کی وجہ سے لوگوں میں مقبول نہ ہوسکا۔اس کے یہاں لفظی رکاکت نہیں ہے قافیہ کی پابندی پائی جاتی ہے۔وہ بہت اچھا شاعر تھا اور شعراور شاعری کے بارے میں اس کا یہ تنقیدی جملہ آج بھی کتابوں میں پایا جاتا ہے:''بہترین شاعری وہ ہے جس کو ایک سال تک چھانٹنے اور پرکھنے کے بعد پیش کیا جائے''۔

بشار بن برد(67ھ)

بشار بصرہ میں پیدا ہوا اور اس نے بنی عقیل میں پرورش پائی۔دوسرے شہروں میں اس کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا۔اس نے عربی زبان وادب کو بہت بہتر طریقہ سے حاصل کیا۔ اس کی زبان نہایت شستہ اور فصیح تھی اور غلطیوں سے پاک تھی۔تمام شعرا اور ادبا اس کی شاعری کو زبان کے اعتبار سے معتمد اور قابل سند سمجھتے ہیں۔اس نے خلفا اور امرا کی مدح لکھ کر اور ان کی شان میں قصیدے تیار کر کے اپنی عسرت کی زندگی اور مالی پریشانیوں کا علاج کیا۔اس کی شاعری اباحیت اور فحش بیانی کی شاعری ہے۔پردہ نشینوں کی عصمت وحرمت کی حفاظت کے لیے لوگوں نے اسے مار ڈالنا چاہا۔حضرت مالک بن دینار کا قول ہے کہ بشار کی شاعری سے زیادہ کوئی چیز شہر میں لوگوں کو فسق وفجور پر برانگیختہ کرنے والی نہیں ہے۔بشار کی شکایت خلیفہ وقت مہدی سے کی گئی مہدی نے اسے تنبیہ کی اور عشقیہ شاعری سے روکا۔اس نے خلیفہ کی بھی ہجو کی اور بنوامیہ کو خلیفہ عباسی کے خلاف بھڑکایا۔اس نے کہا۔

بنی امیة هبوا طال نومکم ان الخلیفة یعقوب بن داؤود
ضاعت خلافتکم یاقوم التمسوا خلیفة الله بین الزق والعود

شاعر نے بنوامیہ کو خطاب کر کے یہ کہا ہے کہ:تمھاری نیند بہت دراز ہوچکی۔خلافت کے تخت پر اب کوئی اور بیٹھ چکا ہے۔چونکہ تمھاری خلافت کا خاتمہ ہو چکا اس لیے اب اگر خلافت دوبارہ حاصل کرنی ہوتو خلیفہ کو عود ور باب کے درمیان حاصل کرو۔

بشار پیدائشی طور پر نابینا تھا لیکن اس کا تخیل بلند تھا اور اس نے ایسی خیال آرائی کی ہے جو آنکھ والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔اس کی بدصورتی کے اور اندھے پن کے باوجود اس کی شاعری عربوں میں بہت مقبول تھی اور اس کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔اس نے جملہ اصناف سخن میں طبع

آزمائی کی۔غزل اس کا خاص میدان فن تھا۔اس کی شاعری تعقید سے اور نامانوس الفاظ سے اور دیگر خامیوں سے خالی تھی۔اس میں روانی اور کشش تھی اور عشقیہ شاعری کی وجہ سے جوانوں اور آزاد مزاجوں میں وہ بے حد مقبول تھا۔وہ بہت زود گو اور بسیار گو شاعر تھا۔لیکن زمانے کے دست برد سے اس کی شاعری محفوظ نہ رہ سکی اور اس کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔اس کے یہاں بہت پر شوکت الفاظ نہیں پائے جاتے بلکہ عام فہم الفاظ پائے جاتے ہیں۔اس کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

کیا تمھیں معلوم ہے کہ محبت سے ماوراء بھی ایک کیفیت ہے اور یہ کیفیت مجھے تیری جانب مائل کرتی ہے۔جبکہ محبت کی وجہ سے ہمارے اور تمھارے درمیان دوری پیدا ہو گئی ہے۔میں خدا کی قسم تمھاری نگاہوں کے جادو کا طلبگار ہوں۔لیکن اسی کے ساتھ محبت کرنے والوں کے برے انجام سے بھی ڈرتا ہوں۔

بشار ابن برد وہ شاعر ہے جس کا تعلق ایرانی کلچر سے بہت زیادہ تھا۔وہ اندر سے باغی اور عربوں کے خلاف تھا۔اس نے ایران کے بادشاہوں کی تعریف میں قصائد لکھے۔اس نے ایک قصیدہ ابلیس کی مدح میں بھی لکھا ہے۔اس نے غزلیں بہت کہی ہیں اور نام بنام عورتوں کے ساتھ تغزل سے پرہیز نہیں کیا ہے۔چنانچہ لوگ اس کے باپ سے آکر شکایت کرتے تھے۔بشار نے اپنے باپ سے کہا جب لوگ میری غزلوں کی شکایت کریں تو آپ ان سے کہہ دیجیے''**لیس علی الأعمی حرج**''وہ نابینا ہے اور نابینا کچھ بھی کہے اس میں حرج نہیں۔۔

ابوالعتاہیہ(130 تا 211ھ)

شاعر کا پورا نام ابواسحاق اسماعیل ہے یہ کوفے میں پیدا ہوا۔پھر وہ ہجرت کر کے بغداد چلا گیا۔پیشے کے لحاظ سے وہ تاجر تھا۔خلیفہ مہدی کی ایک لونڈی عتبیہ سے اسے محبت تھی اور اسی کی وجہ سے ابوعتاہیہ کی شاعری میں شوق اور جذبہ نظر آتا ہے۔ابوالعتاہیہ ایک بڑا شاعر تھا اور بہت پر گو تھا۔عربی شاعری میں اسے بلند مقام حاصل ہے،اس کی شاعری کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں۔ایک حصہ کا تعلق دنیا سے ہے اور دوسرے حصے کا تعلق آخرت سے ہے۔اس کے کلام میں فکر آخرت کا حصہ غالب ہے اسی لیے لوگ اس کو شاعر زہد کہتے ہیں۔ایک مؤرخ کو تعجب ہوتا ہے کہ ایک شاعر

اپنے زمانے کے دوسرے شعرا سے مختلف رنگ کیسے اختیار کر لیتا ہے اور غزلوں اور ہجو یہ شاعری کے عہد میں شاعر زہد کیسے بن جاتا ہے۔ اسے خلیفۂ وقت مہدی کی جاریہ عتبہ سے عشق تھا۔ جب یہ غزلیں مہدی تک پہنچیں تو اس نے ابوالعتاہیہ کو زندان میں قید کر دیا۔ لیکن پھر وہ لوگوں کی سفارش سے قید سے آزاد ہو گیا۔ بعد میں ابوالعتاہیہ ایک زاہد محتاط بن گیا اور اس نے صوفیوں کا لباس پہن لیا۔ اس نے شراب سے اور غزل سے توبہ کی۔ ہارون رشید خلیفہ بھی اس کی زاہدانہ شاعری سے متاثر ہوا۔ وہ اپنے ایک شعر میں یہ کہتا ہے:

> بیشک ظلم باعث ملامت ہے اور گناہ کرنے والا ہی ظالم ہے۔ قیامت کے دن ہم سب بدلہ دینے والے کے سامنے پیش ہوں گے اور تمام فریقین مخالفین اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ خوب خوب جان لو کہ ہم سب فانی ہیں اور بنی آدم میں کسی کو خلود حاصل نہیں ہے اور سب کی ابتدا ان کے رب کی طرف سے ہے اور ہر آدمی اپنے رب کی طرف واپس ہونے والا ہے۔ عنقریب آدمی ایک دن ایک جسم بن جائے گا۔ جس میں روح نہ ہوگی۔ ہر زندہ شخص اپنے رب کی طرف لوٹ کر کے جانے والا ہے۔

ابوالعتاہیہ کے اشعار موت اور آخرت کے بارے میں بہت ہیں اور اس کا کلام ہمیشہ مقبول بھی رہا ہے۔ کیونکہ اس کے اشعار میں حلاوت ہے۔ غنائیت ہے آسانی ہے۔ الفاظ میں دلکشی ہے اور وہ آسان بھی بہت ہیں۔ وہ خفیف بحروں میں اچھی شاعری کرتا ہے۔

ابونواس (145 تا 199ھ)

ابونواس کی پیدائش عراق میں ہوئی تھی۔ بصرہ اور کوفہ اس کے قیام اور تعلیم و تربیت کے مقامات ہیں۔ ابونواس کا باپ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کی فوج میں شامل تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا اور مالی پریشانیوں نے شاعر کے گھر کو گھیر لیا اس نے ایک عطار دوا فروش کی دکان پر ملازمت کر لی۔ اس کا ذوق شاعری کا تھا اور اس نے شہر کے ایک شاعر ابواسامہ بن حباب کا ذکر سنا اور اس کے شعر پڑھے تو وہ ابن حباب کا بہت قائل اور اس کی شاعری کا معترف ہو گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ ابونواس کی ملاقات ابن حباب سے ہو گئی اور خود ابن حباب نے بھی محسوس کیا کہ اس نوخیز

نوجوان کا ذوق شاعری بہت اچھا ہے۔ ابن حباب نے اس سے کہا کہ تم میرے ساتھ بغداد چلو اور کچھ وقت میرے ساتھ گزارو۔ ابونواس تیار ہو گیا اور اس نے ابن حباب کے ساتھ بغداد کے شعرا سے ملاقاتیں کیں۔ اس کے ذوق کو اور جلا ملی۔ فصاحت اور بلاغت اور شاعری میں رقت اور حسن خیال ابونواس کے خصائص میں ہے۔ وہ بہت خوش شکل اور وجیہ نوجوان تھا۔ شراب کا عادی تھا۔ آزاد خیال تھا۔ دور دور تقویٰ اور خدا ترسی اس کی زندگی میں نہیں تھی۔ اس نے خوب خوب شراب کی تعریف کی اور نئے نئے انداز سے مے نوشی کا ذکر کیا۔ اس سے عربی شاعری میں نئے اسلوب اور نئے طرز بیان کا اضافہ ہوا۔ فارسی تہذیب وتمدن نے بھی اس کی زبان اور ثقافت پر اپنے اثرات ڈالے۔ اس کی ماں ایرانی تھی۔ اس لیے گویا اس نے ایرانی تہذیب وثقافت کا دودھ پیا تھا۔ ابونواس کے نئے انداز بیان میں امرد پرستی کا بھی عنصر تھا اور یہ چیز بھی ایرانی تمدن سے آئی تھی۔ عربی شاعری میں پہلے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ دربار رسی اور امرا کی تعریف اکثر وبیش تر شعرا کا شیوہ رہا ہے۔ چنانچہ ابونواس نے بھی خلیفہ ہارون رشید کے لیے اور اس کے بیٹے امین رشید کے لیے قصیدے لکھے ہیں۔ طٰہٰ حسین نے تو ابونواس کو عصر عباسی کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔ بشار ابن برد ہو یا ابونواس ان کی مے نوشی اور ان کا ذکر شراب وشباب ایک مخصوص حلقہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ جن لوگوں نے اس دور کی دوسری علمی اور دینی تصنیفات کا مطالعہ نہ کیا ہو وہ یہ سمجھے گا کہ پورے عہد عباسی کا یہی رنگ اور یہی آہنگ ہے۔ آوارگی اور آوارہ مزاجی اس پورے زمانے کا عام کردار ہے۔ لیکن یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے کیونکہ اسی عہد میں محدثین بھی تھے اور مفسرین بھی تھے اور قال اللہ اور قال الرسول کے زمزمے سے گنبد اخلاق گونج رہا تھا۔ بڑے بڑے صوفیہ اور زاہدانہ مرتاض اپنی روحانیت کی شمع روشن کیے ہوئے تھے اور ہزاروں لوگوں کی تربیت کر رہے تھے۔ یہاں پر ذکر ابونواس کی شاعری کا ہے۔ ابونواس کی شاعری شراب وشباب میں ڈوبی ہوئی ضرور تھی لیکن فن کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی شاعری تھی۔ اور اس کو زبان اور اس کی باریکیوں پر بڑا عبور تھا اور فصاحت وبلاغت اور معانی اور بیان میں اس کا پایہ بہت بلند تھا۔

عہد عباسی خود شاعری میں بھی متضاد رنگ رکھتا ہے۔ جہاں ایک طرف مشاہدہ جمال اور شراب سے لبریز جام کی عکاسی پائی جاتی ہے تو دوسری طرف زاہدانہ اور عارفانہ رنگ بھی

شاعری میں ملتا ہے۔ ابوالعتاہیہ شاعر زہد تھا اور خود ابونواس اپنے عمر کے آخری حصے میں صوفی اور پارسا بن گیا تھا اور اس کی وہ طبیعت جو شاہد اور شراب کی طرف مائل تھی۔ وہ اب طاعت وزہد کی طرف مائل ہوگئی ہے۔

ابن الرومی (221 تا 283ھ)

یہ شاعر عصر عباسی کے اہم شعرا میں سے تھا، اس کا پورا نام ابوالحسن علی بن عباس ہے اور ابن الرومی اس کی عرفیت ہے۔ اس کی ولادت بغداد میں ہوئی اور زبان وبیان پر اسے ملکہ حاصل ہوگیا۔ اس کے یہاں رومی تہذیب اور عربی تہذیب کا امتزاج تھا۔ رومی ثقافت اور تہذیب کی عظمت اور عربوں کا زور بیان اس کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اسے تشبیہ اور وصف نگاری اور منظر نگاری پر خاص قدرت حاصل تھی۔ وہ صرف الفاظ کی جلالت کا نہیں بلکہ اقلیم معنی کا خسرو تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ اس کی شاعری میں اس کے عہد کے واقعات اور حالات کی عکاسی ہے۔ فطرت کا حسن سے اس نے اکتساب کیا ہے اور اس کے پھولوں سے شاعری کے دامن کو بھر دیا ہے۔ اس کی منظر نگاری صرف مناظر قدرت تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کا بھی بیان اور ترجمانی ہے اور ان کی تصویر ہے۔ اس کی شاعری کی اہم خصوصیت وحدت تاثر ہے اور اس طرح پورا قصیدہ ایک اکائی بن جاتا ہے۔ جس خیال سے قصیدے کی ابتدا ہوتی ہے وہی خیال ارتقا کی منزلیں طے کر کے تکمیل تک پہنچتا ہے۔ حسن خیال کو باقی رکھنا اور تمام اشعار کو ایک وحدت میں پرونا ابن رومی کا امتیاز خاص ہے۔ اس کے یہاں معانی کی گہرائی بھی ہے۔ فکر کی ندرت بھی ہے اور اس کے ساتھ الفاظ کا جادو بھی ہے۔ اس کی فکر ایک ارتقائی سفر طے کرتی ہے۔ ابن الرومی اپنے معاشرے کا ایک محسود شاعر تھا۔ اس کے تعلقات اپنے معاصرین سے اچھے نہیں تھے۔ اس لیے اسے بہت سے معرکہ آرائیوں سے گذرنا پڑا اور پھر اسے ہجو گوئی کی ضرورت پیش آ گئی۔ یہ غیر تعمیری اور منفی انداز کردار کی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ابن الرومی کے رقیبانہ اور حریفانہ تعلقات بہت سے شعرا سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شاعر ابن فراس نے اسے زہر دے دیا تھا اور اسی زہر سے ابن رومی کا انتقال ہوا۔

ابوتمام (188 تا 231ھ)

عرب ملکوں میں ملک شام میں کئی ممتاز وعبقری شعرا پیدا ہوئے۔ ابوتمام ملک شام کا رہنے والا تھا اور دمشق کے قریب ایک گاؤں میں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کا اصل نام حبیب بن اوس طائی تھا۔ وہ انصاری خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر وہ شام سے مصر منتقل ہو گیا اور جامع عمرو بن العاص میں سقہ گیری کرنے لگا۔ لوگوں کو ٹھنڈا پانی پلانے کا پیشہ اس نے اختیار کیا۔ یہ قاہرہ کی مشہور مسجد ہے اور اس مسجد میں علمی ادبی حلقے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ تو اس نے ان حلقوں میں شرکت کی اور آخر کار وہ خود ایک شاعر اور ایک عالم بن گیا۔ اس نے شعر کہنے کا آغاز کیا۔ انجام کار وہ ایک بہت بڑا شاعر بن گیا اور عربی شاعری کی تاریخ میں اس کا نام اور کام آج تک روشن ہے۔ ابوتمام ایک دانشور بھی تھا اس نے گہرائی کے ساتھ یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ فلسفہ کے اثرات ابوتمام کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ اس نے عربوں کے قدیم انداز شاعری سے بغاوت کی اور عربی شاعری کو نئے افق دکھائے اور نیا طرز بیان بخشا۔ اس نے روایتی اسلوب کو چھوڑ کر کے نئے معانی کے جواہر پاروں سے عربی شاعری کے دامن کو بھر دیا۔ اس نے زبردست قوت متخیلہ کا مظاہرہ کیا۔ وہ غیر معمولی صلاحیت اور عبقریت کا مالک تھا۔ خلیفہ متوکل کے دربار میں ابوتمام نے قصیدہ پڑھا۔ جس میں اس کے بارے میں یہ شعر تھا۔

اقدام عمر وفی سماحة حاتم
فی حلم احنف فی ذکاء ایاز

ترجمہ: اقدام وجرأت میں خلیفہ مثال عمر ہے اور سخاوت میں حاتم طائی ہے۔ حلم اور بردباری میں مثال احنف ہے اور ذہانت وذکاوت میں مثال ایاز ہے۔

ابوتمام کی تعریف یوسف کندی نے بھی کی ہے جو ایک فلسفی تھا۔ بادشاہ شاعر سے بہت خوش تھا اس نے ابوتمام کو موصل کا گورنر بنا دیا اور وہ وفات تک وہاں گورنر رہا۔ اس عبقری شاعر نے چالیس سال عمر پائی اور ایک ضخیم دیوان یادگار کے طور پر چھوڑا۔

خلیفہ معتصم باللہ ایک ہمت ور شجاع بادشاہ تھا۔ اس نے روم کے علاقے میں ایک قلعہ

معمورہ یہ میں ایک مسلمان عورت کو جو قید تھی بچایا۔ اس عورت نے عربوں کے قاعدے کے مطابق مدد کے لیے پکارا۔ یا معتصما! معتصم نے خبر ملتے ہی لشکر کشی کی اور اس قلعہ کی طرف کوچ کیا اور پھر اس قلعہ کو فتح کیا۔ چنانچہ معتصم کی تعریف میں ابوتمام نے وہ قصیدہ کہا جس کا یہ شعر آج تک لوگوں کو یاد ہے ۔

السیف اصدق انباء من الکتب
فی حدہ الحد بین الجد واللعب

ترجمہ: کتابوں سے زیادہ تلوار کی خبر زیادہ سچی ہوتی ہے اور تلوار کی دھار میں سنجیدگی اور کھیل کے درمیان حد مقرر ہے۔

ابوتمام کا ایک شاگرد بحتری تھا۔ ایک صاحب نے بحتری سے کہا کہ تمھاری شاعری ابو تمام سے بڑھ گئی ہے اور آپ ابوتمام سے زیادہ بڑے شاعر ہیں۔ بحتری نے جواب دیا کہ تمھاری اس تعریف سے نہ تو میں بڑا ہو جاؤں گا اور ابوتمام چھوٹا ہو جائے گا اور سچ یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ پایا ابوتمام سے پایا ہے اور اس کا کلام میرے کلام سے بہتر اور برتر ہے۔ بہر حال ابوتمام اور بحتری دونوں بڑے شاعر ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کو پسند کرنے والے اور ترجیح دینے والے ہیں۔ ابوتمام کے یہاں فکر کی بلندی ہے۔ تخیل کی رعنائی ہے اور فلسفیانہ گہرائی ہے۔ عربی شاعری میں فلسفہ کا خاص رنگ ابوتمام کی وجہ سے آیا ہے اور ابوتمام سے پہلے یہ عربی شاعری اس رنگ سے خالی تھی۔

ابوعبادہ بحتری (206 تا 284ھ)

شاعر کا پورا نام ابوعبادہ ولید بن عبید اللہ طائی تھا۔ وہ ایک خالص عرب شاعر تھا۔ نہ اس نے یونانی فلسفہ پڑھا اور نہ اس نے اس فلسفہ کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اس نے خالص عربی اسلوب میں شاعری کی۔ اس کی پرورش دیہات میں ہوئی اس لیے اس پر بدویانہ رنگ غالب ہے۔ وہ ابو تمام کا شاگرد تھا لیکن اس نے اپنا رنگ اور انداز جداگانہ رکھا۔ بہت سے عرب ناقدین بحتری کو ابوتمام سے بڑا شاعر قرار دیتے اور یہ کہتے ہیں کہ بحتری کے یہاں شعری معنٰی کسی سے مستعار اور ادھار نہیں ہیں۔ جب کہ ابوتمام پر سرقہ کا الزام ہے۔ بہر حال معانی تو شعرا اور ادبا ایک دوسرے سے ہمیشہ سے اخذ کرتے رہے ہیں۔ اس لیے بہت آسانی کے ساتھ سرقہ کا الزام نہیں لگانا چاہیے اور

ابوتمام کی فضیلت کے بہت سے شعرا اور ناقدین قائل ہیں۔ بحتری کے یہاں معانی کی روانی اور فراوانی ہے۔ الفاظ بھی شیریں اور دلکش ہیں۔ اس کی شاعری میں وصف اور تشبیہ بہت ہے اور سہل ممتنع کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے نام کے ساتھ بحتری کا لفظ اس لیے ہے کہ اس کے دادا کا نام بحتر تھا۔

بحتری کے یہاں کہیں کہیں مشکل الفاظ اور عبارتیں بھی ہیں اس لیے اس کے شعر کو سمجھنا ہر جگہ آسان نہیں ہوتا ہے۔ بحتری بہت ہی پراگندہ حال اور پراگندہ بال۔ پراگندہ صفت شاعر تھا۔ اس کو لباس کی آرائش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہت فقیرانہ اور درویشانہ زندگی گزارتا تھا۔ لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا اور میلا۔ صرف وہ اپنی شاعری کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

متنبّی (303 تا 354ھ)

شاعر کا پورا نام ابوالطیب احمد بن حسین المتنبی ہے۔ متنبّی عربی زبان کا بہت بڑا شاعر ہے۔ بلکہ عربی شاعری کی عظمت اور شہرت جن شعرا کے دم سے ہے ان میں ایک نام متنبّی کا بھی ہے۔ اس کی شاعری فکر وفن کی عظمت کی ترجمان ہے۔ احساسات اور مشاہدات کا نچوڑ ہے۔ اس نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ فلسفہ طراز شاعر ہے۔ متنبّی کی شاعری تجربات حیات اور مشاہدات آفاق سے چھن کر کے نکلتی ہے۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور اس کا فلسفہ عمیق ہے۔ اس کی شاعری میں حیات وکائنات کے نظریہ کی ترجمانی ہے۔ متنبّی نے اپنی شاعری میں یونانی فلسفہ سے بھی کام لیا ہے اور اس فلسفہ کی وجہ سے اس شاعری میں گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس نے عربوں کے اسلوب سے انحراف نہیں کیا ہے۔

جب ہم متنبّی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں متنبّی کا قبیلہ یمنی قبیلہ تھا اور اس کا باپ کوفہ میں سقہ گری کرتا تھا اور غالی شیعہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو قرامطہ کے اسکول میں داخل کیا اور اس کو شیعیت کی تعلیم دی۔ طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ کیونکہ اس زمانے میں حکومت قرامطہ کی مخالف تھی اور ان پر حملے کرتی رہتی تھی۔ اس لیے قرامطہ بھی حکومت سے خائف رہتے تھے اور ایک جگہ قیام نہیں کرتے تھے اور دربدری کی زندگی گزارتے تھے۔ متنبّی کا باپ ایک طویل عرصہ تک ملک شام کے دیہاتوں میں رہا۔ ان دیہاتوں میں رہنے کی وجہ سے متنبّی کی زبان بہت فصیح ہوگئی تھی اور اس نے

الفاظ کا عمدہ ذخیرہ اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا۔ چنانچہ وہ عربی الفاظ اور ترکیبوں کا بہت بڑا خزانچی بن گیا۔ سیف الدولہ کے دربار میں بڑے بڑے علما فلاسفہ اور شعرا رہتے تھے۔ لیکن ان علما اور ادبا کی موجودگی میں متنبّی نے زبان وادب میں اپنی عظمت کا سکہ جمایا۔ اس کی طبیعت میں جولانی تھی اور وہ بہت حوصلہ منداور پرعزم انسان تھا۔ اس نے شاعری کے ذریعہ عزت حاصل کی۔ اس نے شروع میں خلافت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور اپنے آپ کو علوی بھی ثابت کیا تھا۔ لیکن حمص کے امیر نے ان کو قید کردیا تھا اور اس کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس لیے اسے متنبّی کہا جاتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی نبوت کے دعوے سے توبہ کرلی اور امیر کا قصیدہ کہہ کر کے قید سے رہائی حاصل کی۔

متنبّی کی زندگی میں بڑے بڑے انقلاب آئے اور وہ خود اپنے آپ کو شاعری کا بادشاہ تصور کرتا تھا اور خود کو کسی بادشاہ سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے کم کسی شخصیت کا قصیدہ نہیں لکھا اور جب صاحب بن عباد نے متنبّی سے خواہش کی کہ اس کی شان میں قصیدہ کہے تو متنبّی نے جواب دیا آپ ایک وزیر ہیں بادشاہ نہیں ہیں اس لیے میں قصیدہ نہیں لکھ سکتا۔ صاحب بن عباد خود ادیب اور ادب شناس اور بڑا نقاد تھا۔ انھوں نے متنبّی کے کلام پر تنقید میں ایک پوری کتاب لکھ دی اور اس طرح متنبّی پر ایک پوری کتاب اس کی زندگی میں تیار ہوگئی۔

متنبّی نے تقریباً دس سال سیف الدولہ کے دربار میں گزارے اور بڑے بڑے معرکے طے کیے۔ وہ صرف شاعر نہیں تھا بلکہ سپہ گری کا شوق بھی رکھتا تھا۔ وہ میدان قتال میں خود شریک ہوا۔ خاص طور پر ان جنگوں میں جو رومیوں سے کی جاتی تھی اور رومی کبھی کبھی شام کے اندر گھس آتے تھے۔ جہاد کی وجہ سے ملک میں مال غنیمت کی افراط تھی۔ لونڈی غلاموں کا بازار لگتا تھا اور چونکہ سیف الدولہ خود بڑا سخی انسان تھا اس لیے اس نے دولت کو لٹایا اور متنبّی کا دامن سیم وزر سے بھر دیا۔ متنبّی میدان جنگ میں لشکر کو جنگ پر ابھارتا تھا۔ اس نے بہت سارے قصائد ان قصائد میں سیف الدولہ کی طرف اشارے بھی بہت ہیں اور ہر جگہ سیف الدولہ کی تعریف ہے اور طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ متنبّی کا بہترین کلام وہ ہے جو سیف الدولہ کے بارے میں ہے۔ متنبّی صرف قلم کا نہیں بلکہ سیف وسنا کا آدمی تھا اور صرف شاعری نہیں کرتا تھا بلکہ سپہ گری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ

صرف قلم کا بادشاہ نہیں تھا بلکہ شمشیر زن بھی تھا۔ اس نے میدان جنگ کی جو منظر کشی کی ہے۔ وہ کم شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ متنبّی نے بڑی شہرت اور ناموری حاصل کی اور سیف الدولہ کے دربار میں اس کی بڑی عزت تھی۔ چنانچہ بہت سے ادبا اور شعرا حسد کی آگ میں جل رہے تھے اور وہ سیف الدولہ کو اس سے بدظن کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ سیف الدولہ نے شام سے راہ فرار اختیار کی اور وہ مصر کے بادشاہ کافور اخشید کے پاس پہنچا۔ مصر میں کافور کی حکومت تھی اور کافور پہلے ایک غلام تھا۔ جو بادشاہ بن گیا تھا۔ متنبّی کو کافور کے دربار سے بڑی امیدیں قائم تھیں اور اس کو ایسے اشارے بھی دیے گئے تھے کہ اسے کسی صوبہ کا گورنر بنا دیا جائے گا۔ متنبّی بہت حوصلہ مند انسان تھا اور بہادر بھی تھا۔ بادشاہ کافور کو متنبّی کے سلسلہ میں اندیش ہائے دور دراز پیدا ہو گیا تھا۔ کافور نے متنبّی کی آرزوں کی تکمیل نہیں کی۔ کافور کے دربار میں اور ملک مصر میں چونکہ امن وامان تھا۔ کہیں جنگ وقتال برپا نہیں تھا۔ اس لیے متنبّی نے مصر سے ہجرت کی اور کوفہ پہنچا۔ جہاں شیعوں کی حکومت تھی۔ متنبّی اگرچہ خود بھی شیعہ تھا اور قرامطہ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن رومیوں سے مسلسل جنگ کی وجہ سے اس کی شیعیت مدھم پڑ گئی تھی۔ بلکہ اس نے قرامطہ کے سردار کی ہجو بھی کر دی تھی۔ چنانچہ قرامطہ نے متنبّی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب متنبّی بغداد اور کوفہ سے مایوس ہو کر کے ایران گیا اور وہاں اسے انعام واکرام سے نوازا گیا۔ لیکن جب وہاں کی فارسی ثقافت سے بیزار ہو کر وہ پھر بغداد جانے لگا۔ تو راستے میں قرامطہ کے ایک فرد نے متنبّی پر حملہ کر دیا۔ متنبّی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اس کے غلام نے متنبّی کو اس کا یہ شعر سنایا:

الخیل واللیل والبیضاء تعرفنی
السیف والرمح والقرطاس والقلم

ترجمہ: تمام گھوڑے اور سیاہ راتیں اور جنگل و بیابان سب مجھ کو پہچانتے ہیں
اور تلوار۔ نیزہ۔ کاغذ اور قلم بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔

یہ شعر سن کر متنبّی نے لڑنے کا فیصلہ کیا اور پھر میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے اس نے وفات پائی۔

متنبّی پر عربی تنقید و تاریخ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ قاضی جرجانی نے ایک پوری

کتاب لکھ دی ہے۔جس کا نام ہے''الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ''۔اس کتاب میں فن شاعری متنبّی کا مقام متعین کیا گیا ہے اور جو اعلیٰ انکشافات اور زندگی جو مشاہدات اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔وہ دوسرے شعرا کے یہاں اس مقدار میں نہیں پائے جاتے۔اس نے نئے معانی اور عمدہ الفاظ کے استعمال سے عربی شاعری کا مرتبہ بلند کیا۔

ابوفراس ہمدانی (220 تا 357ھ)

شاعر کا نام ابو حارث بن ابوالعلی ہے۔وہ سیف الدولہ جو حلب کا بادشاہ تھا کا چچازاد بھائی تھا۔وہ شاعری۔دربار اور حکومت واقتدار کے سائے میں پروان چڑھا۔چنانچہ وہ شاعری اور دوسرے علم وفن کے اصناف کے ماحول میں پلا اور بڑھا۔اسے شاہی سرپرستی حاصل تھی۔چنانچہ وہ علوم اور اخلاق فاضلہ کا حامل تھا۔وہ سیف وقلم دونوں کا بادشاہ تھا۔خود سیف الدولہ اس سے متاثر تھا اور اس کی شاعری کی تعریف کرتا تھا، بادشاہ اس کو اپنے ساتھ جنگوں میں بھی شریک رکھتا تھا۔اس کو اصناف شاعری میں فخر ومباحات وصف اور منظر نگاری اور اسی کے ساتھ رزم نگاری میں امتیاز حاصل تھا۔وہ جیل میں بھی کچھ عرصے تک رہا۔جیل میں ان اشعار کو جو اس نے رومیوں کی قید میں کہے تھے رومیات کہا جاتا ہے۔اس نے سیف الدولہ کی تعریف میں بہت سے قصیدے کہے اور قید زنداں میں بڑے غم انگیز قصائد لکھے۔چنانچہ یہ قصائد عربی شاعری کا ایک ستون سمجھے جاتے ہیں۔ایک جائداد کے مسئلہ میں ابوفراس کی سیف الدولہ سے جنگ ہوگئی اور ابوفراس قتل کر دیا گیا۔

ابوفراس ہمدانی ایک ممتاز شاعر اور ایک صاحب کردار اور با اخلاق شخص تھا۔اگر وہ زہد کے میدان کا آدمی نہیں تھا تو رندی اور سرمستی سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔شراب وشباب ہر چیز سے دور اور نفور وہ ایک پاکباز زندگی گزارتا تھا۔اس کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔صاحب بن عباد جو عربی زبان وادب کا بہت بڑا پارکھ اور جوہر شناس تھا۔ابوفراس کے بارے بہت بلند خیالات رکھتا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ عربی شاعری ایک بادشاہ سے شروع ہوئی اور پھر ایک بادشاہ پر ختم ہوئی۔جس بادشاہ سے شروع ہوئی اس کا نام امرءالقیس ہے اور جس پر ختم ہوئی اس کا نام ابو فراس ہمدانی ہے۔اس کے اشعار عربی زبان وادب میں بہت مقبول ہیں۔اس کے چار شعر یہ ہیں۔

اقول وقد ناحت بقرب حمامة
ایا جارنا لو تشعرین بنا بحالی
مذاق الهوا ماذقت طارقة النوی
ولا خطرت منک الهموم ببالی
لقد کنت اولی منک بالدمع مقلة
ولکن دمعی فی الحوادث غالی

میرے قریب ایک چڑیا نے غم کی آواز نکالی۔تو میں نے کہا کہ اے میری پڑوسن کاش تم میرے حال کو سمجھ سکتی۔تم نے محبت کا مزہ چکھا ہے مگر تم کو ہجر و فراق کا مزہ نہیں معلوم ہے اور تمھارے دل پر غم کا سایہ نہیں پڑا ہے۔اے ہماری پڑوسن زمانے نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے آؤ ہم غم کو اپنے درمیان تقسیم کرلیں۔رونے کا مستحق میں زیادہ ہوں۔لیکن حادثات نے میرے آنسوؤں کو بہت قیمتی بنادیا ہے۔

ابن المعتز (861 تا 908)

یہ شاعر خلیفہ عباسی ہے اس کا پورا نام ابو العباس عبداللہ ہے۔شاہی محل میں اس کی پیدائش ہوئی۔بچپن سے اسے آسائش اور آسودگی کا ماحول ملا۔دربار کی تربیت کی وجہ سے وہ شریف النفس بھی ہے۔رقیق الحس بھی ہے۔جمالیاتی ذوق رکھنے والا بھی ہے اور ادب اور موسیقی کا دلدادہ بھی ہے۔اس کے عہد میں زبان وادب کے ماہر اساتذہ میں مبرد اور ثعلب کا شمار ہوتا تھا۔ابن المعتز نے ان دونوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔اس نے بہت سے علوم منقولہ ومعقولہ کی تحقیق کی۔وہ شعر وادب کا آدمی تھا۔مجلسی علمی سرگرمیاں اسے پسند تھیں۔لہو ولعب اور رنگ رلیوں کا بھی دلدادہ تھا۔ان چیزوں کی مشغولیت کی وجہ سے وہ محلات کی سیاست سے دور رہا۔اس نے اپنے شعری۔ادبی اور رومانی مزاج کی عکاسی اپنے ان اشعار میں کی ہے۔

قیل هموم القلب الا للذة
ینعم نفساً ائذنت بالتنکل

فـا ن تـطـلبـه تـقتنسـه بحـانة
والا ببستـــان وكـــرم مـظـلـل
ولســت تــراه ســائلاً عن خليفة
ولا قـائلاً مـن يـعـزلون ومن يلى
ولا صـائـحـاً كالعيد فى يوم لذة
يـنـاظـر فى تقدير عثمان او علي

ترجمہ: دل کی منتہائے آرزو اس لذت کے سوا کیا ہے جو اس انسان کو بخشی جاتی ہے۔ جس کی رحلت کا اعلان ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر تمھیں اس لذت کی طلب اور آرزو ہے تو میکدہ میں اسے ڈھونڈو۔ یا پھر باغ وراغ میں یا انگور کے سائبان میں ۔ ایسے لذت یافتہ شخص کو تم خلافت اور سیاست کے بکھیڑے میں الجھا ہوا نہیں پاؤ گے اور نہ اس کا موضوع گفتگو یہ بات ہوگی کہ کسے معزول کیا گیا اور کون تخت اقتدار پر بیٹھا اور جب وہ لذت کام و دہن میں مشغول ہو تو قافلہ کے اس شخص کی طرح اسے نہ پاؤ گے۔ جو بلند آواز میں اس بات پر مناظرہ کر رہا ہو کہ عثمان افضل ہیں یا علی افضل ہیں۔

ابن المعتز کی قسمت میں ایک دن کی بادشاہت تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے تک خلیفہ رہا اور پانسا پلٹ گیا اور اقتدار دوبارہ مقتدر کو حاصل ہو گیا۔ اس سیاسی رزم آرائی میں اس شاعر کو اپنے جان کی قیمت چکانی پڑی۔ مقتدر کے لوگ اس کی تلاش میں نکلے اور تب یہ شاعر بصاص جوہری کے گھر میں جا چھپا۔ لوگوں نے ڈھونڈ کر گھر سے نکالا اور اسے قتل کر دیا۔

جیسا کہ اوپر تذکرہ میں آیا کہ شاعر نے شاہی دربار میں پرورش پائی۔ ہر طرح کی آسائش اور ہر طرح کی نعمت سے بہرہ ور رہا۔ اس ماحول نے اس کی طبیعت میں نزاکت اور اخلاق میں نرمی پیدا کی۔ انوکھے افکار اور جمالیاتی شعور کی کیفیت اس کی شاعری میں رچ بس گئی۔ اس کے کلام میں بڑے خوبصورت استعارے ہیں اور نادر تشبہات ہیں۔ شاعر اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس لیے اس نے دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اس کی شاعری

میں دوستوں کے ساتھ مجلس آرائی اور سیر وشکار کے واقعات کا تذکرہ ہے اور فطرت کے حسن کی عکاسی ہے اور وہ بہترین نثر نگار بھی تھا اور اس کا اسلوب تخیل کی نزاکت اور دلکش ترکیبوں کا مرقع ہے۔

ابن المعتز ایک جمالیاتی شعور رکھنے والا اور نرم گداز دل کا مالک شاعر ہے۔ لیکن اس نے نثر میں بھی اپنی مہارت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی ایک مشہور کتاب ''کتاب البدیع'' ہے۔ یہ فن بدیع کے موضوع پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے مخطوطے کو 1935 میں ایک مستشرق نے انگریزی زبان میں مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے اور کتاب کے آخر میں ابن المعتز کی سوانح حیات بھی ہے۔ اس کی دوسری کتابوں میں ''مکاتبات الاخوان بالشعر'' اور ''اشعار الملوک'' اور دوسری کتاب ''طبقات الشعرا'' اہم اور مشہور کتابیں ہیں اس کا دیوان دو حصوں میں مصر میں چھپ گیا ہے۔

شریف رضی (359 تا 404ھ)

ابوالحسن محمد بن حسین مصری جو شریف رضی کے نام سے مشہور ہوئے۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ تمام علوم مروجہ کو بچپن میں سیکھ لیا اور ابھی عمر بیس سال کی نہیں ہوئی تھی کہ منہ سے شعر ٹپکنے لگے۔ اسے حکومت میں سرکاری ملازمت بھی حاصل تھی کام کی نوعیت اس کی مختلف تھی وہ لوگوں کو حج بھی کراتا تھا اور مقدمات کے فیصلے بھی کرتا تھا۔ وہ ایک مدت حکومت کے منصب پر فائز رہا اور پھر خلیفہ عباسی قاہر باللہ کی طرف سے اس پر یہ الزام لگا کہ وہ فاطمی علویوں کی طرف داری کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کو فرائض انجام دہی سے برطرف کر دیا گیا، پھر اس نے ایک شریف اور قانع آدمی کی طرح اپنی بقیہ زندگی گزار دی اور کرخ میں مدفون ہوا۔

شریف رضی میں خودداری۔ بلند ہمتی بہت تھی۔ وہ ہمیشہ اونچی باتیں سوچتا اور بلند ہمتی سے کام لیتا۔ وہ بہت غیور اور عفت مآب تھا۔ وہ انعام اور صلہ کسی سے قبول نہیں کرتا تھا اور اس نے بادشاہوں کے وہ وظیفے واپس کر دیے جو اس کے باپ کو ملا کرتے تھے۔

شاعری میں رضی کا اسلوب قدیم شعرا کے مشابہ تھا۔ بھاری بھرکم الفاظ اور پر شوکت معانی۔ اس کی شاعری بحتری کی شاعری سے زیادہ ملتی تھی۔ ثعلبی جیسے محقق اور ناقد کا قول ہے کہ شریف رضی بہت بڑا شاعر ہے، شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ یہ قریش کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ فخر

اور حماسہ میں وہ بحتری سے بھی بازی لے گیا۔ وہ بہت بڑا شاعر تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ بہت اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔ خطوط نویسی پر اسے بڑی قدرت حاصل تھی۔ نہج البلاغۃ کے بارے میں بڑی بحثیں ہیں زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں صرف حضرت علیؓ کے خطبات نہیں ہیں بلکہ اس میں شریف رضی کی بھی آمیزش ہے۔ بہر حال نہج البلاغۃ ادب اور بلاغت کی اتنی عمدہ کتاب ہے کہ لوگ اس کو قرآن کے بعد ادب میں دوسرا مقام دیتے ہیں۔ نہج البلاغۃ میں فلسفہ اخلاقیات اور اصول اجتماعیات اور پر تکلف ادبی صنعت جیسے عناصر ہیں جس کی وجہ سے نہج البلاغۃ کو غیر معمولی ادبی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

طغرائی (513ھ)

شاعر کا پورا نام ابو اسماعیل حسین بن علی ہے۔ چونکہ یہ شاہی فرامین اور سرکاری خطوط کی پیشانی پر نہایت فنکارانہ طریقہ سے طغرے بنایا کرتا تھا اس لیے اسے طغرائی کہا جانے لگا۔ پہلے ان طغروں میں حکمرانوں کے القاب واوصاف لکھے جاتے تھے اور طغرا بنانا ایک فن تھا۔ جسے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ طغرائی کی پیدائش اصفہان میں ہوئی۔ ایک ایرانی خاندان میں اس کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ پھر آل سلجوق کے زیر سایہ اس نے مختلف خدمات انجام دیں۔ پھر وہ موصل میں سلطان مسعود کا وزیر ہوگیا۔ پھر جس طرح حکمراں خاندانوں میں خانہ جنگی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے سلطان مسعود اور اس کے بھائی سلطان محمود کے درمیان جنگ ہوئی۔ محمود کو فتح حاصل ہوئی اور طغرائی کو قید کر لیا گیا اور اس طرح سے طغرائی کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اتنا عجیب وہ زمانہ تھا جب بڑی آسانی سے لوگوں کو جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ نہ کوئی عدالت نہ کوئی قانون۔ خون کی بھی کوئی قیمت نہیں تھی۔ ایام رسالت اور خلافت راشدہ کے بعد وہ استبدادی نظام شروع ہوا جس میں تخت اقتدار کے لیے سازشیں ہوتی تھیں اور خون پانی کی طرح بہا جاتا تھا۔

یہ مظلوم شاعر بڑا شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا اسلوب محکم اسلوب ہے۔ وہ صرف شاعر نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔ عربی شاعری کی ایک صنف فخر وحماسہ ہے۔ اس صنف میں اسے دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ اس کی شاعری کا مجموعہ ایک دیوان کی شکل میں موجود ہے اور اس دیوان کا بہت ہی خوبصورت قصیدہ وہ ہے جو لامیۃ العجم کے نام سے مشہور ہے۔ اس قصیدہ میں

حوادث زمانہ کا گلہ اور احباب کی بے وفائیوں کا شکوہ ہے۔ یہ قصیدہ عربی ادب میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں۔ اس قصیدہ کا مطلع اس طرح سے ہے ۔

اصالة الرأی صانتنی عن الخطاء
وحلیة الفضل زانتنی لدی العطل
حب السلامة یثنی هم صاحبه
عن المعالی ویغری المرء بالکسل

ترجمہ: اصابت رائے اور عقل سلیم نے مجھے بہت سے غلطیوں سے محفوظ رکھا اور بیکاری کے زمانے میں علم وفضل کے جوہر نے مجھے حسن اور وجاہت بخشی۔ امن وعافیت سے شغف انسان کے عزم کو موڑ دیتا ہے اور اسے بلندیوں کی طرف نہیں جانے دیتا اور سستی اور پستی کی تلقین کرتا ہے۔

ابوالعلا المعری (363 تا 439ھ)

شاعر ابوالعلا معری ملک شام کے ایک شہر ''معرۃ النعمان'' میں پیدا ہوا۔ جو ملک شام کا ایک شہر ہے۔ ابھی اس کی عمر چار سال کی بھی نہیں تھی۔ کہ اس کی بینائی جاتی رہی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ بغداد میں گزارا اور وہاں کی محفلوں میں شریک رہا۔ علم وادب کی بزم میں اس کی ادبی اور شعری صلاحیت نکھر گئی۔ اس کے باپ نے اس کے لیے ایک جائیداد چھوڑی تھی۔ وہ جائیداد اس کے لیے اور اس کے خادم کے لیے کافی تھی۔ اس کی والدہ وطن معرۃ النعمان میں رہتی تھی۔ والدہ کے انتقال کی خبر سن کر وہ معرۃ النعمان واپس آ گیا۔ لیکن والدہ کے انتقال کا حادثہ اس کے لیے سوہان روح اور جانگداز تھا۔ اس نے اپنے لیے قید تنہائی کی زندگی منتخب کی اور وہ چالیس سال تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس نے لکھا ہے کہ میں ایک نہیں بلکہ تین تین قید میں ہوں۔ میرا اندھا پن میرا قید خانہ ہے۔ دنیا کو دیکھ نہیں سکتا۔ دوسرا قید خانہ میرا گھر ہے جہاں سے میں باہر نہیں نکل سکتا اور تیسرا قید خانہ زار ونزار اور بے آسائش جسم ہے۔ جس میں روح رہتی ہے۔

معری فلسفہ کا شیدائی تھا۔ اس نے یونانی فلسفہ بھی پڑھا تھا اور ہندوستانی فلسفہ کو بھی سمجھا تھا۔ اس نے ہندوستانی فلسفہ کے زیر اثر گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا اور سبزی خور بن گیا تھا۔

چنانچہ ابو العلاء معری پر اقبال کی جو نظم ہے اس میں اس کے سبزی خور ہونے کی طرف اشارہ موجود ہے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات
ایک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ کنجشک فرومایہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران ولزومات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

معری پھل اور سبزی پر گزارا کرتا تھا۔ زمین پر سوتا تھا۔ فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی سوچ بہت منفی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں چونکہ ظلم بہت ہے اس لیے انسانی نسل میں اب کوئی اضافہ نہیں ہونا چاہیے اور پھر وہ اپنے شعر میں کہتا ہے کہ میرا وجود وہ گناہ ہے جو میرے باپ سے سرزد ہوا۔ مگر میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ شعرا میں اس کو متنبّی سب سے زیادہ پسند تھا۔ اس کے ایک دیوان کا نام سقط الزند ہے اور دوسرے دیوان کا نام لزومیات ہے، اس دیوان کا اصل نام مالا یلزم ہے۔ معری کی زبان کہیں کہیں بہت مشکل ہے۔ اس کی شاعری کے ایک حصہ سے اس کی زندگی سے بیزاری اور قنوطیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے تمام طبقات کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ وہ امرا کے طبقہ کو دیکھتا ہے۔ تو ان کی عیش پرستی اور ہوس ناکی پر تنقید کرتا ہے۔ یہ زہاد کے طبقہ پر بھی شکوہ سنج ہے اور وہ کہتا ہے یہ زاہدان حرم دنیوی مال و دولت کے حریص ہوتے ہیں۔ معری کی ایک کتاب کا نام رسالۃ الغفران ہے اس کا نام غفران اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں بہت سے شعرا کی مغفرت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور ان کے اچھے اشعار

نقل کیے ہیں۔ رسالۃ الغفران وہ کتاب ہے جس کو بنیاد بنا کر مشہور شاعر دانتے نے ڈیوائن کامیڈی لکھی تھی۔ اس طرح معری کی اس کتاب کا اثر عالمی پیمانے پر مرتب ہوا۔

معری کی شخصیت بہت مختلف فیہ ہے کچھ لوگ اسے دیندار اور اسلامی عقائد کا ترجمان سمجھتے ہیں کچھ لوگ اسے ملحد یا کم از کم تشکیک کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ اس پر مذہبی اعتبار سے زیغ وضلال کا بھی الزام لگایا گیا ہے۔ وہ اپنے عجیب وغریب خیالات اور عجیب وغریب روش کی وجہ سے بہت سے ناقدین کی تنقیدی گرفت میں آیا ہے۔ ابوالعلا معری متفقہ طور پر بڑا شاعر ہے۔ مشہور مصری ادیب طٰہٰ حسین نے بھی اس پر پوری کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے ''ذکری ابی العلاء المعری'' اور ہندوستان کے عظیم محقق عبدالعزیز میمنی نے بھی ابوالعلا معری پر ایک پوری ضخیم کتاب لکھی ہے جو مصر سے شائع ہوئی ہے۔ عبدالعزیز میمنی نے طٰہٰ حسین کے نظریات پر تنقید کی ہے۔

ابن زیدون (394 تا 462ھ)

اندلس میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی اور اندلس میں بڑے علما اور اتقیا اور مفسرین اور محدثین اہل قلم اور شعرا پیدا ہوئے۔ اندلس کے شعرا میں ایک نام ابن زیدون کا بھی ہے۔ جس کا پورا نام ابوولید احمد بن عبداللہ بن زیدون ہے، اس شاعر کی پیدائش قرطبہ میں ہوئی۔ اس کے والد بہت بڑے فقیہ اور بہت بڑے ادیب تھے۔ زیدون کو بھی مبدا فیاض سے شعر وادب کا ہنر ملا۔ ابن زیدون کو کمالات علم وادب کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کا شہرہ شاہی قلعہ اور دربار تک بھی پہنچا۔ وہ بادشاہ کا وزیر بن گیا اور اس کی دانشمندی اور معاملہ فہمی اور ذہانت کی بڑی شہرت ہوئی، بادشاہ نے مختلف حاکموں اور فرمارواؤں کے پاس بحیثیت سفیر اس کو بھیجا۔ اس سے لوگ حسد بھی کرنے لگے تھے اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے تھے۔ بادشاہ نے اس کو گرفتار کرلیا۔ وہ فرار ہوکر قرطبہ سے اشبیلیہ چلا گیا اور بادشاہ سے اس کے تعلقات دوبارہ بحال ہوگئے۔ پھر اس نے وزارت کا قلم دان سنبھال لیا۔ اس کی زندگی شاہی سرپرستی میں گذری۔ آسائش سے بھری ہوئی زندگی میں اس کے شعری ذوق کو بھی جلا ملی۔

ابن زیدون کا تعلق شاہی دربار سے تھا اور مستکفی بادشاہ کی بیٹی ولادہ سے اس کے مراسم قائم ہوئے۔ جو محبت وعشق تک پہنچ گئے، ولادہ بھی حسن وجمال کی ملکہ تھی۔ ابن زیدون نے اپنی

محبوب دختر بادشاہ کے لیے بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ اندلس کی غزلیہ شاعری میں ابن زیدون کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کی شاعری صرف دل کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ اس میں مناظر فطرت کی عکاسی بھی موجود ہے۔ خیالات کی بلندی ہے۔ بہترین جذبات کی ترجمانی ہے ایک بہتر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھا نثر نگار بھی تھا اور نثر میں اس کے دو کتابچے اور رسالے موجود ہیں۔ ابن زیدون کی غزلیہ شاعری کے چند نمونے یہ ہیں۔

حالت لبعدکم ایامنا فقدت
سود آفکانت بکم بیضاً لیالینا
واللہ ما طلبت اھوائنا بدلاً
منکم ولا انصرفت عنکم امانینا
ویانسیم الصبابلغ تحیتنا
من لو علی البعد حیا کان یحیینا

ترجمہ: ہماری شب کی سیاہی تمھارے ہجر وفراق کی وجہ سے ہے اور ہمارے دن کی روشنی تمھارے قربت اور وصال کی وجہ سے ہے۔ ہمارے دل کے جذبات وہی ہیں جو پہلے تھے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور ہماری تمنائیں اور آرزوئیں تمھارے لیے آج بھی وہی ہیں۔ آج بھی تم میری محبت کا مرکز ہو۔ اے نسیم صبح! ہمارا سلام محبت اس تک پہنچا دو اور وہ چاہے جتنی بھی دور ہو۔ وہ ہمارے سلام کا جواب دے کر ہمارے لیے زندگی کا سامان کرے گی۔

ابن الفارض (576 تا 632ھ)

شاعر کا پورا نام ابوحفص عمر بن علی ہے اور ابن فارض کے نام سے مشہور ہے اور یہ بات خاص طور پر جاننے کی ہے کہ عربی زبان کی شاعری میں تخلص نام کی کوئی چیز نہیں۔ بلکہ عرب ادبا وشعرا لفظ تخلص سے واقف ہی نہیں ہیں۔ شاعر کا خاندانی وطن حماۃ تھا۔ جو شام میں ہوا قع ہے۔ لیکن شاعر کی پیدائش قاہرہ میں ہوئی۔ علوم اسلامیہ میں اس نے مہارت حاصل کی اور عربی زبان

وادب پر عبور حاصل کیا۔ ابن الفارض اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے صوفی اور درویش تھا۔ چنانچہ اس نے تصوف کے اسرار ورموز کا علم حاصل کیا اور پھر صوفیانہ زندگی بھی اس نے گزارنی شروع کی اس نے مکہ اور مدینہ کا سفر کیا اور وہاں ایک عرصہ تک قیام کیا۔

ابن الفارض اپنے صوفیانہ مزاج اور سادہ زندگی کے باوجود خوش وضع۔ خوش گفتار اور شگفتہ مزاج تھا۔ اس کی خدارسی اور خداترسی کا ہر طرف چرچہ تھا۔ جب وہ گھر سے نکلتا تو سڑکوں پر لوگ اسے گھیر لیتے اور اس سے نعمت اور برکت کی دعا کرواتے۔ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھتا تو وہ مجلس بہت باوقار ہوتی اور لوگ ادب اور خاموشی کے ساتھ بیٹھتے۔ متصوفانہ زندگی کے باوجود وہ ایک قادر الکلام اور خوش گو شاعر تھا، جب اس پر اشعار کا نزول ہوتا تو ایک خاص کیفیت اس پر طاری رہتی اور کبھی کبھی مدہوشی کی یہ کیفیت بہت طویل رنگ اختیار کر لیتی، پھر جب اسے سکون میسر آتا اور سکر وسرور کی کیفیت ختم ہوتی تو وہ اپنے اشعار لوگوں سے املا کراتا۔

شعری مضمون کے نزول اور اوپر سے القا کے تجربہ کا ذکر اور شاعروں نے بھی شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ مجروح سلطان پوری کا شعر ہے جس میں اخلاص اور جذب دروں کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے یہ بھی وحی الٰہی ہے
تیرا مذہب مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

ابن الفارض کی نشو ونما اس وقت ہوئی جب قاہرہ میں ایوبیوں کی حکومت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگوں کے ذہنی میلان اور خیالات الگ الگ نوعیت کے تھے۔ ایک فضا تصوف کی تھی اور معاشرے میں بڑی تعداد میں خلقت تصوف کے دامن میں پناہ گزیں تھی، اسی کے ساتھ ایک دوسری لہر تھی۔ جو آوارگی اور فسق وفجور کی لہر تھی۔ اس معاشرے میں اخلاقی بندشیں بہت کمزور ہوگئیں تھی۔ جذبات وخواہشات کا غلبہ بہت بڑھ گیا تھا اور اس لہر کے پروردہ لوگ شراب اور منشیات کے عادی ہوگئے تھے۔ گویا ملک میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ تھے خدائے مہربان اور رحمٰن کی خوشنودی چاہتے تھے اور دوسرے وہ تھے جو شیطان کی تابعداری میں لگے ہوئے تھے۔ ابن الفارض نے اپنے دینی ماحول اور تربیت کی وجہ سے نیکی شرافت اور عبادت کا ماحول اختیار کیا۔ اس کی شاعری

میں تصوف کے رمز واشارات موجود ہیں۔تصوف اور مقامات تصوف اور سلوک ومعرفت اور احوال ومقامات کا ذکر اس کی شاعری میں ملتا ہے۔اس نے شراب کا بھی تذکرہ کیا ہے لیکن یہاں شراب سے مراد شراب معرفت ہے اور اس کی اس طرح کی شاعری اس شعر کی مصداق ہے ۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر

ابن الفارض کی شاعری فنی اعتبار سے بڑی شاعری ہے۔اس کی شاعری میں معانی وبدیع اور طباق، جناس اور بلاغت کی دوسری صنعتوں کا استعمال بہت ہے۔اس کا دیوان مکمل طور پر شائع ہوگیا ہے اور اس کے دیوان کا منظوم انگریزی ترجمہ بھی موجود ہے۔اس کے عربی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

صفاء ولا ماء ولطف ولا هواء
ونور ولانار وروح ولاجسم
تقدم كل الكائنات حديثها
قديما ولاشكل هناك ولارسم
وقالوا شربت الاثم كلا وانما
شربت التى فى تركها عندى الاثم
فلا عيش فى الدنيا لمن عاش صاحيا
ومن لم يمت سكرا بها فاته الحزم
على نفسه فليبك من ضاع عمره
فليس له فيها نصيب ولا سهم

ترجمہ: نہ موسم صاف ہے اور نہ پانی میسر ہے اور نہ ہوا پر لطف ہے نہ کہیں روشنی ہے اور نہ حرارت نہ روح ہے نہ کوئی جسم ۔کائنات نے بہت پہلے اپنے خزانے سب کے سب اگل دیے اب نہ کوئی شکل نئی ہے اور نہ کوئی نشانی باقی ہے۔ ہمارے نصیحت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ تم نے شراب پی لی یہ بڑے گناہ کا کام کیا۔ یہ وعظ ونصیحت غلط ہے۔ میں جو شراب پی ہے۔ اس کا پینا نہیں بلکہ نہ پینا گناہ ہے۔اس دنیا میں جو شخص ہوش وحواس کے

ساتھ زندہ رہا تو یہ کوئی زندگی نہیں اور جو شخص سکر و سرور کی حالت میں نہ مرا
تو وہ عقل و آگاہی سے بیگانہ ہے۔ ایسا شخص جتنا چاہے اپنے آپ پر رو لے
کہ ساری عمر ضائع ہوگئی اور زندگی سے اس کو کوئی نصیب اور حصہ نہیں ملا۔

محمود سامی بارودی (1839 تا 1904)

محمود سامی بارودی عربی شاعری کا دور جدید کا مجدد تصور کیا جاتا ہے اور اس نئے قافلہ کا قافلہ سالار۔ عربی ادب کی تاریخ میں اس کا لقب ''رائد الشعر الحدیث'' ہے۔ اس نے جدید شاعری کو نیا رنگ اور نیا آہنگ عطا کیا۔ اس سے پہلے کا عربی ادب کا جو دور ہے وہ ترکی دور کہلاتا ہے اور اس پورے طویل عرصے میں عربی زبان کے تاریخ نگاروں کے بقول عربی ادب انحطاط اور زوال کا شکار رہا۔ اس پورے دور میں زبان و اسلوب پر صنائع اور بدائع کا غلبہ رہا اور ساری صلاحیتیں قوافی کی تلاش اور علم بدیع کی صنعتوں کے استعمال پر صرف کی جاتی تھیں، سجع اور قافیہ پر ساری ذہانتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی تھیں۔ محمود سامی بارودی کے زمانے سے عربی شاعری اور عربی ادب میں نیا رخ اختیار کیا۔ مصر میں محمد علی کے زمانے سے تعلیمی وفود کا فرانس جانا شروع ہوا اور یہ سلسلہ اسماعیل پاشا کے زمانے میں بھی باقی رہا۔ اس طرح سے فرانسیسی زبان و ادب سے عربوں کو استفادہ کا موقع ملا اور فرانسیسی عہد استعمار کے بعد جب انگریزوں کا غلبہ مصر پر ہوا تو انھوں نے انگریزی زبان کی تعلیم کو اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا۔ چنانچہ عربی ادب کو فرانسیسی ادب اور انگریزی ادب دونوں سے استفادہ کا پورا موقع ملا، اس طرح سے فرانسیسی اور انگریزی ادبیات کے عربی زبان میں ترجمے ہو گئے۔ عربوں میں بہت سے ایسے ادیب ہیں جنھیں فرانسیسی ادب پر پورا عبور حاصل تھا۔ جیسے احمد شوقی۔ حافظ ابراہیم۔ طٰہٰ حسین۔ محمد حسین ہیکل اور توفیق الحکیم۔ اسی طرح سے عرب ادبا اور شعرا میں ایک بڑی جماعت ان لوگوں کی ہے جنھوں نے انگریزی زبان و ادب کے بحر بیکراں سے استفادہ کیا۔ ایسے ادبا و شعرا میں زکی ابو شادی۔ خلیل مطران۔ خلیل جبران۔ میخائیل نعمیہ۔ عباس محمود عقاد۔ عبدالرحمٰن شکری اور عبدالقادر مازنی کے نام نمایاں ہیں۔ اس طرح سے یورپ کی ادبی روایت جدید عربی ادب کی تاریخ میں داخل ہوئی اور نئے موضوعات اور نئے اسالیب بیان اور نئی نظریاتی تحریکیں وجود میں آئیں۔

محمود سامی بارودی نے یورپ کے سفر کیے اور وہاں کی فوجوں کو دیکھا۔ ان کے عسکری تجربات میں اضافہ ہوا، انھوں نے میدان جنگ کا تذکرہ اپنی نظموں میں کیا۔ یہ عربوں کی قدیم عادت تھی کہ میدان جنگ میں رزم آزما ہوتے تھے تو جنگ کے واقعات اور بہادری کے قصے اپنی نظموں میں بیان کرتے تھے۔ چنانچہ ابوتمام کی کتاب الحماسہ میں اس طرح کی نظمیں بہت ملیں گی۔ بارودی نے بھی جنگوں کا تذکرہ اور اپنے مختلف اسفار کا تذکرہ اپنی نظموں میں کیا ہے۔ وہ عربی زبان کے علاوہ ترکی اور فارسی اور انگریزی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ بارودی نے عربی شاعری کے قدیم انداز کو باقی رکھا ہے۔ لیکن نئے موضوعات۔ نئے رجحانات اور سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ بارودی کے اشعار میں کلاسیکیت ہے اور عربی شاعری کا پورا جلال و جمال موجود ہے، جدید عربی شاعری کا ان کو نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بارودی نے کئی ملکوں کے سفر کیے اور سفر میں اشعار نظم کیے جب وہ سری لنکا گئے تو وہاں جو اشعار کہے وہ طویل ہیں ان میں سے چند پیش کیے جاتے ہیں۔

علی طلاب العز من مستقره ولا ذنب لی ان عارضنی المقادیر
فما کل محلول العریکه خائب ولا کل محبوکة التریکة ظافر
فماذا عسی الاعداء ان یتقولوا علّی وعرضی ناصح الجیب وافر
فلی فی مراد الفضل خیر مغبة اذا شان حیا بالخیانة ذاکر

ترجمہ: آدمی عزت تلاش کرتا ہے اپنے مقام پر اور میرا کوئی گناہ نہیں اگر تقدیر نے میری مخالفت کی۔ (یعنی شاعر قاہرہ سے جلاوطن کر کے سری لنکا بھیج دیا گیا تھا) ہر کمزور طبیعت والا ناکام نہیں ہوتا۔ اسی طرح طاقت والے کے لیے کامیابی یقینی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دشمن میرے بارے میں جھوٹی باتیں گڑھ لیں اور جھوٹ پھیلائیں لیکن میری عزت کو داغدار نہیں کر سکتے۔ فضیلت و عزت ہمیں حاصل ہے عیب دار وہ ہے جو خیانت کرے۔

امیر الشعرا احمد شوقی (1869 تا 1932)

عربی زبان کے دور جدید میں جس شاعر کا نام بہت زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہ احمد شوقی

کا نام ہے، ایک ایسے بڑے جلسہ میں جس میں حافظ ابراہیم اور خلیل مطران جیسے بہت بڑے شعرا موجود تھے۔ احمد شوقی کو بالاتفاق امیر الشعرا کا خطاب دیا گیا۔ شوقی کا سارا کلام چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوا ہے اور امیر شکیب ارسلان کے مشورے کے مطابق اس مجموعے کا نام الشوقیات رکھا گیا ہے۔ احمد شوقی عربی زبان کا بہت معروف اور مشہور شاعر ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی اس نے عکاسی کی ہے۔ اس نے فکر وفن کا جادو جگایا ہے اور انسانی زندگی کو آفاقی رنگ میں دیکھا ہے۔ یہ شاعر صرف شاعر نہیں بلکہ ایک عظیم دانشور بھی ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا ہے اور دنیا کی مختلف قوموں اور ملتوں کی تاریخ کا بھی اردو میں اقبال نے جس طرح مسجد قرطبہ کے بارے میں ایک معرکہ آرا نظم کہی ہے اسی طرح شوقی نے بھی اندلس کے تذکرہ میں ایک عظیم اسلامی رزمیہ لکھا ہے۔ یہ بہت طویل نظم اندلس کی سرزمین میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے اور اس کا نام ہے ''العرب وعظماء الاسلام''۔ انھوں نے اندلس کی عظمت اور آثار قدیمہ کے پس منظر میں اسلامی تاریخ کا تذکرہ کیا ہے۔ شوقی نے بہت سے موضوعات پر اشعار کہے ہیں۔ مختلف مناسبات کے علاوہ اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل اور واقعات قلم بند کیے ہیں۔ مصر کی قدیم تاریخ کو بھی انھوں نے زندہ کیا ہے۔ شوقی کی وہ نعت جو اس نے بوصیری کی طویل نظم قصیدۃ البردہ کے انداز پر لکھی ہے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے ایک عالم میں مشہور قصیدہ بردہ کو سامنے رکھ کر اسی بحر اور اسی قافیہ میں نعتیہ نظم کہی ہے اور وہ اپنی نعتیہ نظم میں پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی طرح سے شوقی کی ایک اور معروف نعت ہے جو الہمزۃ النبویہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظم میں بھی شاعر نے اپنی فنی صلاحت کا پورا مظاہرہ کیا ہے۔ الفاظ کا دروبست۔ تراکیب کی دلکشی اور وفور جذبات ہر اعتبار سے یہ نظم جدید عربی شاعری میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نعت کا مطلع اس طرح سے ہے ۔

ولد الهدى والكائنات ضياء
وفم الزمان تبسم وثناء

ترجمہ: ہدایت کا سورج نمودار ہو گیا اور پوری کائنات اس سے روشن ہو گئی
اور زمانے کا چہرہ تبسم وتعریف کا آئینہ دار ہو گیا۔

جدید دور کے عربی شعرا احمد شوقی۔ حافظ ابراہیم اور محمود سامی بارودی خلافت عثمانیہ کے طرفدار تھے۔ ان کے نزدیک عرب ممالک اور عالم اسلام کو اس خلافت سے عزت اور سربلندی حاصل ہوسکتی ہے۔ خلافت ہی کے ذریعہ مسلمانوں نے ایک عظیم طاقت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ مراکش سے لے کر مشرقی یورپ تک ان کی حکومت تھی۔ لیکن عیسائی اور یہود دونوں خلافت عثمانیہ کے شدید مخالف تھے اور ان کے اثرات سے مسلم ادبا، شعرا اور تاریخ نگار بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ جدید عربی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر جگہ یہ پڑھے گا۔ کہ ترکی نے عربوں کو اور عربی ادب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ترکی کے خلاف مغربی طاقتوں کی سازش سے تحریکیں اٹھیں۔ بالآخر وہ وقت آیا کہ مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

احمد شوقی نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ان کے بعض ڈرامے منظوم ہیں اور بعض نثر میں ہیں۔ جس طرح سے شیکسپیئر نے معروف بادشاہوں اور قصوں سے اپنا پلاٹ بنایا ہے اسی طرح سے شوقی نے عنترہ۔ قلوپطرہ۔ لیلیٰ مجنون اور فرعون کے بارے میں ڈرامے لکھے ہیں۔ چونکہ خود شوقی فرانسیسی زبان جانتے تھے اور انھوں نے فرانسیسی زبان کے ڈراموں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے عربی زبان میں ڈرامہ نگاری کی گویا انھوں نے بنیاد رکھی۔

اسماعیل صبری (1854 تا 1923)

احمد شوقی کے معاصر شعرا میں بلکہ ذرا کچھ پہلے دریائے نیل کے کنارے ایک شاعر پروان چڑھا جس کا نام اسماعیل صبری تھا۔ اس نے جدید طرز کے ایک اسکول میں تعلیم پائی۔ لیکن مبدا فیاض نے اس کو شعر و ادب کا ملکہ دیا تھا، ماحول بھی اس کو سازگار ملا۔ ذوق سلیم نے بھی کچھ مدد کی اور انھوں نے دس برس کی عمر میں خدیو اسماعیل کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ عربی زبان و ادب کا ذوق تو انھیں وراثت میں ملا تھا اور ماحول بھی اس کے لیے سازگار ملا تھا۔ جب وہ فرانس گئے اور وہاں سے انھوں نے یونی ورسٹی کی ڈگری حاصل کی اور فرانسیسی ادب سے استفادہ کا پورا موقع ملا۔ واپس آنے کے بعد محکمہ قضا میں ملازم ہوئے اور اعلیٰ عہدے تک پہنچے۔ ان کے شعر و شاعری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ انھوں نے قدیم شاعری کا بھی مطالعہ کیا تھا، فرانسیسی ادب سے بھی استفادہ کیا تھا اور امید، آرزو اور جذبہ ان کے سینہ میں موجزن تھا۔ اس لیے ان کی شاعری اچھی

شاعری کے معیار کی تھی اور دلوں کو متأثر کرتی ہے۔ شعر کہنے میں وہی مشقت برداشت کرتے تھے جو ایک اچھا فن کار کرتا ہے۔ ان کی شاعری ان کے جذبہ دل کی ترجمان ہے۔ انھوں نے محبت، زندگی، موت اور جمال اور حقیقت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اہرام مصر پر جو ان کے اشعار ہیں ان میں سے چند کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

> اے اہرام مصر! تمھارے قدم بے حرکت اور بے خرام ہیں اس لیے دریائے نیل کے پانی کے قریب مت جانا۔ اس لیے کہ تم بے عمل ہو اور بے حرکت اور دریائے نیل کا پانی سست اور بے حرکت لوگوں کے لیے نہیں بنایا گیا ہے۔ اسلاف نے ایسی حیرت انگیز عمارتیں تعمیر کیں کہ جن کے آگے سر عقیدت سے جھک جاتا ہے اور ان کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب وہ کسی کام پر لگتے اور سرگرم عمل ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جن کام کر رہے ہیں۔ اہرام مصر کو دیکھنے کے لیے روئے زمین کے گوشے گوشے سے سیاح آتے ہیں اور انھیں حیرت ہوتی ہے کہ فانی انسانوں نے لافانی عمارتیں کیسے تیار کر ڈالی۔ کہاں ہیں وہ عظیم لوگ جنھوں نے اپنی سیرتوں کو پتھروں پر منقش کر دیا ہے اور تمام بادشاہوں کو کمتر بنا دیا ہے۔

محمد حافظ ابراہیم (1870 تا 1932)

محمد حافظ ابراہیم عربی زبان کے جدید دور کے نمایاں شاعر ہیں اور عربی زبان و ادب کا جدید دور نپولین کے مصر پر حملے سے شروع ہوتا ہے۔ حافظ ابراہیم کے والد کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے ماموں محمد آفندی نیازی نے ان کی پرورش اور تربیت کی۔ پہلے ان کو مکتب میں داخل کیا گیا۔ پھر مدرسہ میں وہ پڑھتے رہے۔ اس کے بعد ان کے ماموں محمد آفندی کا طنطا میں تبادلہ ہو گیا۔ حافظ ابراہیم بھی طنطا چلے گئے۔ حافظ ابراہیم کا ذوق شعری بچپن ہی سے واضح ہو گیا تھا اور انھوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی نظمیں لکھیں۔ انھوں نے فوجی اسکول میں داخلہ لیا، فارغ ہونے کے بعد فوج میں ملازمت کی۔ پھر وزارت داخلہ میں منتقل ہو گئے۔ پھر ان کا

تبادلہ سوڈان ہوگیا۔ اس وقت سوڈان کے گورنر لارڈ کرومر تھے۔ مہدی سوڈانی کی بغاوت کے وقت حافظ ابراہیم انگریزوں کی طرف تھے جنگ لڑ رہے تھے لیکن ان کا دل ایک شاعر کا دل تھا۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک نظم کہی۔ اور اسی طرح حافظ ابراہیم کے تعلقات شیخ محمد عبدہ سے بھی تھے اور جب شیخ محمد عبدہ مصر کے مفتی بنے تو حافظ ابراہیم نے ایک قصیدہ ان کی شان میں کہا۔ چونکہ شیخ محمد عبدہ کے تعلقات انگریزوں سے اچھے تھے اس لیے حافظ ابراہیم نے لورڈ کرامر کے لیے بھی ایک قصیدہ کہا۔

حافظ ابراہیم عہد جدید کا بڑا عربی شاعر ہے، اس کی شاعری میں موسیقیت ہے۔ نظموں کی بحر رواں اور اس کی شاعری ترنم ریز ہے، انھوں نے سیاسی اور سماجی مسائل پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ شاعر کا ہاتھ مصری قوم کے نبض پر ہے۔ انھوں ایک طرح عربی شاعری کی کلاسیکی روایتوں کو بھی باقی رکھا ہے اور اسی کے ساتھ نئی زندگی اور نئی قدروں سے اغماض نہیں کیا ہے۔ انھوں نے عثمانی خلافت کی پورے طور پر حمایت کی اور خلیفہ کی شان میں قصائد بھی کہے۔ وہ خلافت کو اسلام کی عظمت کا علم اور نشان سمجھتے تھے، چونکہ وہ شاعر اسلام بھی تھے اس لیے اسلامی مسائل پر بھی انھوں نے لب کشائی کی ہے۔ اس طرح ان کی فکر میں اسلامی فکر کی جلوہ گری موجود ہے۔ انھوں نے اپنے استاذ شیخ محمد عبدہ کا مرثیہ لکھا ہے اور اس میں اسلامی افکار کی ترجمانی کی ہے۔ حضرت عمرؓ کی شان میں بھی انھوں نے طویل قصیدہ لکھا ہے اور ان کی عظمت اور عبقریت سے مصری قوم کو واقف کرایا ہے۔

حافظ ابراہیم مصر کے عاشق ہیں اور مصری قوم کی ترجمانی ان کی شاعری میں موجود ہے، اسی لیے شاعر النیل کا ان کو لقب دیا گیا تھا۔ حافظ ابراہیم غزل کے بھی شاعر ہیں۔ ان کے یہاں محبت کے جذبات کی فراوانی ہے۔ شوقی بہت بڑے شاعر تھے لیکن حافظ ابراہیم کی غزلیں زیادہ بہتر اور برتر ہیں۔ حافظ ابراہیم کے اشعار میں اور بحروں میں موسیقیت اور ترنم ہے۔ وہ مصری سماج کے ترجمان ہیں۔

ابوالقاسم الشابی (1909 تا 1934)

ابوالقاسم الشابی جدید دور کے عربی شعرا میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ بیش تر

عہد جدید کے عربی شعرا مصر و شام، عراق اور لبنان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس شاعر کا تعلق بلاد المغرب یعنی تیونس سے ہے۔ اس نے تیونس کے مشہور جامعہ زیتونیہ سے تعلیم حاصل کی اور پھر اس نے ایل ایل بی کی بھی ڈگری لی۔ قدیم عربی ادب کا مطالعہ بہت گہرائی کے ساتھ کیا اور جدید دور میں مہجری ادب کے ادبا و شعرا کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اس لیے اس کی شاعری میں تجدد کا رنگ اور فرانسیسی استعمار کے خلاف بغاوت کا آہنگ موجود ہے۔ اس کی شاعری میں مسلسل ربط اور تسلسل ہے اور سادگی کے ساتھ کلکاری ہے اور چشمے کی سی روانی ہے اور پھر نئے انداز فکر کی ترجمانی ہے۔ اس شاعر کی شاعری اتنی سبک رواں اور مترنم ہے کہ بے ساختہ زبانوں پر آسانی کے ساتھ آجاتی ہے، اس کی مقبولیت کا راز یہی ہے۔ اس شاعر کا انتقال کم عمری میں ہوا۔ عمر مختصر کے باوجود اس کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف طویل نظم کہی ہے۔ جس کا نام ہے ''طغاۃ العالم''۔ اس نظم کا ایک شعر یہ ہے ؎

الا ایھا الظالم المستبد
حبیب الظلام عدو الحیاۃ

اس شعر اور نظم کے دوسرے اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

اے ظلم و زیادتی کرنے والے تاریکی کے دوست اور دشمن زندگی۔ تیرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور کمزور درجہ کی مصیبت زدہ عورتوں تک تیرا دست زبردست پہنچنے لگا ہے۔ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلی کو دیکھ جو خون سے رنگین ہے۔ مغرب کا یہ شاعر طاہر و مقدس ہے۔ جس کو تو نے اپنے وجود کثیف سے بے حال بنا رکھا ہے اور تو نے اس کی سرزمین پر غم کے کانٹے بوئے ہیں۔ چلو لیکن آہستہ آہستہ تمھیں جو موسم بہار اور فضائے خوشگوار سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ہے تو اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ ان کے پیچھے اندھیرے کی ہولناکیاں ہیں اور بادصرصر ہے اور رعد و برق ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ تم نے ایسی راکھ کو کریدا ہے جو انگاروں سے بھری ہوئی ہے اور جو شخص بھی کانٹوں کو بوئے گا تو اس کے ہاتھ زخمی ہوں گے۔ ذرا تم اپنا جائزہ لو کہ تم نے کتنے

معصوم انسانوں کے سر قلم کیے ہیں اور آرزوؤں کے پھولوں کو مسلا ہے۔تم
نے پوری سرزمین کو خون سے رنگین کیا ہے اور لوگوں کے آنکھوں میں آنسو
ہیں اور تم اس کے نتیجہ میں اور جرم کے بدلہ میں سزا و عتاب کے سزاوار بنو
گے۔خون کا طوفان آئے گا اور آندھی تمھیں کھا جائے گی۔

ابوالقاسم شابی کے یہاں جدیدیت کے اثرات جلوہ گر ہیں اور ان کی شاعری میں جنگ کی للکار ہے۔شابی کی شاعری وطنیت کے جذبات سے لبریز ہے اور اس میں جوش و جذبہ کی فراوانی ہے۔زبان دلکش ہے۔بحریں مترنم ہیں اسی لیے اس کے باوجود کہ شاعر عربی ادب کے مرکز سے دور تیونس میں پروان چڑھتا ہے۔اس کی شاعری کسی سے کم نہیں ہے اور اسے عوام وخواص کی مقبولیت حاصل ہے۔

جمیل صدقی زہاوی (1863 تا 1936)

شاعر جمیل صدقی زہاوی کے والد کا نام محمد فیضی تھا۔وہ ایک معزز کرد خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بغداد کے مفتی تھے۔زہاوی کے نسبت کا تعلق ایک شہر زہاء سے ہے۔جو ایران میں کرمان کے علاقے میں واقع ہے۔زہاوی کے والد چونکہ ایک عالم دین اور مفتی تھے اس لیے زہاوی نے بھی علوم اسلامیہ اور ادب میں تبحر حاصل کیا۔چونکہ ان کا خاندانی تعلق ایران سے بھی تھا اس لیے عربی کے ساتھ ان کو فارسی بھی آتی تھی، وہ دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ان کو شروع سے اچھی ملازمتیں ملیں۔وہ وزارت قانون میں بھی ملازم ہوئے اور سرکاری اخبار الزوراء کے ایڈیٹر بھی ہوئے۔انھوں نے کئی ملکوں کے سفر کیے اور جہاں جہاں گئے وہاں کے ادبا اور شعرا سے ملاقاتیں کیں۔استنبول میں خلیفہ عبدالحمید نے ان کو یمن بھیج دیا۔انھوں نے وہاں اچھے کام کیے۔جس کی بنا پر ان کو مجیدی تمغہ عطا ہوا۔پھر وہ بغداد لوٹ آئے اور انھوں نے وہابی تحریک کے خلاف ''الفجر الصادق'' کے نام سے کتاب لکھی۔وہ فلسفہ اسلامیہ کے پروفیسر ہو گئے پھر جامعہ دارالفنون میں ادب کے استاذ مقرر ہوئے۔وہ اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصنف بھی تھے۔انھوں نے سائنس پر بھی کتابیں لکھی ہیں اور فلسفہ سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔

ان کی شاعری میں نئے رجحانات کا عکس نظر آتا ہے، وہ روایت پرستی کے مخالف ہیں۔

انھوں نے اپنے اشعار سے ادب کا ذوق اور علم وفضل کا شوق پیدا کیا۔ ان کی حیثیت ایک انقلابی شاعر کی ہے۔ جو معاشرے میں سیاسی زندگی میں انقلاب چاہتا تھا۔ وہ استبداد اور سامراجی نظام کے شدید مخالف تھے۔ اس موضوع پر ان کی ایک نظم ہے۔ جس کا نام ہے ''الثورۃ فی الجحیم''، یعنی جہنم میں انقلاب۔ اس رزمیہ میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ اہل جہنم نے شاعر سے کہا تم لوگ تو بڑے بڑے سائنس داں فلسفی اور دانشور ہو مگر تمھارے گروہ کے بیشتر لوگ جہنم میں سزائیں بھگت رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں جنت والوں پر نظر ڈالو وہاں کے لوگ سادہ اور عوامی حیثیت کے مالک ہیں۔ وہاں تم جیسے دانشور اور فلسفی نہیں ہیں۔ اب جنت پر قبضہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اٹھو اور جنت پر حملہ کردو اور چونکہ جہنم والوں کی ادبی قوت زیادہ ہے اس لیے وہ جنت پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ زہاوی کے اس نظم پر ہنگامہ ہوگیا اور خوب شور مچا۔ بازار سے لے کر دربار تک ہر جگہ اس کے تذکرے ہوئے۔ ہر مجلس اور ہر محفل میں اس کا تذکرہ ہوا۔ بادشاہ نے زہاوی کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے یہ نظم کیونکہی ہے تو زہاوی نے جواب دیا کہ حضور! دنیا میں اور اپنے ملک میں تو کوئی انقلاب آنہیں سکتا۔ اس لیے مجبوراً ہم نے جہنم میں انقلاب برپا کردیا۔ بادشاہ مسکرا کر چپ ہوگیا۔

شاعر نے اپنا ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ جس میں اس کی نظمیں بھی ہیں اور رباعیات بھی ہیں اس کے کلام میں جدید رجحانات کی ترجمانی ہے۔ اس کے سارے کلام کو جمع کیا گیا۔ تو آٹھ جلدوں میں مکمل ہوا۔ شاعر ایک بڑی عظمت کا حامل ہے۔ اقتدار وقت نے بہت سے ادبا اور علما کو قتل کروادیا۔ دار ورسن کا سلسلہ بہت طویل ہوگیا تھا۔ اس صورت حال پر زہاوی نے علی الاعواد کے نام سے ایک دردناک نظم کہی ہے۔

علی کل عود صاحب وخلیل
وفی کل بیت رنة وعویل
وفی کل عین عبرة مهراقة
وفی کل صدر عبرة وغلیل
کأن وجوه القوم فوق جذوعهم
نجوم سماء فی الصباح افول

كـأن الـجـذوع الـقـاتـمـات مـنـابـر
عـلـت خـطـبـاء عـود هـن تـقـول

ترجمہ: ہر فراز دار پر کوئی ہمدم اور دوست لٹکتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ ظلم اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہر گھر سے آہ وبکا کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہر آنکھ سے اشکوں کی ندیاں رواں ہیں اور ہر سینہ عبرت کی آماجگاہ ہے اور سوزش سے معمور ہے۔ عمائدین قوم کو تختہ دار پر لٹکایا جارہا ہے۔ اس طرح جیسے کہ آسمان کے ستارے صبح کو غروب ہوتے ہیں۔ یہ دار ورسن اور ان کی لکڑیاں گویا ممبر مقدس ہے۔ جہاں سے علما اپنا خطبہ پیش کرتے ہیں۔

معروف الرصافی (1875 تا 1945)

معروف رصافی بغداد کے ایک محلّہ رصافہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکہ میں ہوئی۔ پھر اسکول میں داخلہ لیا۔ لیکن تعلیم اسکول کی مکمل نہ ہوسکی۔ اس لیے قدیم انداز تعلیم کی طرف لوٹ آئے اور شیخ محمد شکری آلوسی سے علوم عربیہ اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اسکول میں بعد میں استاد بھی بن گئے اور پھر عربی ادب کے رسالوں میں ان کے مقالات چھپنے لگے۔ ان کو ترکی اور عربی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ترکی میں کمال اتاترک کی حمایت کی، سلطان عبدالحمید کے خلاف دو نظمیں کہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کو آزمائش سے بھی گزرنا پڑا۔ بعد میں وہ مجلّہ سبیل الرشاد کے ایڈیٹر بن گئے اور مدرسہ فرقانیہ میں استاد بھی مقرر ہوئے۔ ان کی شعر گوئی اور ان کی نثر نگاری اور ان کے فکری موضوعات نے ان کو قبولیت کی سند عطا کی۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر بھی بن گئے۔ لیکن اس شاعر نے انگریزوں کے خلاف نظمیں کہنا بند نہیں کیں۔ پہلی جنگ عظیم میں بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور پھر بیت المقدس بھی انگریزوں کے دست تصرف میں آگیا۔ اس موقع پر معروف رصافی نے انگریزوں کی مخالفت کی اور خلافت عثمانیہ کا ساتھ دیا۔ ان کے دواوین اور نثری کتابوں کی تعداد گیارہ ہے۔

معروف رصافی نے جب اپنی ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ فلسطین پر انگریزوں کا قبضہ ہے اور عرب ملکوں میں ان کی سازشوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ان حالات میں معروف رصافی

نے عربوں کو اتحاد کی دعوت دی اور عرب ملکوں کے رہنے والوں کو قیمتی نصیحتیں کیں۔ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا نام ہے ''الی الأمۃ العربیۃ''۔اس کے چند اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

اے امت عربیہ! وہ وقت سعید کب آئے گا جب تمھارے گھر پر صبح جلوہ فشاں ہوگی اور رات کی تاریکی کا جنازہ نکلے گا اور تمھارے دماغوں سے غفلت ونسیان کا سایہ ختم ہوگا۔تمھاری کوششیں تمھاری عزت کے سرمایہ پر دلالت کرتی ہیں۔اسی لیے تمھیں ملامت کرنے والا خاموش ہوجاتا ہے۔

عبدالرحمٰن شکری (1886 تا 1958)

عبدالرحمٰن شکری عہد جدید کے بہت بڑے شاعر ہیں۔انھوں عبدالقادر مازنی اور عباس محمود عقاد سے مل کر ایک پوری تحریک الدیوان کے نام سے برپا کی۔یہ عربی ادب کا ایک پورا اسکول اور مکتب فکر ہے،اس اسکول کے ادبا اور شعرا انگریزی زبان وادب سے استفادہ کے لیے بہت مشہور ہیں۔عبدالرحمٰن شکری کے سات دیوان شائع ہوئے۔شکری نے اپنے کلام میں زندگی اور اپنے زمانے کی پوری تصویر پیش کی،اپنے فن کی عظمت کا ثبوت پیش کیا۔لیکن ہوا یہ کہ عبدالقادر مازنی نے عبدالرحمٰن شکری پر کتاب الدیوان میں سخت تنقید کی،پھر عبدالرحمٰن شکری نے اس تنقید کا جواب دیا اور اس تنقید در تنقید کے نتیجہ میں مازنی اور شکری دونوں نے شاعری سے دست برداری اختیار کی۔ڈاکٹر شوقی ضیف نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جدید عربی شاعری کا عظیم نقصان ہے اس لیے کہ شعرا کی صف میں یہ دونوں شاعر مغربی ادب سے اور مغربی ادبی تحریکات سے اور تمام جدید رجحانات سے پورے طور پر واقف تھے۔شکری کا پہلا دیوان چھپا تو اس پر عباس محمود عقاد نے مقدمہ میں یہ لکھا کہ عبدالرحمٰن شکری ایک عبقری شاعر ہے اور عبقری شاعر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ نئے معانی اور خیالات کے سوتے اس چشمہ دل سے رواں ہوتے ہیں۔لیکن جو شاعر اپنے دل کے بجائے صرف اپنے ماحول کا ترجمان ہو تو وہ اس درجہ کا حقیقی شاعر نہیں ہوتا جس درجہ کا دل کا اور جذبہ کا شاعر ہوتا ہے۔بہترین شاعری وہ ہے جو انسان کے جذبات کو مخاطب کرے اور دل کے تاروں کو چھیڑ دے۔عبدالرحمٰن شکری نے ایک نظم زخمی مجاہد (المجاہد الجریح) کے نام سے لکھی ہے۔اس کے کچھ اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے:

زندگی حقیقت میں ایک میدان جنگ ہے اور جینا ایک جہاد ہے، زندگی ایک بیداری اور شعور کا نام ہے۔ مجھے شکایت نہیں ہے کہ میں نے زندگی کا کڑوا گھونٹ پیا ہے کاش کہ وہ زندگی ایک بار پھر لوٹ آتی۔ جس میں پینے والے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ انسان ہر روز قتل ہوتا ہے۔ البتہ جنگ میں وہ تلوار سے مارا جاتا ہے اور یہ تلوار زنگ آلود بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے زندگی کے میدان جنگ میں تلوار کی دھار کی حفاظت کرنی چاہیے۔ زندگی عقل مندوں کے لیے کوشش کا میدان ہے۔ جہاں تمناؤں کے پھول اور پھل حاصل کیے جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں گھبرا رہا ہوں۔ لیکن میرے لیے میرے اپنے عزائم ہیں۔ جن کی بلندیوں تک میں پہنچنا چاہتا ہوں۔

عمر وابو ریشہ (1910 تا 1944)

عمر وابو ریشہ خاندانی اعتبار سے سرزمین شام اور شہر حلب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش فلسطین میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی عمر کے مختلف حصے شام سعودی عرب اور لبنان میں گزارے۔ ان کی علمی ثقافت اتنی ممتاز تھی کہ انھیں ملک شام کی طرف سے امریکہ میں سفیر مقرر کیا گیا۔ وہ برازیل اور آسٹریلیا کے علاوہ ہندوستان میں بھی سفیر رہے۔ لیکن اپنے عہدے کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کو بھی انھوں نے باقی رکھا۔ انھوں نے فلسطین کے سلسلہ میں امت اسلامیہ کو مخاطب کیا ہے اور اپنے اشعار میں یہ کہا ہے:

ترجمہ: اے میری امت مسلمہ! قوموں کے درمیان تیرا کوئی مقام و مرتبہ نہیں باقی ہے۔ نہ تلوار نہ ہتھیار اور نہ کتاب و قلم۔ میں تجھ سے ملتا ہوں اس حال میں ملتا ہوں کہ گذشتہ ہزیمتوں کی شرم سے میری گردن جھکی رہتی ہے۔ دل ہے کہ درد سے چور ہے اور آنسو رواں ہیں۔ امت مسلمہ کے ملکوں کے جھنڈے سرنگوں ہیں۔ نہ کوئی اچھا رہنما اور نہ ان کا کوئی قائد۔ یہ امت اپنی ہزیمتوں کا بدلہ بھی نہیں لے سکتی ہے۔ زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے ہیں اور اسرائیل نے اپنا علم اسلام کے حرم قدسی میں نصب کر دیا ہے۔

عمر وابو ریشہ کے پسندیدہ شاعر بحتری اور ابو تمام تھے اور دور جدید کے شعرا میں وہ احمد

شوقی اور حافظ ابراہیم کے قائل اور معترف تھے۔ جب انھوں نے انگلستان کا سفر کیا اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تو ان کی افکار کی دنیا میں ایک نیا تموج پیدا ہوا۔ ان کی قوت متخیلہ زیادہ بہتر ہوگئی، انھوں نے بہت سی نظمیں رمزیاتی انداز میں کہیں۔ ان کی شاعری میں خوشی اور غم۔ امید اور ناامیدی، محرومی اور حزن وملال ان سب کے جلوے موجود ہیں۔ فرانسیسی استعمار کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور استعمار کے خلاف ان کے دل میں نفرت پیدا ہوئی اس کا اظہار ان کے کلام میں جابہ جا ملتا ہے۔

احمد زکی ابوشادی (1892 تا 1955)

زکی ابوشادی ایک بڑے شاعر۔ نقاد۔ دانشور اور مفکر تھے۔ عربی شاعری اور عربی تنقید دونوں میدان میں انھوں نے ناقابل فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔ انگریزی ادب سے جن شاعروں نے استفادہ کیا ہے۔ ان میں زکی ابوشادی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے انگریزی سے صرف استفادہ نہیں کیا بلکہ انگریزی سے استفادہ کی ایک پوری تحریک چلائی اور اس تحریک کا ترجمان رسالہ اپولو تھا۔ اس رسالہ میں انگریزی اور فرانسیسی ادب کے ترجمے شائع ہوتے تھے۔ ابوشادی نے دس سال کا عرصہ لندن میں گزارا تھا، وہاں سے آنے کے بعد ان کا پہلا دیوان نداء الفجر کے نام 1912 میں شائع ہوا۔ یہ اپنے پیشے کے لحاظ سے طبیب تھے اور میڈیکل کی ڈگری انھوں نے لندن سے حاصل کی تھی۔ شہد کی مکھی اور شہد کے اقسام پر انھیں عالمانہ اور محققانہ عبور تھا، اس موضوع پر وہ انگریزی میں ایک رسالہ نکالتے تھے (The Bee World) سات سال تک مسلسل یہ رسالہ نکلتا رہا۔ انھوں نے بحیثیت طبیب کے بھی خدمات انجام دی۔ لیکن ادب کے میدان میں جمعیت اپولو کی تاسیس ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے یہ انجمن 1936 میں قائم کی تھی۔ انجمن کے صدر احمد شوقی تھے اور نائب صدر خلیل مطران اور احمد محرم تھے۔ خود احمد زکی ابوشادی اس کے سکریٹری متعین ہوئے تھے، اس انجمن کے اہم ممبروں میں ابراہیم ناجی۔ کامل کیلانی اور احمد شائب۔ وغیرہ کا نام تھا۔ احمد شوقی کے انتقال کے بعد خلیل مطران کو اپولو کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ اس تحریک سے قبل تحریک نہیں تھی۔ اس میں تمام مکاتب فکر کے لوگ شامل تھے۔ احمد زکی ابوشادی رومانی ادب کے ممتاز شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اس تحریک کا رسالہ اپولو

نکلتا تھا اس میں تمام مقالات اور بحثیں اور تنقیدی مضامین صرف شاعری کے بارے میں شائع کیے جاتے تھے۔ اس میں فرانسیسی اور انگریزی زبان کے ترجمے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ اس میں یورپ کے معروف شعرا کی نظموں کے ترجمے شائع کیے گئے۔ جدید عربی ادب کو مغربی ادب سے قریب کرنے میں اپولو تحریک کو بڑا دخل حاصل ہے۔ ایک ہی وقت میں عرب دنیا میں دو ادبی تحریکیں اٹھیں تھیں۔ ایک عباس محمود عقاد اور عبدالقادر مازنی اور عبدالرحمٰن شکری کی تحریک الدیوان تھی اور دوسری احمد زکی ابوشادی کی تحریک اپولو تھی۔ ان دونوں تحریکوں نے عرب شعرا کو ادب کی نئی قدروں سے روشناس کیا۔ ان دونوں تحریکوں کی وجہ سے عربی شاعری عربی تنقید، ناول اور افسانے کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ اپولو تحریک بڑی حد تک جدید رومانی ادب کی علم بردار تھی۔ اس کے مقابلہ میں عباس محمود عقاد نے اپنی تحریک میں واقعیت اور حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی، انھوں نے رومانیت سے اپنا دامن بچایا۔ جدید عربی ادب کی تاریخ میں بہت سی ادبی تحریکیں رونما ہوئیں ایک تحریک مہجری ادب کی تھی جس کا مرکز ثقل امریکہ کی سرزمین تھی اور جبران خلیل جبران اس کے پیشوا تھے۔ مہجری ادبا نے اپنی عربی تحریک کے لیے الرابطۃ القلمیہ کے نام سے ایک مجلّہ نکالا تھا۔ یہ تحریک بھی قدامت پسندی کے خلاف تھی۔ لیکن اس تحریک نے حدود سے تجاوز کیا۔ عربی زبان۔ عربی گرامر اور اظہار کے معتبر طریقوں سے بغاوت اختیار کی گئی۔ اسی لیے طٰہٰ حسین جیسے معتبر ادیب اور ناقد نے مہجری ادب اور عربی قواعد سے بغاوت پر سخت گرفت کی۔ یہاں زکی ابوشادی کے بعض اشعار کا اردو ترجمہ پیش ہے:

میں پیاسا ہوں اور میری طرح بیشمار انسان ہیں جو پیاس سے بیتاب ہیں۔ اے بادلو آؤ برسو اور اپنی رحمت دکھاؤ، پھر باران رحمت کا ایک جھونکا آیا، پانی کے قطرے جسم پر گرے تو ایسا لگا کہ جیسے سکر و سرور کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ایسے لطیف اور شوق انگیز ماحول میں اے میری محبوبہ تو کہاں ہے۔ آجا کہ میری محبت کی آگ بجھے۔

عبدالوہاب البیاتی (1926 تا 1999)

عبدالوہاب البیاتی عصر حاضر کے معروف و مقبول عراقی شاعر ہیں۔ شاعر ہونے کے

ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ درجہ کے دانشور بھی ہیں۔ وہ عراقی سفارت خانہ اسپین میں ایک عرصہ تک کلچرل ایلچی کے منصب پر کام کرتے رہے، پھر وہ قاہرہ۔ عمان اور مراقش میں بھی سفارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر میں وہ دمشق میں قیام پذیر ہوگئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ صدام حسین کی حکومت کے زمانے میں انھیں سیاسی اہمیت حاصل رہی۔

عبدالوہاب البیاتی کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے پابند عمودی شاعری کو چھوڑ کر کے آزاد شاعری کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ شاعر کے ایک نہیں متعدد دیوان ہیں۔ جن کی تعداد بیس سے بھی زیادہ ہے۔ شاعروں کی صف میں ایسا شاعر کم ہوگا جس کے اتنے سارے دواوین شائع ہوئے ہوں۔ ان کا پہلا دیوان 1950 میں ''ملائکہ وشیاطین'' اور اس کے بعد دوسرا دیوان ''اباریق مہشمہ'' (ٹوٹی ہوئی صراحیاں)۔ عبدالوہاب البیاتی آزاد شاعری کرنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ انھوں ابتدا میں پابند شاعری کی تھی۔ جس کے نمونے ملائکہ و شیاطین میں موجود ہیں اور اس کے بعد آزاد شاعری کا طویل دور ہے۔ ان کے اشعار عراق میں اور عراق سے باہر ادبی زمروں میں بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے الجزائر کی جنگ آزادی کے ایک ہیرو مہدی الجزائری پر ایک نظم لکھی ہے جن کو فرانسیسی ظالموں نے جیل خانے کے اندر قتل کر دیا تھا۔ اس نظم کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

> پس دیوار زنداں۔ ایک چاند چمک رہا ہے۔ اس قید خانہ میں کچھ کبوتر بھی ہیں اور ایک قیدی ہے۔ جس کے پاس مصحف قرآن ہے۔ اس قیدی کی آنکھیں سرخ ہیں۔ وہ سورہ عصر کی تلاوت کر رہا ہے اور اس کے چاروں طرف نور ہی نور ہے۔ وہ قید میں ہے۔ لیکن وہ انسانیت کا معلم ہے۔ اس کے پاس ایک پیغام ہے۔ وہ حیات جاوداں پائے گا۔ وہ انقلاب بردوش ہے اور ہمیشہ انقلاب کے لیے اپنی کوششیں صرف کرے گا اور الجزائر کے اوپر سے ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔

الیاس ابوشبکہ (1903 تا 1947)

الیاس ابوشبکہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعد میں انھوں نے یورپی ممالک کا

سفر کیا اور آخر میں نیویارک میں مقیم ہوئے۔ وہاں مہجری ادب کے شعرا سے ان کا رابطہ ہوا، ان کے والد یوسف ابوشبکہ عیسائی تھے اور بہت متمول انسان تھے۔ مہجری ادب کے زیادہ تر ادبا اور شعرا عیسائی تھے۔ ابتدا میں انھوں نے لبنان اور مصر کے مشہور رسائل اور مجلّات میں لکھنا شروع کیا، اس طرح سے انھوں نے ایک ادیب، صحافی اور پھر ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ ان کو فرانسیسی بھی بہت اچھی آتی تھی۔ انھوں نے کئی فرانسیسی ناول۔ افسانے اور ڈرامے کا عربی میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے خود بھی کہانیاں لکھیں۔ باقات الزہور کے نام سے ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا اور پھر ''القیثارۃ'' ان کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا۔ اس میں کم وبیش اسی (80) قصیدے ہیں۔ 1926 میں اس کی اشاعت منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد ابوشبکہ کا دوسرا شعری مجموعہ ''افاعی الفروس'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس طرح سے مہجری ادبا میں جبران خلیل جبران کی شہرت بہت زیادہ ہوئی اسی طرح سے الیاس ابوشبکہ کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔ ان کا تیسرا شعری مجموعہ ''المریض الصامت'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ 1941 میں ان کا شعری مجموعہ ''الألحان'' کے نام سے شائع ہوا اور پھر نداء القلب'' اور ''غلواء'' کے نام سے ان کی شعری اور غنائی کاوشیں منظر عام پر آئیں۔

الیاس ابوشبکہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ دو عناصر نے حصہ لیا۔ پہلا عنصر عربی ادب کا ہے اور دوسرا عنصر فرانسیسی ادبیات کا ہے۔ انھوں نے عربی ادب کے کلاسیکی شہ پاروں کا مطالعہ کیا تھا اور جدید ادبا اور شعرا میں وہ سب سے زیادہ جبران خلیل جبران سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کے دو شعر بطور مثال درج ہیں۔

تعالی فتاۃ الحب نجتنب الریا

فقد ساد فی الدنیا زیا الظلم والمکر

تعالي ففی عینیك طیف سعادتی

یرافق سیری فی حیاتي الی القبر

ترجمہ: اے دوشیزائے محبت آجا کہ ہم اس ظلم و جبر اور مکر و فساد کی دنیا سے کہیں دور چلے جائیں۔ آجا تا کہ تیری آنکھوں میں موجود میری خوش بختی اور سعادت کی رمق میری رفیق سفر بن کر عمر بھر میری

رہنمائی کرتی رہے۔

ایلیا ابو ماضی (1889 تا 1957)

ایلیا ابو ماضی بھی مہجری شاعر ہے۔ مہجری ادب مجموعہ ہے ان ادبا کے نثر اور شعرا کے کلام کا جو سرزمین یورپ یا سرزمین امریکہ میں کہے گئے ہیں۔ ایلیا ابو ماضی بھی مسیحی خاندان میں پیدا ہوئے۔ پھر وہ لبنان سے اسکندریہ چلے گئے۔ وہاں وہ اپنے ماموں کی دکان میں بیٹھتے۔ دن میں سگریٹ بیچتے اور رات میں صرف ونحو کی کتابوں کا مطالعہ کرتے، دکان میں بھی وہ اکثر مطالعہ میں مصروف رہتے۔ عربی ادب کے مسلسل مطالعے کے نتیجہ میں وہ فصیح عربی لکھنے اور بولنے کے لائق ہو گئے۔ پھر انھوں نے عربی میں شاعری بھی شروع کر دی، ادبی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔ الزہور اور دوسرے مجلّات میں ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ وہ انقلابی شاعر بھی بن گئے اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف شعلے برسانے والے قصیدے کہے جس کی وجہ سے انھیں پس دیوار زنداں بھی جانا پڑا۔ سیاسی شاعری کی وجہ سے ان کے لیے بڑے خطرات پیدا ہو گئے تھے اس لیے ان کے والد نے ان کو امریکہ میں مقیم اپنے بڑے بیٹے مراد کے پاس بھیج دیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1911 میں ''تذکار الماضی'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے ایک قصیدے میں مصر و اہل مصر کی یادوں کا تذکرہ ہے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں۔

لیس الوقوف علی الاطلال من خلقی
ولا البکاء علی مافات من شیمی
لکن مصراً وما نفسی بناسیة
ملکة الشرق ذات النیل والہرم
صرفت شطر الصبا فیہا فما خشیت
نفسی العثار ولا نفسی من الوصم
فی فتیة کالنجوم الزہر أو جہہم
ما فیہم غیر مطبوع علي الکرم

ترجمہ: کھنڈرات پر رک کر رونا میری فطرت نہیں۔ عہد ماضی کی نوحہ خوانی

میری عادت نہیں۔لیکن مشرق کی ملکہ ۔ دریائے نیل اور اہرام کو اپنی گود
میں پالنے والے مصر کو میں یکسر فراموش نہیں کرسکتا۔ جہاں میں نے بچپن کا
ایک حصہ ستاروں کی طرح روشن چہروں کے مالک اخلاق لطیف کے حامل
۔تربیت یافتہ نوجوانوں کے درمیان گزارا، جہاں کبھی بھی مجھے کسی طرح کی
ٹھوکر اور شرم وعار کا خوف لاحق نہیں ہوا۔

1927 میں ''الجداول'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہوا اور اس مجموعے کا مقدمہ جبران خلیل جبران نے لکھا۔ان کے ایک شعری مجموعے کا مقدمہ مشہور مہجری ناقد میخائیل نعیمہ نے لکھا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ ایلیا ابو ماضی کا نام اور کام جدید عربی ادب میں بہت نمایاں ہے اور مہجری ادب میں بحیثیت شاعر ان کی عظمت کا اعتراف عرب دنیا کے ادبا اور شعرا اور ناقدین نے کیا ہے۔ان کے کئی مجموعے منظر عام پر آئے ان کے ایک مجموعے کا نام ''الخمائل'' ہے اور پھر دیوان ایلیا ابو ماضی کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہوا۔جس میں ان کے طویل قصیدے اور فلسفۃ الحیاۃ کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

بدر شاکر السیاب (1926 تا 1964)

بدر شاکر السیاب عراق میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش کی جگہ بصرہ کے قریب ایک تحصیل ہے جس کا نام ابوالخصیب ہے۔بصرہ میں انھوں نے ہائی سکول تک کی تعلیم حاصل کی پھر مدرسہ محمودیہ میں انھوں نے داخلہ لیا۔تعلیم گاہ میں اگر چہ انھوں نے سائنس کو اپنا موضوع منتخب کیا لیکن وہ شاعری بھی کرتے رہے، پھر شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ پھر انھوں نے بغداد کا رخ کیا اور وہاں کی مشہور درسگاہ دارالمعلمین میں داخلہ لیا۔عربی زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی کی طرف بھی پوری توجہ کی اور انھوں نے شیکسپیئر، بائرن، ورڈزورتھ، شیلی، کیٹس اور ایلیٹ جیسے شعرا اور ادبا کو پڑھا۔عربی اور انگریزی کے اہل شعر وادب کے عمیق مطالعے کے بعد انھوں نے عربی میں ترجمہ شدہ فرانسیسی ادبیات کا بھی مطالعہ کیا۔عربی شعر وادب کا ذوق ان کا بہت گہرا تھا اور کلاسیکل شعرا کے سینکڑوں اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ جدید شعرا میں وہ الیاس ابوشبکہ اور علی محمود طٰہٰ سے متاثر ہوئے۔ان کے نظریات اشتراکیت کے

بہت قریب تھے۔ جس کی جھلک ان کے کلام میں ملتی ہے۔ اس لیے سزا کے طور پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ سات ہفتوں کی جیل کے بعد جب وہ باہر آئے تو مالی پریشانیاں دامن گیر ہوگئیں۔ ان کے ایک قدرداں نے اساطیر کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع کیا اور اس سے پہلے ازہار ذابلۃ کے نام سے ایک مجموعہ مصر سے شائع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ''انشودۃ المطر'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا اور بیروت میں اس مجموعے پر انھیں ایک ہزار لبنانی لیرہ کا انعام دیا گیا۔ اس کے بعد بھی ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور ان کی شاعری نے ادبی و شعری حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ ان کا اپنا ایک اسلوب تھا اور اسے جدید اسلوب کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ماں کے انتقال پر اپنے غیر معمولی صدمے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

اماہ
لیتک لم تغیبی
خلف سور من حجار
لا باب فیه لکی ادق
ولا نو افذ فی الجدار
کیف انطلقت بلا وداع
والصغار یولولون
یتراکضون علي الطریق
ویفزعون فیرجعون
ویسائلون اللیل عنک
وهم لعودك فی انتظار
الباب تقرعه الریاح
لعل روحاً منک زار
ہذا الغریب

ہو ابنک السہران یحرقه الحنین
اماه لیتک ترجعین

ترجمہ: اے ماں! کاش تو ہم سے روپوش نہ ہوئی ہوتی وہ بھی پتھر کی ایسی دیواروں کے پیچھے جن میں نہ تو کوئی دروازہ ہے۔ جنھیں ہم کھٹکھٹا سکیں۔ نہیں کوئی کھڑکی جہاں سے جھانک کر تجھے دیکھ سکیں۔ تو الوداع کہے بغیر کیسے چلی گئی۔ تیرے جگر کے ٹکڑے روتے بلبلاتے ہیں۔ تجھے انجانے راستوں پر تلاش کرتے رہتے ہیں اور بے نیل مرام واپس چلے آتے ہیں۔ تیرے بارے میں رات کی تاریکیوں سے سوال کرتے ہیں اور تیری آمد کی امید میں سراپا انتظار بنے رہتے ہیں۔ ہوا جب دروازے پر دستک دیتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ تیری روح ہماری زیارت کے لیے آئی ہے۔ تیری یاد میں شب بھر اکیلے بیدار رہنے والے تیرے بیٹے کو تیری دید کا شوق جینے نہیں دیتا۔ اے ماں! کاش تو ایک بار لوٹ کر آجاتی۔

محمود غنیم (1902 تا 1972)

معروف مصری شاعر محمود غنیم نے مصر کے ایک گاؤں میں ایک کاشتکار گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور گاؤں کے ہرے بھرے سبزہ زاروں میں اور صاف ستھرے ماحول میں نشو ونما پائی۔ گاؤں کے ایک مکتب میں داخلہ لیا، پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر شہر طنطا کے ایک اسکول میں داخلہ لیا اور یہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے لاء کالج میں تعلیم حاصل کی۔ پھر مصر کی مشہور دانشگاہ دارالعلوم کے طالب علم بنے پھر بحیثیت مدرس انھوں نے کام کیا اور 9 سال تک تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ پھر وہ عربی زبان کے مفتش اول (انسپکٹر) کے منصب پر فائز ہوئے لیکن یہ ایسا عجیب وغریب دفتر تھا جہاں ان کے لیے بیٹھنے تک کی جگہ نہ تھی۔ محمود غنیم کا پہلا شعری مجموعہ ''صرخۃ فی واد'' کے نام سے شائع ہوا، مشہور ادیب ابراہیم دسوقی نے اس کا مقدمہ لکھا۔ ان کا دوسرا دیوان ''فی ظلال الثورۃ'' (انقلاب کے زیر سایہ) کے عنوان سے دار المعارف مصر سے شائع ہوا، ان کے اس مجموعے پر بھی انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ انھوں نے منظوم ڈرامے بھی

لکھے۔محمود غنیم ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ نثر نگار اور محقق بھی تھے۔ان کے بہت سے مضامین علمی اور ادبی مجلّات میں شائع ہوئے، پھر ان کے انتقال کے بعد بہت سے شعرا نے ان کے مرثیے لکھے۔محمد عبدالغنی حسن نے اپنے مرثیہ میں لکھا۔

الشعر بعد غنيم
باك حزين المشاعر
جيل الأوائل يمضى
فأين جيل الأواخر
وهل لتلك العقود
الوضاء يا قومِ ذاكر

ترجمہ:محمود غنیم کے بعد شاعری مضمحل اور افسردہ ہے۔پہلی نسل کے لوگ ایک ایک کر کے گزرتے جا رہے ہیں۔آنے والی نسل کہاں ہے۔کیا ان گزرے ہوئے روشن ادوار کو یاد کرنے والے لوگ ابھی باقی ہیں۔

شاعر القروی: رشید سلیم الخوری (1887 تا 1984)

رشید سلیم الخوری کی شہرت ''الشاعر القروی'' کے نام سے بھی ہوئی ہے۔وہ لبنان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔شعر و ادب کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ان کے اساتذہ میں ایک استاذ فیصل وحید شاعر تھے۔ان کی صحبت سے ان کے اندر شعری ذوق پیدا ہوا۔پھر انھوں نے مدرسۃ الفنون الامریکیہ میں داخلہ لیا، پھر مختلف مدارس میں تدریس کا فریضہ انجام دیا۔انھوں نے انگریزی بھی سیکھ لی تھی اور ان کی آواز اور لہجے میں بہت مٹھاس تھی ان کا کلام پسند کیا جانے لگا۔ان کی ابتدائی زندگی مالی پریشانیوں میں گزری اور کئی تجارتی اداروں میں انھوں نے کام کیا۔وہ مختلف ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ رہے اور جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں اپنے قصیدے سناتے تو لوگ مسحور ہو جاتے۔رشید سلیم الخوری کا پہلا دیوان'' الرشیدیات'' کے نام سے 1916 میں شائع ہوا۔اس دیوان میں جو قصیدے ہیں وہ عربی ادب کی دنیا میں مقبول ہوئے۔پھر ان کا دوسرا دیوان ''القرویات'' کے نام سے شائع ہوا۔پھر وہ اپنے

خاندان کے کئی افراد کے ساتھ برازیل چلے گئے۔ مہجری ادب کے مشہور مجلّے ''الرابطہ'' کے وہ ایڈیٹر رہے اور ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ جن میں ایک کا نام ''البواکیر'' اور دوسرے کا نام ''الأعاصیر'' ایک مجموعہ کا نام ''الزمازم'' ہے ایک اور مجموعہ کا نام ''المحافل والمجالس'' ہے۔ ان کے نثری مجموعہ کا نام ''الموجات القصیرۃ'' ہے۔ بعد میں وہ شام منتقل ہوئے اور شام کی حکومت نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ یہاں انھوں نے ''عودۃ الشام'' کے عنوان سے اپنی نظم سنائی۔

حتي م تحسبها اضغاث احلام
سبح لربک وانحر انت فی الشام
لم یأذن الله یا بوق العروبة أن
تقضی الحیاة غریباً بین أعجام

ترجمہ: اپنی واپسی کی آرزو کو تم کب تک پراگندہ خواب سمجھو گے۔ تم اپنے رب کی تسبیح بیان کرو اور قربانی بجالاؤ اور خوش ہو کہ تم اب بلاد شام کے پہلو میں واپس آ گئے ہو۔ اے عربیت کے بگل! اللہ تعالی نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ تم پردیس میں اور عجمیوں کے درمیان غریب الدیار بن کر زندگی کی آخری سانسیں لو۔

نزار قبانی (1923 تا 1998)

جدید عربی شاعری میں جو نام بہت مقبول بھی ہے اور متنازعہ بھی ہے وہ نزار قبانی کا نام ہے۔ نزار قبانی دمشق میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خود اپنی ولادت کا تذکرہ بڑے شاعرانہ انداز میں کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ: ''جس دن میری ولادت ہوئی اسی روز روئے زمین بھی وضع حمل کی حالت میں تھی اور بہار کی رت اپنی سبز و شاداب بازوؤں کو وا کرنے والی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میری ولادت ایسے موسم میں ہوئی تھی جس میں روئے زمین خود اپنے خلاف انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتی ہے اور تمام شجر اپنے بدن سے پرانے پتوں کا لباس اتار پھینکتے ہیں؟ یا میرے نصیب میں یہ بات مقدر کر دی گئی تھی کہ میں تغیر و تبدل کے مہینے مارچ کی طرح تغیر و تبدل کی علامت بنوں گا''۔

نزار قبانی رئیس اور ثروت مند خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ متوسط الحال تھے اور

ان کے والد توفیق قبانی مٹھائی بنا کر بیچتے تھے۔ فرانسیسی استعمار کے خلاف ملک میں جب تحریک اٹھی ان کے گھر میں خفیہ میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ نزار قبانی نے لکھا ہے کہ ان کے والد کو گرافتار کر لیا گیا تھا۔ انھوں نے بھی بچپن میں مٹھائی بنانے اور بیچنے میں اپنے والد کا ہاتھ بٹایا تھا۔ پھر انھوں نے پینٹنگ بھی سیکھی تھی اور میوزک کی تعلیم بھی حاصل کی۔ 18 سال کی عمر میں انھوں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر قانون کی تعلیم کے لیے انھوں نے شام یونی ورسٹی کے لاء کالج میں داخلہ لیا۔ لا کالج سے فراغت کے بعد انھیں شام کی وزارت خارجہ میں ملازمت مل گئی اور وہ مختلف ملکوں میں شامی سفارت خانوں میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے، پھر انھوں نے اپنے آپ کو شعر وسخن کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی اور فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ کیا۔ لیکن نزالہ قبانی کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا تھا۔ جسے ایک دن بہر حال برسر عام آنا تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''قالت لی السمر اء'' کے نام سے شائع ہوا اور اس پہلے شعری مجموعے نے ادبی حلقے کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ عرب ممالک میں واقع ہونے والے واقعات اور حوادث سے بھی متأثر ہوتے رہے۔ لیکن نزار قبانی اصلاً ایک رومانی شاعر تھے اور محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے کلام میں اتنی زیادہ ہوگئی کہ انھیں ''شاعر الحب والمراۃ'' کا خطاب دیا گیا۔ بعض لوگوں نے انھیں ''شاعر الغزل'' کہا۔ بہت سے لوگوں نے ان کی شاعری پر اباحیت اور بے حیائی کا الزام لگایا۔ بعض ناقدین نے لکھا کہ اموی دور کے مشہور رومانی شاعر عمرو بن ابی ربیعہ کے بعد وہ پہلا شاعر ہے جس میں عورت اور جنس کا تذکرہ بہت زیادہ ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے ۔

الحب یا حبیبتی
قصیدة جمیلة مکتوبة علی القمر
الحب مرسوم علی
جمیع أوراق الشجر
الحب منقوش علی
ریش العصافیر وحبات المطر
لکن ای امرأة فی بلدی
اذا احبت رجلاً

ترمی بخمسین حجر

ترجمہ: میری جان! محبت وہ حسین وجمیل قصیدہ ہے جو چاند کے شاندار
مکھڑے پر بھی لکھا ہے۔ درختوں کے پتوں پر جس کے نقوش ثبت ہیں۔
چڑے چڑیوں کے پروں پر اور بارش کے قطرات پر جس کے نشان موجود
ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں جب کوئی عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو اسے
سنگسار کر دیا جاتا ہے۔

نازِک الملائکہ (1923 تا 2007)

عرب دنیا میں نسائی شاعری کی نمائندہ شخصیت نازِک الملائکہ ہے۔ ان کی ولادت بغداد میں ہوئی اور ایسے گھرانے میں ہوئی۔ جہاں شعروشاعری کی قندیل پہلے سے روشن تھی۔ ان کے والد صادق بن جعفر عالم وفاضل انسان تھے اور صرف ونحو میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ دائرۃ معارف الناس کے نام سے انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جو بیس اجزا پر مشتمل ہے۔ نازک الملائکہ کی والدہ سلمی بھی شاعرہ تھیں اور آزدئ نسواں کی علمبردار تھیں۔ اس طرح نازک الملائکہ نے ایسے گھرانے میں تربیت پائی جس کی فضا میں علم وادب کی شمع روشن تھی۔ انھوں نے موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی اور خود اپنی کوشش سے فرانسیسی زبان اور انگریزی زبان سے بھی واقفیت حاصل کی۔ 1953 میں ان کی والدہ کا انتقال ہوا۔ جس نے ان کے پورے وجود کو ہلا کر کے رکھ دیا۔ پھر انھوں نے 1954 میں امریکا کا سفر کیا اور تقابلی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ عراق واپس آنے کے بعد کلیۃ التربیۃ میں بحیثیت مدرس ان کا تقرر ہوا۔ انھوں نے شعبہ عربی میں تدریس کا فریضہ انجام دیا اور صدر شعبہ کا عہدہ بھی سنبھالا۔ نازک الملائکہ کے کئی شعری مجموعے سامنے آئے۔ 1947 میں ''عاشقۃ اللیل'' کے نام ان کا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ پھر ان کا دیوان ''ازھار ذابلۃ'' کے نام سے سامنے آیا۔ عربی زبان میں آزاد شاعری کے دو سب سے بڑے علمبردار تھے۔ ایک بدر شاکر السیاب اور دوسرے نازک الملائکہ۔ ان کے کئی مجموعوں میں شجرۃ القمر اور مأساۃ الحیاۃ واغنیۃ للانسان اہم ہیں۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں۔

كم فى سكون الليل وتحت الظلام
رجعت للماضى وأيامه

أبحث عن حب بين الركام
فلم تصلني غير آلامه
لم يبقى شيء غير حزني المريض
بقية من حبي الذاهب
وذكريات من صباي الغرير
ساخرةَ من وجهي الشاحب

ترجمہ: میں نے رات کی تاریکی میں بارہا اپنے ایام گم گشتہ کی مراجعت کی۔ اپنی محبت کی تلاش وجستجو کی۔ مگر مجھے حزن والم کے سوا کچھ نہ ملا۔ میری محبت میں سے اب حزن والم اور بچپن کی ان یادوں کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ جو اداس چہرے سے تمسخر اور استہزا کر رہی ہیں۔

باب چہارم

عربی ادب کے مشہور نثر نگار

موضوع کا تعارف

دور جاہلی میں عربی شاعری ترقی یافتہ تھی اور معلقات سبعہ میں عربی زبان کے طویل قصائد ملتے ہیں جو آج بھی دنیائے عرب وعجم میں پڑھائے جاتے ہیں۔لیکن عربی نثر بہت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی۔ چند خطبے اور کچھ کاہنوں کی باتیں۔ چند وصایا۔ یہ کل کائنات تھی۔عربی نثر کا ارتقا اسلامی دور کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔خطبات کا سلسلہ شروع ہوا اور مسجدوں میں جمعہ کے خطبے بھی دیے جانے لگے۔ پھر جہاد کے لیے لوگوں کے اندر جوش پیدا کرنے کے لیے پر جوش تقریروں کے نمونے بھی سامنے آتے ہیں، پھر حضور ﷺ نے بادشاہوں کو تبلیغ اسلام کے لیے خطوط لکھے اور مختلف قبائل سے معاہدات کیے۔ یہ تمام تحریریں آج بھی موجود ہیں اور عربی نثر کا نمونہ ہیں۔قرآن مجید جو تھوڑا تھوڑا حضور ﷺ تک نازل ہوتا رہا۔اس کی کوئی مثال عربی ادب کی تاریخ میں نہیں ہے۔ عربوں کو اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز تھا۔قرآن مجید نے ان کو چیلنج دیا کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ قرآن انسانی کلام ہے تو ایک سورہ یا چند آیتیں بھی بنا کر کے لاؤ۔عرب جنھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر

فخر وغرور تھا اور جو اپنے سوا سب کو عجم یعنی گونگا تصور کرتے تھے۔ وہ کوششوں کے باوجود قرآن کی چند آیتوں کی طرح کوئی تحریر تیار کرنے سے قاصر رہے، قرآن نے تو بار بار یہ چیلنج پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ تمام انس وجن مل کر بھی قرآن کی طرح کوئی کتاب تیار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ قرآن کا اپنا ایک اسلوب ہے۔ ہر زمانے میں قرآن کے اسلوب اور بیان سے لوگ متأثر ہوتے رہے ہیں اور ایمان لاتے رہے ہیں۔ قرآن کا اسلوب بالکل جداگانہ ہے۔ یہ نہ روایتی انداز کی نثر ہے اور نہ یہ شاعرانہ کلام ہے۔ خاص طور پر مکی سورہ جس میں قیامت۔ آخرت کے مناظر کا بیان ہے۔ وہ اپنے جلال و جمال کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ وہ سورتیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں۔ چونکہ اس میں شریعت کے احکام نازل ہوئے۔ اس لیے ان کا رنگ اور آہنگ مکی سورتوں کے مقابلہ میں نسبتاً سہل اور سادہ ہے۔

عربی نثر کے اعلیٰ نمونوں میں احادیث نبوی کا بھی شمار ہے۔ یہ حدیثیں جواہر پارے ہیں اور حکمت کے موتی ہیں اور ان کو جوامع الکلم کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے کلمات جن کے اندر معانی اور حکمت کی باتیں بہت زیادہ ہیں۔ احادیث نبوی بلاغت کی جان ہے۔ زبان کی خوبصورتی۔ اظہار کا پرشوکت انداز۔ تراشیدہ ترکیبیں سب اس کے اندر موجود ہیں اور حضور ﷺ نے خود اپنے بارے میں فرمایا تھا۔ کہ انا افصح العرب یعنی میں عربوں میں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔ احادیث نبوی کی فصاحت و بلاغت پر عرب ادبا کا اتفاق ہے۔ لیکن اس کے باوجود احادیث کے ادبی رنگ اور قرآن مجید کے ادبی جلال و جمال میں اتنا زیادہ فرق اور تفاوت ہے۔ کہ دور دور کسی کو یہ شبہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کلام کا منبع اور سرچشمہ ایک ہے۔

خلافت راشدہ کے دور میں خطابت کے فن نے بہت ترقی کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں جو خطبہ دیا تھا اس نے حالات کا رخ بدل دیا۔ آپ نے خلیفہ بننے کے بعد جو خطبہ دیا وہ غیر معمولی ہے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اپنی سحر طراز خطابت میں بہت ممتاز تھے۔ حضرت عمرؓ پابندی سے جمعہ کے خطبات دیتے تھے اور یہ خطبات عربی ادب کے بہترین نمونوں میں شمار کیے جاتے ہیں، حضرت علیؓ جن کی پرورش و پرداخت حضور ﷺ کے دامن تربیت میں ہوئی بہت بڑے ادیب اور شعلہ بیان خطیب تھے۔ ان کے خطبات کا مجموعہ ''نہج البلاغۃ'' آج بھی موجود ہے، یہ

کتاب فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے، اس کتاب کی بے شمار شرحیں لکھی گئی ہیں اور آج بھی پوری دنیا میں یہ کتاب پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔

خلافت راشدہ کے زمانہ میں انشاء اور تحریر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی تمام معاہدات تحریری شکل میں سامنے آتے تھے اور یہ ہونا تھا کیونکہ قرآن میں قلم کی قسم کھائی گئی ہے اور پہلی وحی میں قلم کا تذکرہ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم کی اہمیت کیا ہے۔ عہد اسلامی میں عربی نثر کو بہت فروغ ہوا اور بڑے بڑے ادبا اور نثر نگار پیدا ہوئے۔

سحبان بن وائل (674/45ھ)

یہ شخص عربوں کے قبیلہ ربیعہ کی شاخ وائل سے تعلق رکھتا تھا۔ جب دور اسلام آیا تو اس نے باقاعدہ اسلام قبول کیا اور حضرت معاویہؓ سے اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ خود حضرت معاویہؓ اس کی خطابت سے متاثر تھے۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے سحبان وائل سے کہا کہ تم آج تقریر کرو۔ سحبان نے یہ فرمائش منظور کی اور اس نے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا کہ میرے لیے ایک عصا لاؤ۔ لوگوں نے اس سے کہا جب امیر المومنین امیر معاویہؓ موجود ہیں تو ان کی موجودگی میں تم عصا کیوں مانگ رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور کی پہاڑی پر اللہ کے حضور حاضر ہوئے تھے۔ تو اس وقت ان کے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے ظہر کی نماز کے بعد تقریر شروع کی اور عصر کی اذان تک بے حد پر جوش تقریر کی۔ تقریر سن کر کے امیر معاویہؓ نے کہا تم عربوں کے سب سے بڑے خطیب ہو۔ اس کی تقریر کے کچھ نمونے بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔ احمد حسن زیات نے تاریخ الأدب العربی میں اس کے خطبہ کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

> دنیا عارضی ہے۔ آخرت دار القرار ہے۔ اے لوگو! اپنی عارضی زندگی سے اپنی ابدی زندگی کا سامان کرلو۔ اپنے رازوں کا پردہ فاش نہ کرو۔ اس کے سامنے جس پر کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ دنیا کی محبت اپنے دلوں سے نکال لو۔ اس سے پہلے کہ تمھارے جسم اس دنیا سے نکالے جائیں۔

حجاج بن یوسف (41ھ تا 95ھ)

ابو محمد حجاج بن یوسف ثقفی۔ شہر طائف کا رہنے والا تھا۔ جہاں بنو ثقیف کا قبیلہ آباد تھا۔

اس کی تعلیم و تربیت طائف ہی میں ہوئی، جب بنوامیہ کی حکومت مستحکم ہوگئی اور عبدالملک بن مروان تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس وقت حجاج بن یوسف نے فوج کی ملازمت اختیار کر لی، پھر اپنی قابلیت سے فوج کے ایک حصہ کا کمانڈر بن گیا اور جب عبداللہ بن زبیرؓ سے بنوامیہ کی حکومت برسر جنگ ہوئی۔ تو حجاج بن یوسف کی سربراہی میں مکہ پر حملہ کیا گیا، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اس نے قتل کر دیا۔ خلافت راشدہ کے بعد جب ملوکیت اور موروثی حکومت کی بنا پڑی تو جن لوگوں نے سیاسی نظام کو درست کرنے اور گاڑی کو پھر پٹڑی پر لانے کی کوشش کی تھی ان میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ ایک حسین بن علی اور دوسرے عبداللہ بن زبیرؓ۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی والدہ حضرت اسماء تھیں۔ جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی اور حضرت عائشہ کی حقیقی بہن تھیں۔

حجاج بن یوسف ایک گورنر اور فوجی کمانڈر تھا۔ اس نے بہت سے خطبات دیے۔ وہ بہت بڑا خطیب اور غیر معمولی طور پر زبان آور تھا۔ اس نے اپنے خطبوں میں بنوامیہ کی اطاعت کی دعوت دی اور اختلاف یا بغاوت کرنے والوں کو سخت انجام سے گزارا۔ کوفہ کی جامع مسجد میں اس نے جس طرح عوام کو دھمکی دی ہے اور سرکشی سے ڈرایا ہے۔ وہ خطبہ اس کا شاہکار خطبہ سمجھا جاتا ہے۔ اس خطبہ کے چند جملوں کا اردو ترجمہ پیش ہے:

> اے کوفہ کے باشندو! میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے سامنے ہزاروں ایسے سر ہیں کہ پکی ہوئی کھیتیوں کی طرح ان کو کاٹنے کا موسم آ چکا ہے۔ میں تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ کہ خون کی سرخیوں سے عمامے اور ڈاڑھیاں تر بتر ہیں۔ مجھے یہاں کا گورنر بنایا گیا ہے اور امیرالمؤمنین نے تمام بہادروں اور ہمت رکھنے والوں کے درمیان تمھارے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ میں امیرالمؤمنین کا ایسا تیر ہوں جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے تم ہوشیار ہو جاؤ اگر تم نے ذرا بھی فتنہ انگیزی کی تو پھر تمھاری خیر نہیں۔

حجاج بن یوسف بہت غضب کا مقرر تھا اور فصاحت و بلاغت میں اس کا پایہ بہت بلند تھا اور اس کی تقریروں کے نمونے عربی ادب کے نصاب میں آج بھی شامل ہیں۔

عبدالحمید بن یحییٰ (132ھ)

عبدالحمید بن یحییٰ کی پیدائش شام میں ہوئی۔ اس نے ہشام بن عبدالملک کے غلام سالم سے ادب اور انشاء کی تعلیم حاصل کی۔ مروان بن محمد جب ارمینیہ کا گورنر ہوا تو اس نے عبدالحمید کو اپنا کاتب اور سکریٹری مقرر کیا۔ کاتب اس عہد میں اس شخص کو کہتے تھے جو خطوط اور فرامین کا مسودہ تیار کرتا تھا اور یہ خطوط و فرامین زبان و ادب کا بہت اونچا نمونہ ہوتے تھے۔ عبدالحمید اموی دور کا بہت بڑا ادیب ہے۔ اس نے ادب اور انشاء کے میدان میں اپنا منفرد اسلوب اختیار کیا۔ اس نے جن لوگوں کو خطوط لکھے اور سرکاری فرامین بھیجے ان کے معیار و مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس میں خطوں کی زبان اختیار کی۔ ان مکاتیب میں ابتدا اور انتہا کی بڑی اہمیت ہوتی تھی اور انھیں پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا۔ یہ رسائل فنی اعتبار سے طاقتور اور مؤثر ہوتے تھے اور اس طرح کے دربار کے کاتبوں میں عبدالحمید اپنے اسلوب کے اعتبار سے سب سے زیادہ مشہور و ممتاز ہے۔ ان خطوط کا اتنا اثر ہوتا تھا کہ تاریخ میں مذکور ہے کہ عبدالحمید کاتب نے جب مروان کی طرف سے ابومسلم خراسانی کو خط بھیجا تھا تو اس ڈر سے کہ کہیں وہ اس خط سے متأثر نہ ہو جائے اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ عبدالحمید کاتب کے لکھے ہوئے خطوط کے نمونے تاریخ ادب کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس نے اپنے اہل و عیال کو ایک خط لکھا تھا۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

> پیشک اللہ تعالی نے دنیا کو خوشی اور ناخوشی سے بھر دیا ہے۔ اب یہ دنیا جس کی مددگار ہوتی ہے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور جس کو یہ دنیا اپنے دانتوں سے کاٹتی ہے تو وہ اس کی برائی بیان کرتا ہے۔ دنیا نے ان کو بلندیاں عطا کیں تو ہم بھی مسرور و مطمئن ہوئے لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے۔ دنیا سرکش اور نافرمان ہوگئی ہے اور اس نے ہم سے منھ موڑ لیا ہے۔ یہ سب انقلابات ہیں زمانے کے۔

ابن مقفع (106 تا 142ھ 724 تا 759)

عربی ادب میں دو نام کی بڑی شہرت ہوئی ہے ایک خلیل احمد جو عربی النسب تھا اور دوسرا ابن مقفع جو عجم یعنی ایران کا تھا۔ دونوں ہمعصر تھے ایک بار ملے تو تین دن ایک ساتھ رہے اور

باتیں کرتے رہے بعد میں کسی نے خلیل سے پوچھا کہ ابن مقفع کو کیسا پایا تو اس نے کہا علم زیادہ اور عقل کم۔ ابن مقفع سے پوچھا گیا خلیل کے بارے میں تو اس نے بتایا کہ ان کی عقل ان کے علم پر بھاری ہے۔ ابن مقفع کو فارسی کے ساتھ عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس نے دربار خلافت کے لیے کئی منطق کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ حکمت واخلاق کے موضوع پر فارسی سے دو کتابوں کا ترجمہ کیا ایک الادب الصغیر اور دوسرے الادب الکبیر۔ پھر اس نے کتاب الیتامیٰ کے نام سے ایک اور فارسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے جس کا موضوع حاکم کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ ابن مقفع کو عربی میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی وہ صاحب اسلوب ادیب تھا۔ کتاب کلیلہ ودمنہ فارسی سے اسی کی ترجمہ کی ہوئی کتاب ہے۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں ہے لیکن عربی کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اصل کتاب پیچھے رہ گئی اور فارسی ترجمہ بھی گمنام ہو گیا اور عربی ترجمہ ہی کے ذریعہ دنیا اصل سنسکرت کی کتاب سے واقف ہوئی۔ عربی زبان پر عبور اور ماہرانہ انشا پردازی کی وجہ سے اس کو عباسی خلافت کے دربار میں کاتب یعنی فرمان نویس مقرر کیا گیا اور جو خطوط آتے تھے ان کے جواب لکھوائے جاتے تھے اور خلیفہ کی ایک مختصر تحریر ہوتی تھی جنھیں توقیعات کہا جاتا تھا۔ یہ توقیعات بہت مختصر لیکن ادب اور بلاغت کا شاہکار ہوا کرتے تھے۔ ابن مقفع نے دربار میں توقیعات کی خدمت بھی انجام دی ہے۔ ادیب اور انشا پرداز ہونے کی وجہ سے ابن مقفع کو سرکاری دربار میں یہ باعزت مقام حاصل ہوا تھا۔

عبداللہ ابن مقفع کی پیدائش بنی امیہ کے زمانہ میں ہوئی اور بنی امیہ کے کئی سلاطین حکومت کے دربار میں اس نے ایک محرر اور فرمان نویس کی حیثیت سے کام کیا اور جب انقلاب آیا، عباسی حکومت حکومت قائم ہوئی وہ خلیفہ منصور کے چچا کے ہاں ملازم رہا اور اس کے بچوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اسی کے گھر میں اس نے اسلام قبول کیا۔ وہ خاندانی اعتبار سے مجوسی آتش پرست تھا جو ایرانیوں کا مذہب تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی لوگ اس کے عقیدہ پر شک کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس نے دل سے اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ آخر میں وہ خلیفہ منصور کے غضب کا شکار ہوا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں انسانی جان کی قدر و قیمت اور انسانی حقوق کی پاسداری آج کے زمانہ سے کم تھی۔ سیاست کے ایوانوں میں ظلم کی چکی چلتی رہتی تھی۔ ظلم آج بھی ہوتا ہے لیکن ظلم کے خلاف

آواز بھی اٹھتی ہے احتجاج ہوتا ہے اخبارات میں مضامین چھپتے ہیں قدیم دور میں استبدادی نظام جاری وساری تھا، اور فریاد وفغاں کا دھواں تک اشعار کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا تھا۔

ابن مقفع نے بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ان کتابوں میں سب سے زیادہ مقبول اور شہرت کے آسمان پر پہنچی ہوئی کتاب کلیلہ دمنہ ہے۔ کتاب کی اصل سنسکرت میں ہے، جس کا ایک معروف نام پنچ تنتر ہے اور پنچ تنتر کی کہانیاں بہت سے لوگوں نے پڑھی ہیں۔ اس کتاب میں علم وحکمت اور دانشمندی کی بہت سی باتیں جانوروں کی زبان سے کہلوائی گئی ہیں۔ یعنی وہ باتیں جس کو براہ راست بادشاہ سے کہنا اور اس کو نصیحت اور نیکی کی تلقین کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ باتیں قصے کہانیوں کی شکل میں جانوروں سے کہلوائی گئی ہیں اور خاص بات یہ کہ پوری کتاب اس کے قصے اور اس کے مکالمے عربی زبان وادب کا اونچا نمونہ ہیں اور بہت مؤثر ہیں۔ حکمت ودانشمندی کا اتنا اچھا انتخاب کم کسی ادبی کتاب میں ملے گا۔ عبداللہ بن مقفع کی مادری زبان فارسی تھی لیکن اس نے اپنی محنت اور مہارت سے عربی زبان وادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور دنیا کی جامعات میں یہ کتاب آج بھی نصاب میں داخل ہے اور کلیلہ ودمنہ کے اثرات بعد کے زمانے کے عربی ادب پر بھی پڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فارابی کی کتاب المدینۃ الفاضلہ اور اخوان الصفا کی کتاب الحماقۃ المطبوقۃ میں اس کتاب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ابن قتیبہ نے عیون الأخبار میں اور ابن عبدربہ نے العقد الفرید میں اور ابن حزم نے کلمات فی الاخلاق میں ابن مقفع کی کتابوں سے اقوال اور دانشمندی کے کلمات اخذ کیے ہیں۔

ابن مقفع کی تصنیفات متعدد ہیں۔ اس کی ایک کتاب کتاب التاج ہے جو نوشیرواں کی سیرت پر ہے، ایک دوسری کتاب ''الدرۃ الیتیمہ'' ہے جو صالحین کے حالات پر مشتمل ہے۔ پھر اس کی مشہور کتابوں میں الأدب الصغیر اور الأدب الکبیر ہے۔

ابوعثمان جاحظ (776 تا 868)

ابوعثمان جاحظ اپنی جسمانی شکل وصورت کے اعتبار سے کوئی خوش شکل اور پسندیدہ آدمی نہ تھا۔ قد مختصر تھا۔ آنکھیں ابھری ہوئی اور باہر کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ اسی لیے جاحظ کے نام سے مشہور تھا۔ کیونکہ عربی لغت میں جاحظ اسے کہتے ہیں جس کی آنکھ باہر کی طرف نکلی ہوئی ہو، لیکن

انسان کی اصل قدر و قیمت اس کی ظاہری دلکشی اور خوبصورتی کی وجہ سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اخلاقی اور علمی صفات ہیں جو کسی شخص کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ جاحظ ظاہری اعتبار سے غیر مقبول تھا۔ لیکن علمی اور ادبی اعتبار سے وہ ہر زمانے میں مشہور اور مقبول رہا ہے، صدیاں گزر گئیں لیکن اس کی کتابیں آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت پر سب کا اتفاق ہے اور اسے ایک صاحب اسلوب ادیب مانا جاتا ہے۔ اس کی مشہور کتابوں میں 1۔ کتاب البیان والتبیین 2۔ کتاب الحیوان 3۔ کتاب البخلاء 4۔ دیوان الرسائل 5۔ کتاب المحاسن والاضداد۔ مشہور اور اہم ہیں۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ عربی ادب کی تاریخ میں جن چار کتابوں کو کاملیت اور مرجعیت کی حیثیت حاصل ہے اور جن کا شمار مصادر ادب عربی میں ہوتا ہے۔ وہ یہ ہیں: ''ابن قتیبہ'' کی ادب الکاتب اور ''مبرد'' کی کتاب الکامل اور ''جاحظ'' کی البیان والتبیین اور ''ابوعلی القالی'' کی الأمالی جس کا پورا نام کتاب النوادر ہے۔

البیان والتبیین جاحظ کی کتابوں میں سب سے ممتاز ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے عربی شعر و ادب کا خزانہ سامنے آجاتا ہے اور عصر عباسی تک جتنی ادبی کاوشیں سامنے آئی ہیں۔ ان کی جھلک اس کتاب میں مل جاتی ہے۔ عربی زبان میں دلکش اور مؤثر خطبات بھی موجود ہیں ان خطبات کا بھی اس کتاب میں تذکرہ ہے، ان کے کچھ نمونے ہیں۔ اسلام کی تاریخ میں بہت سے زاہد مرتاض۔ درویش صفت اور دنیا سے بے نیاز لوگ پیدا ہوئے۔ ان کے حالات بھی اس کتاب میں مل جائیں گے۔ جاحظ کی دوسری مشہور کتاب ''کتاب البخلاء'' ہے۔ یہ عجیب اور غریب لیکن بہت دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب میں بخیلوں اور کنجوسوں کے عجیب و غریب واقعات جمع کر دیے گئے ہیں۔ بہت سے لوگ بہت مالدار تھے۔ لیکن بہت بخیل تھے کہ ان کے واقعات دلچسپی اور خوش طبعی اور ظرافت کے لیے مجلسوں میں سنائے جاتے ہیں۔ ایک مالک مکان تھا اس نے مکان اپنا کرایے پر دے رکھا تھا۔ اس کرایے دار کے گھر مہمانوں کی آمد بہت ہوتی تھی۔ چنانچہ مالک اپنے کرایے دار سے ملتا ہے اور شکایت کرتا ہے کہ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے سیڑیاں گھس جائیں گی اور اس میں میرے گھر کا بہت نقصان ہوگا اور اسی طرح سے اس میں ایک قصہ ہے۔ ایک بخیل نے ایک شخص سے کہا کہ تم اپنے قرض کا تقاضہ کرنے کے لیے فلاں شخص کے پاس بار بار

جاتے رہو اس سے تو تمھارے جوتے گھس جائیں گے اور تمھارا مالی نقصان ہوگا۔ لیکن وہ شخص جس کو بخیل نصیحت کر رہا تھا۔ بخل میں کسی سے کچھ کم نہ تھا۔ اس نے جواب دیا میں جب بھی جاتا ہوں تو اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ جاحظ کی تیسری اہم کتاب کتاب الحیوان ہے۔ اس میں پرندوں ۔ چوپایوں اور دیگر حیوانات کے بارے میں حیرت انگیز معلومات جمع کر دی گئیں ہیں۔ آج کل کے زمانے میں تو پرندوں اور چرندوں اور درندوں کے ماہرین بہت سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں کئی اشخاص نے عالمی شہرت بھی حاصل کی ہے، آج کے زمانے میں خطرناک سے خطرناک درندوں اور حشرات الأرض کو قریب سے دیکھنا اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنا اور اپنے مطالعہ کا حاصل کتابی شکل میں پیش کر دینا آسان ہو گیا ہے۔ لیکن جاحظ کے زمانے میں نہ عالم اسماک نہ عالم طیور نہ عالم حشرات الأرض کا مطالعہ کرنا اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جاحظ نے یہ مشکل کام کر دکھایا اور کتاب الحیوان میں بہت سے پرندوں اور حیوانات کے بارے میں وہ معلومات درج کیں جو پہلے کبھی درج نہیں کی گئیں تھیں۔

جاحظ کی زبان بہت معیاری زبان ہے۔ اس میں بہت غریب اور زیادہ مشکل الفاظ کم آئے ہیں اور وہ جو کچھ کہتا ہے بڑی وضاحت کے ساتھ کہتا ہے۔ اس کے یہاں حسن تحریر اور حسن بیان کا التزام ہے۔ سہل زبان ہے لیکن اس میں حلاوت اور موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔

صاحب بن عباد (332 تا 385ھ)

عربی زبان وادب کے مشہور انشا پردازوں میں صاحب بن عباد کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے اساتذہ میں عربی کے نامور ادیب ابن عمید تھے۔ صاحب بن عباد ایک طویل عرصہ تک ابن عمید کی صحبت اور ان کی خدمت میں رہے، اسی وجہ سے ان کا نام الصاحب بن عباد ہو گیا، صاحب کا مطلب ہوتا ہے ساتھ رہنے والا۔ صاحب بن عباد ایک شریف انسان تھے۔ شعر وادب میں بھی ان کا پایہ بلند تھا اور ادب کی دنیا میں انھوں نے اپنے نقوش قائم کیے۔ صاحب بن عباد کا تعلق بادشاہوں سے اور ان کے دربار سے رہا ہے، ان کی ادبی شخصیت اس قدر محترم اور اتنی مسلم تھی کہ ادبا شعرا۔ علما اور متکلمین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے اور ان کو تحفوں سے نوازتے گویا یہ ایک پورا ادبی اسکول تھا۔ جس کی اپنی ترجیحات تھیں۔

صاحب بن عباد کو کتابوں سے بہت شغف تھا۔ ہر اچھی اور مشہور کتاب اس کے پاس آ جاتی اور وہ خود اس کو حاصل کر لیتے پھر ان کا مطالعہ شوق اور ذوق سے کرتے۔ ملک کے تمام علمی اور ادبی حلقوں میں ابن عباد کی بڑی حیثیت تھی۔ وہ خود صاحب اسلوب ادیب ہونے کے باوجود ابن عمید کے بہت قائل اور معترف تھے۔ ابن عباد کی زبان سجع اور اجناس بلاغت سے بھری ہوئی ہے۔ ان کا مقام عربی نثر میں بہت بلند ہے۔ ابوبکر خوارزمی اور بدیع الزماں ہمدانی کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شاعری میں ان کو خاص ذوق اور تنقید کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کی ایک اور مشہور کتاب ''کتاب الامالہ'' اور دوسری کتاب متنبّی کے فن پر تنقید میں ''الکشف عن مساوی المتنبی'' ہے۔

ابن العمید (367ھ)

ابن العمید نے عربی ادب میں ایک پر تکلف اور صنائع اور بدائع سے لبریز اسلوب ایجاد کیا۔ یہ نثری اسلوب دراصل اس وقت کے پر تکلف اور مصنوعی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جس طرح سے اس عہد کے لوگ کھانے پینے میں لباس و پوشاک میں اور مکانات کی آرائش و زیبائش میں بہت زیادہ زیب و زینت اور تکلف کے عادی ہو گئے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا انعکاس زبان وادب پر بھی پڑنا چاہیے تھا چنانچہ جدید تشبہات اور استعارات اور کنایات پر مبنی اور سجع و قافیہ سے لبریز نثر وجود میں آ گئی تھی۔ تکلفات سے عبارت کو دلکش بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ابن عمید کے دور میں اس طرح کی پر تکلف نثر لکھی جا رہی تھی اور اس پر تکلف اسلوب کا نمونہ ابن العمید و قاضی الفاضل کے اسالیب میں ملتا ہے۔ ابن العمید سجع کا التزام بہت زیادہ کرتے تھے۔ جملوں میں اوزان برابر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اپنی عبارتوں میں موسیقیت اور حلاوت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ علم بلاغت سے عبارت میں دلکشی پیدا کرنے کے جتنے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ جیسے طباق اور جناس۔ ان کی تصویر ابن العمید کے کلام میں ملتی ہے۔ ابن العمید ایک ادبی اسکول کا نام ہے، اس ادبی اسکول کے تتبع کرنے والوں میں ابوبکر خوارزمی اور ابو اسحاق صاوی اور صاحب بن عباد اور بدیع الزماں ہمدانی اور قاضی الفاضل کا نام بہت نمایاں ہے۔

بدیع الزماں ہمدانی (358ھ تا 395ھ۔ 969 تا 1007)

مقامات بدیع الزماں ہمدانی عربی ادب کی مشہور کتاب ہے اس میں بہت دلچسپ قصے

ہیں اس کا ایک خاص اسلوب ہے، عبارتیں بہت مسجع ہیں۔ اس میں ایک راوی ہوتا ہے جو دلچسپ واقعات کی روایت کرتا ہے۔ قصہ کہانیوں کی نثر کی روایت عربی ادب میں بہت قدیم ہے اس سے پہلے ابن مقفع نے کلیلہ ودمنہ لکھی۔ فارسی سے کتاب کا ترجمہ کیا۔ افسانوی یا خیالی نثر کی روایت میں مقامات بدیع الزماں ہمدانی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ عنترہ کے قصے بھی عربی افسانوی ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ الف لیلیٰ کے قصے بھی بہت اہم ہیں۔ ان قصوں کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بادشاہ اپنی بیوی کو ایک غلام کے ساتھ ملوث پاتا ہے، اسے اس کی وجہ سے عورت ذات سے نفرت ہو جاتی، وہ ہر عورت کو بے وفا سمجھتا ہے چنانچہ وہ ہر روز ایک لڑکی سے شادی کرتا ہے اور رات اس کے ساتھ گزارنے کے بعد اس کو قتل کر دیتا ہے۔ پھر ایک بار ایک وزیر کی بیٹی کے نام قرعہ فال پڑتا ہے اس کا نام شہرزاد تھا۔ وہ بہت ذہین تھی وہ بادشاہ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے وہ ہر رات بادشاہ کو ایک دلچسپ قصہ سناتی ہے اور صبح تک وہ قصہ مکمل نہیں ہوتا ہے اور اگلی شب قصہ بیان کرنے کا وعدہ کرتی قصہ سے ایک نیا قصہ نکلتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک ہزار ایک رات قصہ گوئی میں گذر جاتی ہے۔ اس عرصہ میں شہرزاد سے ایک لڑکا بھی تولد ہو گیا اس طرح سے وہ اپنی داستان کو طول دیتی رہی اور بادشاہ قصہ سننے کے شوق میں اسے قتل نہیں کر سکا پھر بادشاہ نے اسے معاف کر دیا اور عورتوں کو قتل کرنا بھی بند کر دیا۔ لیکن الف لیلیٰ کے قصے لافانی اور جاودانی بن گئے۔ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اس کی بازگشت سے ادب کا گنبد گردوں گونجتا رہا۔ لیکن آج تک اس کے مولف کا سراغ نہیں لگ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کے ایک نہیں کئی مصنف ہیں اور ہر دور میں اس میں اضافے ہوتے رہے لیکن اس کا جواب بہت مشکل ہے کہ پوری کتاب میں اسلوب میں یکسانیت کیوں پائی جاتی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ بہت سارے لکھنے والے ہوں اور سب کا نثری اسلوب یکساں ہو۔ ہندوستانی عربی اور فارسی قصے تو ضرور اس میں ہیں لیکن اسلوب میں تنوع نہیں ہے۔ تخیل کی کرشمہ سازی۔ عشق ومحبت کی نغمہ سرائی اور واقعات کی حیرت آفرینی داستان در داستان ہے لیکن طرز بیان ایک ہے۔

مقامات کا ایک الگ رنگ ہے بلاغت کے صنائع وبدائع۔ نثر میں سجع اور قوافی کا التزام۔ لغت کے نادر اور مشکل الفاظ اور عجیب وغریب حکایتیں اور روایتیں۔ ٹھگی اور دھوکا دہی

کے واقعات ان مقامات کا رنگ امتیاز ہیں اور بدیع الزماں ہمدانی اس فن کا موجد ہے، اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کی پیروی کی۔ سماج کی خرابیوں اور اخلاقی بیماریوں کا یہ مقامات مرقع ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی دور میں معاشرہ میں کیا بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ مقامات بدیع الزماں ہمدانی میں 51 مقامات ہیں۔ قصوں کو بیان کرنے والا راوی عیسیٰ بن ہشام ہے یہ راوی علم و فضل اور زبان و بیان کے جوہر سے متصف ہے۔ یہ راوی حالت سفر میں رہتا ہے اور اپنے مشاہدات سے اپنے قصہ کو دلچسپ بناتا ہے ان مقامات کا ایک ہیرو بھی ہے جو ابوالفتح اسکندری ہے وہ شاعر بھی ہے عالم بھی ہے اور ادیب بھی ہے۔ لیکن وہ بقول شارحین ابن الوقت بھی ہے شاطر بھی ہے زمانہ ساز بھی ہے۔ فتنہ طراز بھی ہے۔ اس کی چالاکیوں کا پردہ راوی عیسیٰ بن ہشام ہر جگہ فاش کرتا ہے۔

ابو محمد ابوالقاسم الحریری (446ھ تا 516ھ)

عربی ادب میں حریری بھی مقالہ نگاری میں مشہور ہیں ان کے مقالات کی تعداد بھی 50 ہے اس کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ آج کسی افسانہ نگار کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے 50 افسانے لکھے تو اسے بڑا افسانہ نگار مانا جائے گا۔ وہ افسانے آج کے دور کے فنی افسانوں سے مختلف تھے لیکن یہ اس دور کی سوسائٹی کی عکاسی کرتے تھے اور سوسائٹی کے بگاڑ پر طنز کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان مقامات کا راوی حارث بن ہمام ہے وہی قصہ گو اور حکایت نگار ہے۔ حریری کے مقامات کی ادبی اہمیت ہے اسلوب میں تکلف ہے سجع ہے تعقید ہے اور مشکل زبان ہے سمجھنے کے لیے لغت کی کتابوں کی طرف اور شرح کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا غلو کے ساتھ استعمال ہے۔ اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں انگریزی اور فرانسیسی اور دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اسلوب کی خاص بات چھوٹے چھوٹے سبک جملے ہیں جن میں سجع کی وجہ سے غنائیت اور موسیقیت پیدا ہو گئی ہے صنائع اور بدائع کا استعمال بہت زیادہ کیا گیا ہے اس میں بدیع الزماں کے مقامات سے بھی زیادہ تکلف اور تصنع ہے۔

ابوالفرج اصفہانی (284 تا 356ھ)

ابوالفرج اصفہانی کا شمار عربی ادبا کی منتخب فہرست میں ہوتا ہے۔ جس کتاب نے ان کو بقائے دوام اور شہرت عام عطا کی وہ ان کی کتاب کتاب الاغانی ہے یہ عربی شعر و نغمہ اور ساز و آواز

کی تاریخ ہے عربوں میں کون کون سے گانے والے تھے اور گانے والیاں تھیں اور فنی اعتبار سے ان کا کیا مقام تھا کیا کیا ساز تھے موسیقی کے کیا کیا آلات تھے۔ راگ اور راگنی کی کیا کیا قسمیں تھیں۔ کون کس راگ کا موجد تھا۔ کس کو کس راگ میں کتنی شہرت حاصل تھی۔ کس کس کو شاہی دربار میں رسائی حاصل تھی۔ کس کا راگ زیادہ مقبول تھا عوام اور خواص کس مطرب و مغنی کے شیدا تھے۔ کس شاعر کا کلام کون مغنی زیادہ گاتا تھا اور عوامی شہرت حاصل کرتا تھا۔ ان باتوں کے علاوہ ادبی اور شعری قصے اور حکایتیں اس کتاب کا موضوع ہیں۔ کتاب کا اسلوب بھی دلکش ہے اس میں ادبی رعنائی ہے اور یہ کتاب بیس جلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ عربی کے بڑے بڑے ادیبوں نے اس کتاب کی مدح سرائی کی ہے۔ اس لیے یہ کتاب عربی ادب کے مصادر و مراجع میں شمار ہوتی ہے۔ ابوالفرج اصفہانی کی پیدائش ایران کے شہر اصفہان میں ہوئی اس کے بعد وہ بغداد آ گیا اور بہت سے علوم میں اس نے مہارت حاصل کی۔ شاہی دربار اور بنو بویہ کی شیعی حکومت کی با اثر شخصیتوں سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ ایران اور شیعت کے اثرات بھی اس کی شخصیت پر بہت تھے اس لیے ادبی اعتبار سے کتاب کی اہمیت کے باوجود تاریخی اعتبار سے مسلمان علما نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کتاب کے حوالے دیے جاتے ہیں۔

ابن عبدربہ (256 تا 328ھ)

ابن عبدربہ کے دادا اندلس کے دوسرے خلیفہ سالم ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل کے غلام تھے ان کی پیدائش شہر قرطبہ میں ہوئی۔ وہیں پروان چڑھے۔ علم و ادب کا بچپن سے شوق تھا۔ فقہ۔ تاریخ۔ موسیقی۔ شاعری اور طب میں انھوں کمال حاصل کیا۔ انھوں نے خلفا کے لیے قصیدے بھی لکھے اور اپنی مدح سرائی کے طفیل انعام و اکرام کے مستحق ہوئے اور دولت کمائی۔ جوانی میں غزل اور تشبیب میں اشعار کہے۔ لیکن ایک عمر آنے کے بعد مزاج میں زہد اور تصوف کا رنگ غالب آ گیا۔ نثر میں ان کی مشہور کتاب العقد الفرید ہے جو عربی ادب میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ادب کی انسائکلو پیڈیا ہے، ادبی اور شعری روایات کا خزانہ ہے۔ انھوں نے اندلس کو چھوڑ کر عرب دنیا کے ادبی قصوں کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ادب لغت و اشعار اور عربوں کی ادبی روایات کی جامع کتاب ہے۔ اس میں عربوں کی ادبی اور شعری روایات کا بہت بڑا حصہ محفوظ

ہوگیا ہے۔ بعد کے دور کے مورخین اور اہل ادب کے لیے یہ کتاب مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اپنا اسلوب بھی بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔ وہ اکثر سجع کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کا التزام نہیں ہے۔ یعنی موقعہ بہ موقعہ وہ سجع کا استعمال کرتے ہیں اس طرح وہ ادبی حسن پیدا کرتے ہیں مقتضائے حال کی مطابق وہ تحقیق سے بھی کام لیتے ہیں اس طرح یہ کتاب ادب کے موضوع پر ایک علمی ادبی اور تحقیقی کتاب بن گئی ہے، عربی ادب کے مصادر اور مراجع میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

جمال الدین افغانی (1858 تا 1898)

سید جمال الدین افغانی افغانستان کے ایک علاقہ اسعد آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ کابل سے قریب ہے۔ آٹھ سال کی عمر سے انھوں نے علوم عربیہ دینیۃ کی تحصیل شروع کی۔ بعد میں فرانسیسی اور فارسی بھی سیکھی پھر روسی اور ترکی زبانیں بھی سیکھیں۔ اس طرح انھوں نے مشرقی اور مغربی ثقافت سے آشنائی حاصل کی۔ بعد میں جس شخصیت کو بین الاقوامی شخصیت بننا تھا اس کی تشکیل کا سامان قدرت کی جانب سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان۔ مصر۔ ترکی۔ فرانس۔ انگلستان کے سفر بھی کیے۔ اس سے ان کا ثقافتی اور فکری افق اور زیادہ وسیع ہوا اور وہ ایک مفکر اور مصلح کا کردار ادا کرنے کے لائق ہوئے۔ وہ قدرت کی طرف سے غیر معمولی صلاحیت لے کر آئے تھے۔ ان کے اندر فصاحت اور بلاغت کے جوہر بھی تھے۔ انھیں ادب سے فطری مناسبت تھی۔ اسلام کے گہرے مطالعہ اور دنیا کے مشاہدے نے ان کو ایک انقلابی کردار ادا کرنے میں آسانی فراہم کی۔ ابھی ان کا عنفوان شباب تھا کہ وہ امیر افغانستان محمد اعظم کے وزیر بن گئے انھوں نے ملک میں مکمل آزادی اور تمام معاملات کو شوریٰ کے ذریعہ طے کرنے کی دعوت دی۔ انگریزی حکومت نے اس تحریک سے خطرہ محسوس کیا اور امیر کو معزول کر دیا۔ جمال الدین افغانی ہندوستان آ گئے۔ ان کے خیالات یہاں بھی انگریزوں کی حکومت کے لیے باعث تشویش تھے۔ انھیں یہاں سے نکل جانے کا حکم صادر ہوگیا۔ پھر وہ ترکی چلے گئے۔ وہاں کے صدر اعظم نے ان کا استقبال کیا۔ انھیں وزارت تعلیم میں عہدہ دیا گیا۔ انھوں نے ایسا نصاب تعلیم تیار کیا جس سے اہل دین اور اہل دنیا دونوں کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ چنانچہ ایک طوفان برپا ہوا اور افغانی کو مصر چلا جانا پڑا۔ قاہرہ میں ریاض باشا نے ان کا استقبال کیا۔ ان کی شخصیت اور ان کی تحریر و تقریر میں

ایسی تاثیر اور تسخیر تھی کہ وہاں کے علما اور اہل ادب اور اہل سیاست سب ان کے گرویدہ ہو گئے وہ مختلف انجمنوں اور اجتماعات سے خطاب کرتے اور اس طرح ان کے نظریات کو پھیلنے کا موقعہ ملا۔ افغانی کے مشورے سے حکومت میں ایسے لوگوں کو جگہ دی گئی جو اصلاحی خیالات کے اور جمال الدین افغانی کے نظریات کے حامل تھے۔ جمال الدین افغانی حکومت میں شورائیت اور جمہوریت کے حامی تھے بلکہ اس کے زبردست داعی تھے۔ جو شخص بھی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ ابتدا میں امیر کا یا حاکم کا انتخاب ہوتا تھا اور جس وقت پوری دنیا میں ملوکیت کا موروثی نظام پایا جاتا تھا اس وقت اسلام نے انتخاب کا جمہوری نظام شروع کیا تھا لیکن خلافت راشدہ کے بعد گاڑی جو ایک مرتبہ پٹری سے اتری تو آج تک دوبارہ پٹری پر نہیں آئی۔ جب کہ آج پوری دنیا میں جمہوریت رائج ہوگئی ہے عالم عرب میں وہ گاڑی دوبارہ اپنی پٹری پر نہیں آسکی اور ملوکیت و موروثیت کا وہ نظام رائج ہے جو دنیا سے مٹ چکا ہے۔ جمال الدین افغانی کی یہ دعوت جو ادبی تحریروں اور موثر تقریروں کے ذریعہ پھیل رہی تھی وہاں کے انگریزی اقتدار کے لیے خوف کا سبب بن گئی چنانچہ انگریزوں نے خدیو پر دباؤ ڈال کر جمال الدین افغانی کو مصر سے نکلوادیا۔ جہاں اسلامی دنیا میں ان کو امان نہیں مل سکی اسے پیرس کی سرزمین میں امان ملی ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی'' انھوں نے پیرس سے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے نام سے ایک مجلّہ کا اجرا کیا جو اپنے پیغام اور زبان و بیان کے اعتبار سے مولانا آزاد کے الہلال کے مشابہ تھا۔ اس مجلّہ کی تحریریں بجلی کی سی تاثیر رکھتی تھیں۔ اس کے بعد ان کو ایران آنے کی دعوت دی گئی لیکن ان کا شورائیت کا مشن ان کو وہاں بھی راس نہ آیا اور انھیں ایران بھی چھوڑنا پڑا پھر وہ ترکی گئے اور وہیں کینسر کے مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کسی ایسی زبان میں جو مادری زبان نہ ہو ادبی کمال حاصل کرنا اور اس زبان کے ادبا اور اہل قلم کو متاثر کرنا اور ان سے داد تحسین حاصل کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کی مثالیں ملتی ہیں لیکن یہ مثالیں بہت نادر ہوتی ہیں۔ جمال الدین افغانی سے عرب ادبا اور نثر نگار متاثر ہوئے اور انھوں نے ایک نظریاتی انقلاب پیدا کر دیا۔ بہت بڑی تعداد میں لوگ ان کے معترف اور مداح ہو گئے اور اہل قلم کی بڑی تعداد ان کے نظریات کی مبلغ بن گئی۔ ان کی حیثیت ایک شعلہ جوالہ کی تھی وہ جہاں

گئے انھوں نے اپنی تقریروں سے اور تحریروں سے آگ لگادی ان کے مقالات زیادہ تر العروۃ الوثقیٰ میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب ان کی ایک ہے اور اس کا نام الرد علی الدہریین ہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو وہ بول نہیں سکتے تھے لیکن کاغذ کے ایک ٹکڑے پر انھوں نے لکھا تھا ''ملّتی ملّتی'' یعنی میری قوم میری قوم۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے دل میں قوم وملت کا کتنا درد تھا۔

شیخ محمد عبدہ (1849 تا 1905)

شیخ محمد عبدہ مصر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد جامع ازہر میں داخلہ لیا۔ محنت اور لگن سے انھوں نے علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کی لیکن ان کی شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں جمال الدین افغانی کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے جمال الدین افغانی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ ان کے افکار سے خوشہ چینی کی اور ان کو اپنا رہنما اور فکری قائد بنایا۔ جمال الدین افغانی کی حیثیت ایک شمع کی تھی جس کے چاروں طرف علم وفکر کے پروانے جمع ہوگئے تھے۔ جمال الدین افغانی کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا اور جب وہ مصر چھوڑ کر جارہے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ میں مصر میں محمد عبدہ کی شکل میں سرمایہ خیر چھوڑ کر جارہا ہوں۔ محمد عبدہ نے افغانی کے کام اور پیغام کو زندہ رکھا۔ یہاں تک کہ مصر میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ خدیو یعنی حاکم مصر انگریزوں کے طرفدار تھے۔ محمد عبدہ نے فتویٰ دیا کہ خدیو کی بیعت فسخ کرنا جائز ہے۔ محمد عبدہ کو بھی مصر سے نکال دیا گیا وہ شام چلے گئے اور وہاں چھ برس قیام پذیر رہے جہاں انھوں نے نہج البلاغہ اور مقامات بدیع الزماں کی شرح لکھی۔ پھر وہ جمال الدین افغانی کے پاس پیرس چلے گئے اور ان کے ساتھ مل کر ''العروۃ الوثقیٰ'' نکالا جس کے علمی اور فکری مقالات نے ایک گونج پیدا کی۔ شیخ محمد عبدہ نے پیرس میں فرانسیسی زبان سیکھی اور اس زبان کی ادبیات کا مطالعہ کیا۔ پھر انھیں مصر آنے کی اجازت مل گئی وہ واپس آنے کے بعد جامع ازہر میں استاذ مقرر ہوئے وہ تفسیر اور ادب پڑھاتے تھے اور پھر منصب افتا پر فائز ہوئے۔ ان کے سامنے دو مقصد تھے ایک تو دینی افکار کی اصلاح اور دوسرے زبان وادب کی اصلاح۔ انھوں مسجع اور مقفیٰ زبان کے بدلہ میں سادہ نثر کی وکالت کی۔ چنانچہ ان کی نثر میں سادگی ہے لیکن موثر ہے۔ انھوں نے مذہبی اور دینی حلقوں کی اصلاح کے ساتھ زبان وبیان کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلائی اور سیاست کی اصلاح بھی ان کے پیش نظر رہی۔ ان کی ادبی کاوشوں کے آئینہ دار

ان کے مقالات ہیں ۔ وہ الوقائع المصر یہ کے ایڈیٹر بھی بنا دیے گئے تھے ۔ ان کا اسلوب فطری اور دلکش ہے، اس میں متانت ہے ۔ اس میں صنائع اور بدائع نہیں ہیں ۔ انھوں نے مغرب کے افکار سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ ان کے یہاں مشرق ومغرب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اسلامی علوم میں ان کو خاص امتیاز حاصل تھا ۔ ان کے اصلاحی مضامین اس نوعیت کے ہیں جس طرح اردو میں سرسید کی فکری اور اصلاحی تحریریں ہیں اور سرسید ہی کی طرح انھوں نے اپنے عہد کے اہل قلم پر اثر ڈالا ۔ چنانچہ شعرا میں شوقی اور حافظ ابراہیم اور نثر نگاروں میں احمد امین اور کرد علی اور مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی تحریروں پر ان کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاتے ہیں ۔ دور جدید میں فکری اصلاح اور زبان وادب کی ترقی میں شیخ محمد عبدہ کی کوششوں کو بڑا دخل ہے ۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی (1876 تا 1924)

مصطفیٰ لطفی منفلوطی عہد جدید کے بہت بڑے ادیب اور نثر نگار ہیں ۔ صاحب اسلوب ہیں ۔ تخلیقی ادب کے امام ہیں ۔ انھوں نے عربی نثر کی ترقی میں بنیادی رول ادا کیا ہے اور افسانوی تخلیقات کی انھوں نے ابتدا کی ہے ۔ انھوں نے قصے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی لکھے ہیں ۔ انھوں نے فرانسیسی قصوں اور ناولوں کو عربی لباس پہنایا ہے ۔ انھیں فرانسیسی نہیں آتی تھی ۔ لیکن انھوں نے فرانسیسی ناولوں کے ترجمے سن کر بے پناہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ انھیں عربی میں منتقل کیا ہے ۔ فرانسیسی سے عربی لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس قصے کو انھوں نے اپنے انداز اور اپنے طرز میں منتقل کیا ہے، پھر وہ فصاحت کا ایسا نمونہ ہے کہ اصل کتاب میں بھی وہ فصاحت نہیں پائی جاتی ہے ۔ یہ اس لیے کہ وہ عربی کے زبردست انشا پرداز اور سحر طراز ادیب تھے ۔ وہ اعلیٰ درجہ کے فن کار تھے ۔

وہ مصر میں منفلوط میں پیدا ہوئے ان کے والد عرب تھے ۔ ان کی ماں ترکی تھیں ۔ ان کے والد کا نام محمد لطفی تھا ۔ ان کے والد نسباً حسینی سید تھے اور شہر منفلوط کے قاضی تھے ۔ وہ بہت متقی اور پرہیز گار تھے ۔ والدہ بھی بہت دیندار تھی ۔ انھوں نے بچپن میں قرآن حفظ کیا ۔ پھر جامعہ ازہر میں داخلہ لیا ۔ وہ ازہر میں دس برس تعلیم حاصل کرتے رہے ۔ وہ شیخ محمد عبدہ کے لیکچر میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور شیخ محمد عبدہ سے انھوں نے قرآن کی تفسیر پڑھی اور اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز کا

بھی درس لیا۔ شیخ محمد عبدہ کے آراء وافکار سے بہت متأثر ہوئے۔ اجتماعی زندگی میں ان کے اصلاحی لٹریچر پر شیخ محمد عبدہ کے واضح اثرات ہیں۔ ان کی ادبی خدمات اور طاقتور مضامین سے مصر کے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ سعد زغلول جب وزیر تعلیم ہوئے تو انھوں نے اپنی وزارت میں ان کو لٹریری سیکریٹری مقرر کیا اور جب سعد زغلول وزیر عدل بنے تو منفلوطی بھی وزارت عدل میں منتقل ہوگئے۔ مجلّات ورسائل میں ان کے طاقتور ادبی مضامین شائع ہوتے رہے، جب 1923 میں مصر میں پارلیمنٹ بنی تو ان کو کاتبوں کا صدر بنایا گیا۔ وہ بہت رقیق القلب تھے، اپنے آس پاس غم والم کو دیکھ کر متاثر ہوتے تھے۔ ان کا دل غریبوں۔ بیکسوں۔ یتیموں اور بیواؤں پر روتا تھا۔ ان کے حالت زار کی بڑی اچھی تصویر ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ وہ غریب طبقہ کے احساسات اور جذبات کو اپنے ادب میں پیش کرتے تھے۔ انھوں نے ایسے موثر قصے لکھے ہیں جو دل کے اندر اتر جاتے ہیں۔ وہ اپنے ادب سے اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی کرتے ہیں اور رزائل اخلاق سے نفرت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ العبر ات اور النظرات کی شکل میں موجود ہے۔ انھوں نے فرانسیسی ناولوں کے جو آزاد ترجمے کیے ہیں وہ یہ ہیں: 1۔ الفضیلۃ۔ 2۔ الشاعر 3۔ فی سبیل التاج 4۔ ماجدولین۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کا شمار جدید عربی ادب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سجع اور قافیہ کا استعمال کم کیا ہے۔ تعقید اور تکلف سے اجتناب کیا ہے۔ مقالات کا لکھنا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ یہ مقالات حقائق حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو ادب کا جامہ پہنایا ہے، اس طرح سے کہ ان سے اخلاقی قدریں اجاگر ہوتی ہیں۔ انھوں نے انسانی کمزوریوں۔ استحصال اور رزائل اخلاق کی بہت کامیاب منظر کشی کی ہے۔ وہ زندگی کے بہت چھوٹے واقعات کو بڑی خوبصورتی سے ادبی پیرایے بیان میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ مقالہ لکھنے بیٹھتے تو ایک مچھر ان کو کاٹ لیتا ہے تو اس مچھر پر ان کی تحریر تخیل کی کارفرمائی اور ادب کی معجزہ بیانی کا مرقع بن جاتی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے عربی ادب کی تمام کلاسیکل کتابیں پڑھی ہیں۔ شعرا کے دیوان کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن کوئی چیز انھیں یاد نہیں رہتی تھی۔ لیکن ان تحریروں کا حسن ان کے

وجدان میں جذب ہو جاتا ہے اور ان سے خوبصورت ادبی تحریر وجود میں آتی ہے۔ انھوں نے بڑے مؤثر انداز میں مغربی تہذیب اور فحاشی ۔ جوئے بازی۔ شراب خوری اور رقص وموسیقی کی محفلوں پر تنقیدیں کی ہیں۔ اسلامی اقدار کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثری ادب منفلوطی کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ ان کی دو کتابیں العبر ات اور النظرات خاص طور پر حیات جاودانی حاصل کر چکی ہیں۔ وہ بہت بڑے محقق یا ادبی نقاد نہیں تھے لیکن ان کی تمام تحریریں تخلیقی ادب کا شاہکار ہیں، اجتماعی زندگی کے آلام اور مسائل کو بہت مؤثر طریقہ سے پیش کرتی ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں ان میں غیر معمولی قوت اور انفرادیت ہے اور نہاں خانۂ دل میں ان کی تحریریں اتر جاتی ہیں اور یہ اس لیے ہوا کہ قدیم ذخیرہ ادب پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ آج دنیا کی جامعات میں منفلوطی کی تحریریں اور کتابیں نصاب میں اسی طرح شامل ہیں جیسے ہندوستان میں اردو میں شبلی یا حالی یا محمد حسین آزاد کی تحریریں ہیں۔ جدید عربی ادب میں رفاعہ طہطاوی ترجمہ نگاری کے قائد تھے اور بارودی عربی شاعری کے مجدد تھے۔ اسی طرح مصطفیٰ لطفی منفلوطی آزاد اور طاقتور عربی نثر کے امام تھے۔

مصطفیٰ صادق الرافعی (1880 تا 1937)

مصطفیٰ صادق الرافعی لبنان کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کے اکثر افراد ہجرت کر کے مصر چلے گئے تھے رافعی کے والد مصر کی مختلف عدالتوں میں قاضی کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ مصطفیٰ صادق الرافعی نے خالص عربی اور اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولی ان کے والد نے سب سے پہلے انھیں قرآن مجید حفظ کرایا اور دینی علوم کا درس دیا۔ انھوں نے منصورہ کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ بعد میں انھیں ثقل سماعت کا مرض لاحق ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ سننے سے بالکل معذور ہو گئے اس لیے ان کی رسمی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ اس کمی کو انھوں نے ذاتی مطالعہ سے پورا کیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں رافعی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور 1920 میں جب رافعی کا دیوان شائع ہوا تو بارودی جیسے عظیم شاعر نے اس پر تقریظ لکھی اور مصطفیٰ لطفی منفلوطی جیسے ادیب نے اس کی تعریف وستائش کی اور ایک سال کے بعد جب دیوان کا دوسرا حصہ منظر عام پر آیا تو شیخ محمد عبدہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور یہ لکھا کہ رافعی اپنی شاعری کے ذریعہ دین کی ویسی ہی خدمت کریں گے جیسے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کی تھی اور پھر ایک

سال کے اندر جب دیوان کا تیسرا حصہ منظر عام پر آیا تو حافظ ابراہیم جیسے عظیم شاعر نے اس پر تقریظ لکھی۔

مصطفیٰ صادق الرافعی کی ادبی زندگی بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں عربی نثر کی طرف منتقل ہوجاتی ہے۔ان کی کتاب ''تاریخ ادبیات العرب'' منظر عام پر آئی جس کا ادبی حلقوں میں زبردست استقبال ہوا۔ پھر فوراً ہی اس کتاب کا دوسرا حصہ شائع ہوا جو قرآن کے اعجاز اور بلاغت نبوی پر مشتمل تھا۔جس کو بعد میں اعجاز القرآن کے نام سے شائع کیا گیا،سعد زغلول نے اس کتاب پر تقریظ لکھی اور کتاب کو نثری اسلوب کا شاہکار قرار دیا گیا۔ان کی اور دوسری کتابیں جیسے المساکین۔البؤ ساء شائع ہوئیں۔ان کتابوں میں مسکینوں اور محتاجوں کے درد وغم کی تصویر کشی کی گئی ہے اور فلسفہ حسن و جمال اور نظریہ خیر وشر اور تقدیر کے موضوعات پر فلسفیانہ تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ پھر ان کی کتاب رسائل الاحزان یعنی خطوط درد وغم زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ کتاب فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔ پھر ان کی کتاب السحاب الاحمر (سرخ بادل) شائع ہوئی۔ پھر اس کے بعد ان کی کتاب اوراق الورد (گلاب کی پتیاں) منظر عام پر آئی۔ان تمام کتابوں کے ذریعہ رافعی نے اپنے طاقتور اسلوب بیان کا سکہ جما دیا اور جب ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب فی الشعر الجاہلی شائع ہوئی جس میں انھوں نے اپنے عجیب وغریب خیالات پیش کیے تو رافعی نے تحت رایۃ القرآن لکھ کر اس کتاب کا جواب دیا۔انھوں نے عقاد جیسے جدید شعرا کی خبر لی اور ان کی جدیدیت اور مغربی ادب سے حد سے زیادہ تاثر پر سخت تنقید کی۔اسلام اور عربیت کے دفاع میں ان کا قلم تیغ بہ دریغ کی طرح چلتا رہا۔ان کے مقالات کا ایک مجموعہ وحی القلم کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

اللہ تعالی نے رافعی سے سماعت کی قوت چھین لی تھی۔لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ صادق الرافعی کو حقائق حیات اور فطرت انسانی کی گہرائیوں میں اترنے اور عقل وفکر کے استعمال کرنے کا موقع ملا۔جب ظاہری دنیا کی آوازیں ان کے لیے خاموش ہوگئیں تو فطرت کی اندرونی آواز کی طرف ان کی توجہ منعطف ہوگئی۔اور اس سمندر سے وہ ایسے موتی لے کر کے آئے جن کا ادراک دوسروں کو حاصل نہ تھا۔ان کی تحریروں میں فکر کا جلال اور اسلوب کا جمال دونوں پائے

جاتے ہیں۔انھیں معانی کی تخلیق اور نازک جذبات کی تصویر کشی پر کمال حاصل تھا۔

احمد لطفی السید (1872 تا 1964)

احمد لطفی السید کے والد کا نام السید پاشا ابوعلی تھا۔ وہ رئیس تھے اور رئیسانہ شان سے رہتے تھے۔انھوں نے اپنے بیٹے کی تربیت پر خاص توجہ کی چنانچہ دس سال کی عمر میں احمد لطفی السید نے قرآن مجید حفظ کرلیا، اس کے بعد انھوں نے منصورہ کے ابتدائی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور پھر قاہرہ کے مدرسہ خدیویہ میں داخلہ لیا اور تمام مضامین پر دسترس حاصل کی اور عربی زبان وادب پر خاص توجہ کی۔انھوں ڈارون کی کتاب کا عربی ترجمہ کیا اصل الانسان پڑھا اور کتاب کے نظریات سے وہ متاثر ہوئے۔پھر احمد لطفی السید نے ازہر میں بھی تعلیم حاصل کی۔پھر لا کالج میں عربی علوم کی کمیٹی میں شیخ محمد عبدہ بھی شریک تھے۔انھوں نے اس ابھرتے ہوئے طالب علم کے اسلوب تحریر کو پسند کیا اور احمد لطفی کو احساس ہوا کہ اس کے اندر انشا پردازانہ صلاحیت موجود ہے۔انھوں نے المؤید کے لیے مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر ان کی ملاقات جمال الدین افغانی سے بھی ہوئی، انھیں کے زیر اثر لطفی السید نے مسلمانوں میں تعلیم اور فکری بیداری پیدا کرنے اور آزادی کی دعوت دینے کی تحریک شروع کی۔ پھر مصطفیٰ کامل سے ان کا تعارف ہوا اور اس طرح انھوں نے دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر کے الحزب الوطنی کی داغ بیل ڈالی۔انھوں نے شیخ محمد عبدہ کے خطبات کے علاوہ قاسم امین اور سعد زغلول کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا۔لطفی السید کی تحریریں برطانوی استعمار کے خلاف مسلسل سامنے آتی رہی ہیں۔1907 میں انھوں نے رسالہ ''الجریدہ'' جاری کیا۔ احمد لطفی السید کا شمار ان مفکرین میں کیا جاتا ہے۔ جو قوم کے درد وغم اور مسائل کا احساس وشعور رکھتے تھے۔مغربی ادبیات سے بھی ان کی واقفیت گہری تھی۔انھوں نے اپنے رسالہ الجریدہ میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر مسلسل مضامین لکھے۔ وہ بعد میں دارالکتب المصریہ کے ناظم بنادیے گئے۔ان کے علمی کاموں میں ارسطو کی کتاب ''الاخلاق'' کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ جب قاہرہ یونیورسٹی قائم کی گئی تو لطفی السید کو اس کا وائس چانسلر بنادیا گیا۔انھوں نے خواتین کے لیے بھی یونی ورسٹی میں داخلہ کے دروازے کھول دیے جب کہ یہ دروازہ پہلے بنت حوا کے لیے بند تھا اور جب یونی ورسٹی کی آزادی پر حکومت کی جانب سے قدغن لگائی گئی تو انھوں یونی ورسٹی سے استعفیٰ دے دیا۔

1932 میں ارسطو کی ایک کتاب کا ترجمہ ''کتاب الکون والفساد'' کے نام سے شائع کیا اور ارسطو کی دوسری کتابوں کے بھی ترجمے کیے۔ ارسطو کی آخری کتاب سیاست کے موضوع پر ہے۔ جسے السیاسۃ کے عنوان سے لطفی نے عربی میں منتقل کیا، اس طرح سے لطفی السید عربی ادب کے علاوہ یونانی افکار ونظریات سے پورے طور پر واقف تھے، ان کی تحریریں فکری اور نظریاتی اعتبار سے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں، انھوں نے الجریدہ کے صفحات میں فرانسیسی انقلاب پر بھی کئی مضامین لکھے اور ان مضامین کا مقصد مصریوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا کرنا اور آزادی کے جذبہ کو پروان چڑھانا تھا۔ احمد لطفی السید کی زبان فصیح وبلیغ زبان تھی۔ انھوں نے اپنے عربی اسلوب کے ذریعہ قوم کے اندر فکر کی گہرائی اور ثقافت کی وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی، قوم کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی تحریریں غموض اور ابہام سے پاک ہیں اور وضاحت اور سادگی ان کی تحریروں کا امتیاز خاص ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے المنتخبات اور تأملات کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مضامین قاری کے دل ودماغ کو فکر کی غذا فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے عربی نثر کو سادہ اور عام فہم نثر بنانے کی کوشش کی، ان کا رسالہ الجریدہ وہ منارہ نور تھا۔ جس سے فکر کی روشنی مصری معاشرے میں پھیل گئی تھی۔

محمد کرد علی (1876 تا 1953)

محمد کرد علی دمشق میں پیدا ہوئے ان کے جد اعلیٰ کردستان سے آکر عراق میں بس گئے تھے۔ ان کی والدہ ترکیہ تھیں۔ کرد علی کی ابتدائی تعلیم شام میں ہوئی۔ پھر وہ مصر چلے گئے اور ان کی ملاقات شیخ محمد عبدہ سے ہوئی جنھوں نے محمد کرد علی کو مس خام سے کندن بنا دیا۔ وہ معروف ادبی اور اصلاحی جرائد المقتطف اور المؤید میں مضامین لکھتے رہے پھر وہ 1908 میں عثمانی دستور کے اعلان کے بعد شام واپس آ گئے اور یہاں سے انھوں نے المقتبس کے نام سے رسالہ نکالا۔ شام سے ترکوں کے اثرات ختم ہونے کے بعد کرد علی ترکی چلے گئے، پھر شام واپس آ گئے۔ اسی سال شام میں المجمع العلمی العربی کا قیام عمل میں آیا اور کرد علی کی کوششوں سے یہ انجمن قائم ہوئی جس نے عرب دنیا کے لیے علمی اور ادبی کام کا نمونہ پیش کیا اور پھر اسی طرز پر مصر وعراق میں بھی انجمنیں قائم ہوئیں جنھوں نے ادبا اور شعرا کا کلام اور مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ کرد علی شام میں

وزارت تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ کرد علی کو کتابوں کا غیر معمولی شوق تھا۔ کتاب ان کی محبوبہ۔ کتاب ان کی لیلیٰ تھی۔ کتابوں کا پڑھنا اور کتابوں کو لکھنا ان کی دوا۔ ان کی غذا اور ان کی شفا تھی۔ عربی ادب کی تاریخ میں جاحظ کتابوں کا بیحد شوقین اور عاشق تھا یہی عشق کی بیماری کرد علی کو عہد حاضر میں لاحق ہوئی تھی۔ کرد علی کی تصنیفات متعدد ہیں۔ ادبی اور اسلامی موضوعات پر انھوں نے بہت لکھا ہے۔ اسلامی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلامی تہذیب کے مختلف نمونوں کو انھوں نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں ادبی قوت اور حرارت موجود ہے، گہرے مطالعہ نے فکر و نظر میں جلا عطا کی ہے۔ ان کے اسلوب میں متانت سلاست اور حسن ترکیب بندش کی چستی اور شوکت الفاظ موجود ہے انھوں نے چھ جلدوں میں خطط الشام لکھی ہے اور ''الاسلام والحضارۃ العربیۃ'' اور ''امراء البیان'' اور ''اقوالنا وافعالنا'' اور ''غوطۃ دمشق'' اور ''دمشق مدینۃ الشعر والسحر'' اور ''کنوز الاجداد'' اور ''المذکرات'' ان کی دوسری کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر احمد امین (1886 تا 1954)

احمد امین کی حیثیت جدید عربی ادب میں ایک درخشاں ستارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ عربی ادب کے آسمان پر تین سب سے درخشاں ستارے جو چمکے اور جن کے علم و ادب کی روشنی سے فضا پر نور بن گئی وہ یہ ہیں۔ احمد امین اور طٰہٰ حسین اور عباس محمود عقاد۔ یہ تینوں عالم بھی تھے دانشور بھی تھے اور ادیب بھی تھے۔ ان تینوں کی ادبیات کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم پر گہری نظر تھی۔ یہی جامعیت ان تینوں کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ احمد امین کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی ابتدا سے عصر عباسی کے زوال تک کی اسلامی تمدن کی پوری تاریخ لکھ ڈالی ہے۔ ان کی کتابیں فجر الاسلام۔ ضحیٰ الاسلام اور ظہر الاسلام ہیں۔ یہ کتابیں اسلام کی تمدنی تاریخ پر ایک جامع انسائکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بہت پر کشش ہے، بہت باوقار اسلوب ہے۔ شبلی کی کتابوں سے احمد امین کی علمیت اور تاریخ دانی اور اسلوب کو سمجھا جا سکتا ہے۔

احمد امین قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زمین داروں کے ظلم سے تنگ آ کر دیہات سے قاہرہ منتقل ہو گئے تھے۔ احمد امین نے لکھا ہے کہ اگر ان کے والد دیہات سے شہر منتقل نہ ہو گئے ہوتے تو وہ شاید گاؤں میں کھیتی کرتے ہوتے اور مویشی چرا رہے ہوتے۔ احمد امین کے والد نے

جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور چونکہ وہ پرویں رقم خطاط تھے اس لیے انھوں نے بہت سی کتابوں کو اپنے قلم سے لکھا اور اس طرح سے مخطوطات کا کتب خانہ تیار کرلیا۔ ان مخطوطات کے درمیان احمد امین نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عرب ادبا میں بیشتر وہ ہیں جنھوں نے بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا تھا ایسی روایت ہندوستان میں نہیں ملتی ہے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی قرآن کا اثر ان کے اسلوب پر پڑتا تھا۔ اس لیے ان کی زبان میں پختگی کے ساتھ دلآویزی پائی جاتی تھی۔ احمد امین نے بھی اسکول کی ابتدائی تعلیم کے بعد جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی وقت سے جبہ ودستار ان کا لباس ہوگیا تھا۔ بعد میں انھوں نے عصری علوم بھی حاصل کیے۔ انگریزی زبان سیکھی جسٹس امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا مطالعہ کیا۔ ان کی مولویانہ شکل وصورت کی وجہ سے بعد میں ان کو شادی میں بھی دشواری ہوئی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی سوانح حیات ''حیاتی'' میں کیا ہے۔ اسی لباس میں وہ عدالت میں جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں انھوں نے اپنا لباس تبدیل کرلیا اور موڈرن انداز اختیار کرلیا۔ حیاتی کا اردو ترجمہ بھی ''زندگی میری'' کے نام سے حیدرآباد سے شائع ہوگیا ہے یہ کتاب عرب دنیا کی علمی اور ادبی پیشرفت کی اچھی تصویر کھینچتی ہے اور احمد امین کی تمام کاوشوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ احمد امین نے بے پناہ مطالعہ کیا اور اس طرح وہ بہت بڑے اسکالر اور مصنف بن گئے۔ وہ مستشرقین کی کتابوں سے بہت متاثر ہوئے اس کی جھلک ان کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے احمد امین کے بہت سے خیالات کی اپنی کتاب 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' میں تردید کی ہے۔ مستشرقین نے احادیث کے سلسلہ میں جو شکوک پھیلائے ہیں ان کی جھلک احمد امین کی کتابوں میں موجود ہے۔

احمد امین کی کتابوں میں تاریخ اسلام سیریز، فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام اور ظہر الاسلام کے علاوہ ''زعماء الاصلاح'' بہت اہم ہے اس کتاب میں عصر حاضر کے رفارمرس یعنی مصلحین کا تذکرہ ہے۔ سرسید کا نام بھی اس میں شامل ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ فیض الخاطر کے نام سے گیارہ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ یہ ''مقالات شبلی'' کے طرز کی کتاب ہے۔ تنقید کے موضوع پر ان کی کتاب ''النقد الادبی'' ایک اہم کتاب ہے۔ احمد کا اسلوب سلجھا ہوا دلکش اسلوب ہے اس میں ادبی

چاشنی بھی ہے اور مواد میں علمیت اور گہرائی بھی ہے۔ان کی تمام کتابیں متانت اور عالمانہ وقار رکھتی ہیں۔

عباس محمود العقاد (1888 تا 1967)

عباس محمود عقاد جدید عربی ادب میں ایک بلند قامت شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں ادیب بھی ہیں صحافی بھی ہیں، نقاد بھی ہیں مورخ بھی ہیں اور ماہر اسلامیات بھی ہیں اور ایک پورے مکتب فکر کے مالک ہیں، سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔انھوں نے اپنی تحریروں سے علم وادب کی دنیا میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی رسمی تعلیم تو زیادہ نہ تھی لیکن وہ بہت وسیع المطالعہ انسان تھے۔انھوں نے انگریزی ادبیات کا بھی بہت مطالعہ کیا تھا کوئی قابل ذکر کتاب ان کے مطالعہ سے چھوٹی نہ تھی۔انھوں نے اپنی خودنوشت ''حیاۃ قلم'' میں اپنی علمی زندگی کا خاکہ تفصیل سے لکھا ہے۔انھوں نے ''الدیوان'' کے نام سے ادبی اور تنقیدی تحریک شروع کی تھی یہ ایک پورا دبستان تھا اس میں عبدالقادر مازنی اور عبدالرحمٰن شکری ان کے خاص رفیق تھے یہ تحریک مغربی ادب سے اخذ واستفادہ کی تجدیدی تحریک تھی۔انھوں نے روایت سے بغاوت کی تھی اور ان ادبا اور شعرا کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا جو گھسا پٹا انداز اختیار کرتے ہیں اور لکیر کے فقیر ہیں۔ان کے یہاں واقعیت پسندی تھی اور رومانیت پسندی سے ان کو بیر تھا اور وہ قدامت پسندی سے بھی متنفر تھے۔اپنے نظریات کے مطابق شعروادب میں وہ اپنی تخلیقات مسلسل پیش کرتے رہے۔انھوں نے تنقیدی کتابوں کے ڈھیر لگا دیے اور ان کا دیوان پر دیوان شائع ہوتا رہا۔ وہ ایک بحر زخار تھے۔ متحرک انسائیکلوپیڈیا تھے۔عربی کے رسائل میں ان کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ہر سال کئی کتابیں ان کی شائع ہوتی تھیں۔علم وادب کا دریا مسلسل موجزن تھا۔ان کی شخصیت کی عظمت کا سب نے اعتراف کیا۔ان کے پاس یونیورسیٹی کی ڈگری نہیں تھی اور وہ کسی یونیورسیٹی میں پروفیسر نہیں تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز کمال علم اور کمال ہنر ہے نہ کہ ڈگری اور منصب۔آج بہت سے پروفیسر اور اساتذہ ہیں جو بے ہنر ہیں۔ان کا کوئی قابل ذکر علمی کام نہیں لیکن بڑے التزام کے ساتھ اپنے عہدے اخبارات میں شائع کرتے رہتے ہیں جو شخص اپنے علمی کام کے اعتبار سے صفر ہو اور اپنی ڈگریوں کا اور منصب کا اظہار کرتا رہے وہ درحقیقت احساس کمتری کا مریض ہوتا ہے اور ہمارے معاشرہ اس طرح کے بہت سے مریض منصب دار اساتذہ پائے جاتے ہیں۔

عقاد کو جو ماحول ملا وہ علمی اور دینی تھا۔ ان کے والد سیرت نبوی کا مطالعہ بہت شغف کے ساتھ کرتے تھے۔ احادیث کا اور سلف صالحین کی کتابوں کا مطالعہ بہت اہتمام سے کرتے تھے۔ گھر میں عبداللہ ندیم کے ادبی مقالات اور شیخ محمد عبدہ کے مضامین اہتمام سے پڑھے جاتے تھے۔ امام غزالی اور شیخ محی الدین عربی کی کتابیں بھی پڑھی جاتی تھیں۔ عباس محمود عقاد نے خاندان کے ماحول سے بہت کچھ اخذ کیا لیکن انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا انھوں نے انگریزی زبان بھی سیکھی اور انگریزی ادبیات کے ذخیرہ کو اپنے حافظہ کا جز بنالیا۔ اس طرح سے ان کی شخصیت جدید اور قدیم کی جامع بن گئی۔ ان کی اپنی خودنوشت ایک تو ''حیاۃ قلم'' ہے اور دوسری ان کی کتاب ''انا'' ہے۔ ان دونوں میں انھوں نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو تفصیل سے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''سارہ'' ان کا ناول ہے یہ ایک ناکام عاشق کے عشق کی داستان ہے۔ ''ساعات بین الکتب'' میں انھوں نے ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان کی ''عبقریات'' ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ان کی کئی کتابوں کا مجموعہ ہے عبقرہ محمد ﷺ اور عبقریۃ ابوبکر اور عبقریۃ عمر اور عبقریۃ عثمان اور عبقریۃ علی اور عبقریۃ خالد بن ولید وغیرہ۔ پھر ان کی کتاب ''القرآن والانسان'' ہے اور ''بحوث اسلامیہ'' ہے ''الدیوان'' کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں عبدالرحمٰن شکری اور عبدالقادر مازنی کے بھی مضامین ہیں۔ انھوں نے ''الکتب والحیاۃ'' کے نام سے بھی کتاب لکھی ہے۔ ان کے مقالات کا مجموعہ کئی جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ ان کا اسلوب عالمانہ ہے پانچ جلدوں میں ان کا دیوان شائع ہوا ہے انھوں نے بہت سے شعرا کے دواوین پر مقدمے لکھے ہیں۔

امیر شکیب ارسلان (1869 تا 1946)

شکیب ارسلان عہد جدید کی بہت اہم علمی اور ادبی شخصیت کا نام ہے۔ لبنان ان کا وطن تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے مدرسۃ الحکمۃ میں داخلہ لیا۔ وہ شیخ محمد عبدہ کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے۔ انھوں نے سید جمال الدین افغانی سے بھی براہ راست تعلق پیدا کیا اور سید رشید رضا سے بھی ان کے مراسم تھے۔ ان کا تعلق عربوں کی سیاسی زندگی سے بھی تھا۔ عربوں کو ترکوں سے بغاوت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے جواب میں انھوں

نے یہ شعر کہا۔

سیعلم قومی اننی لا اغشھم
ومھما استطال اللیل والصبح واصل

ترجمہ: یعنی عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں اس کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں اور رات خواہ کتنی ہی طویل ہو جائے صبح بہر حال آنے والی ہے۔

امیر شکیب ارسلان کی سماجی و سیاسی حیثیت اتنی اونچی تھی کہ جب عربوں نے فلسطین و شام کی آزادی کے لیے قاہرہ میں جلسہ کیا اور جینوا ایک وفد بھیجنا طے کیا تو ان کی نظر امیر شکیب ارسلان پر پڑی اور انھیں برلن سے بلا کر وفد میں شامل کیا گیا، جب 1934 میں ابن سعود اور امام یحییٰ شاہ یمن کے درمیان جنگ ہوئی تو مؤتمر العالم الاسلامی بیت المقدس میں امیر شکیب ارسلان کی صدارت میں ایک وفد بھیجا جس میں انھوں نے دونوں ملک میں صلح کرائی۔

امیر شکیب ارسلان ادب اور شاعری اور سیاست ہر میدان کے شہسوار تھے، انھوں نے سید جمال الدین افغانی کے افکار و خیالات سے اکتساب کیا تھا اور انھوں نے بھی امت کی اصلاح کو زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، شیخ محمد عبدہ سے بھی بہت متاثر تھے۔ ترکی میں جب پارلیمنٹ بنی تو امیر شکیب ارسلان اس کے رکن منتخب ہوئے۔ تمام مسلم رہنماؤں سے ان کی براہ راست واقفیت تھی۔ ایک مستشرق نے عالم اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب پر انھوں نے بہت تفصیلی حواشی لکھے۔ یہ حواشی بہت قیمتی تھے اور جو حاضر العالم الاسلامی کے نام سے شائع ہوئے۔ جب وہ جنیوا سے شام آئے، ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے عربی زبان کی سب سے اہم انجمن المجمع العلمی العربی نے ان کو اپنا صدر منتخب کیا۔

امیر شکیب ارسلان ایک بڑے، اور مصنف اور شاعر تھے۔ ان کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور کتاب حاضر العالم الاسلامی ہے۔ دوسری کتاب انھوں نے مسلمانوں کے عروج و زوال سے متعلق لکھی ہے۔ جس کا نام ''**لماذا تأخر المسلمون ولماذا تقدم غیرھم**'' ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ عرب دنیا کے مشہور ترین شاعر احمد شوقی تھے ان پر ان کی کتاب شوقی واصدقائہ کے نام سے

شائع ہوئی ہے، انھوں نے اپنے رفیق اور دوست رشید رضا پر السید رشید رضا کے نام سے کتاب شائع کی ہے۔ تاریخ اسلام کے موضوع پر ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک غزوات العرب فی فرنسا اور دوسری کتاب خاتمۃ تاریخ العرب فی اندلس ہے۔ امیر شکیب ارسلان بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن چونکہ انھوں نے جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی طرح امت کی اصلاح کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے شاعری سے ہٹ کر نثر کی طرف توجہ کی۔ ان کا اسلوب بیان ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ انھوں نے مقفی اور مرسل دونوں طریقہ اپنی نثر میں استعمال کیا ہے۔ الفاظ منتخب ہیں اور ان کی نشست میں حسن کاری اور فن کاری ہے۔ انھوں نے ابن مقفع کی تصنیف الدرۃ الیتیمہ کو بھی ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ امیر شکیب ارسلان کے اسلوب میں قدامت اور جدت، روایت اور روایت سے بغاوت دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی۔ ان کا اسلوب بہت پرشوکت ہے اور متین اور مرصع ہے۔ اس میں حسن دلکشی و رعنائی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (1888 تا 1956)

محمد حسین ہیکل کی پیدائش مصر کے ایک گاؤں میں ہوئی ان کے والد کا نام حسین سالم ہیکل تھا، حسین آفندی کے نام سے معروف تھے۔ وہ خوش حال اور متمول تھے۔ صاحب جائیداد تھے اور ایک بڑی حویلی میں رہتے تھے۔ ہیکل نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا پھر قاہرہ جا کر مدرسہ جمالیہ میں پڑھا۔ پھر بی ایس سی کی ڈگری لی، قانون کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے فرانس میں پیرس اور سوربون کی یونی ورسٹیوں سے ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے جامعہ قاہرہ میں لیکچر بھی دیے اور لطفی سید کے رسالے الجریدہ میں اور المقتطف میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر وہ ایک بے حد اہم ہفتہ وار رسالہ السیاسیۃ کے ایڈیٹر بن گئے یہ وہ رسالہ تھا جس میں ڈاکٹر طہٰ حسین اور عبدالقادر مازنی جیسے اہل قلم مضامین لکھا کرتے تھے۔ پھر ان کی شہرت اور مقبولیت اتنی بڑھی کہ وہ وزیر داخلہ اور وزیر تعلیم بھی بن گئے۔

محمد حسین ہیکل کی تصنیفات میں ایک بہت اہم کتاب ''زینب'' ہے۔ یہ ناول ہے۔ جسے انھوں نے پیرس میں لکھا تھا، یہ ناول عربی زبان کے بالکل آغاز کے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کا تعلق دیہات سے تھا۔ جسے ایک لڑکی زینب سے

محبت ہوگئی تھی۔ کہانی میں بہت سے موڑ آتے ہیں۔ لیکن اس ناول کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے جدید ناولوں کے دور کا آغاز ہوتا ہے اس میں مصر کے دیہاتوں کی اور ان کی روایات اور توہمات کی بڑی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے اور پھر زبان کی حلاوت اور فصاحت کی وجہ سے بھی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ان کی چودہ پندرہ کتابوں میں ایک کتاب فرانسیسی ادیب اور مفکر جان جوک روسو پر ہے، ایک کتاب کا نام ''فی اوقات الفراغ'' اور پھر سوڈان میں ان کے قیام کی تصویر ان کی کتاب ''عشرۃ ایام فی سوڈان'' میں پائی جاتی ہے۔ ایک کتاب ان کی ''ولدی'' کے نام سے ہے اور خاص ادب کے موضوع پر ان کی کتاب ''ثورۃ الادب'' ہے۔ دینی اور مذہبی کتابوں میں سیرت کے موضوع پر ان کی کتاب ''حیات محمدؐ'' ہے جس میں انھوں نے مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ان کی مذہبی کتابوں میں ''فی منزل الوحی'' اور ''الصدیق ابوبکر'' اور ''الفاروق عمر'' ہے۔ سیاست کے موضوع پر ان کی کتاب ''مذاکرات فی السیاسۃ المصریۃ'' ہے۔ اس کے علاوہ قصے اور افسانے میں ان کی کتاب '' ہکذا خلقت'' ہے۔ یہ ایک مصری عورت کا قصہ ہے۔

محمد حسین ہیکل کو جدید عربی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے، ان کا ناول زینب افسانوی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا اسلوب دلکش اور دل کے اندر اترنے والا ہے۔ محمد حسین ہیکل مصری قومیت کے داعی بھی ہیں اور دریائے نیل کے علاقوں کو دنیا کا حسین ترین علاقہ قرار دیتے ہیں۔ وہ دریائے نیل کے حسن سے اپنی شاعری کے لیے قوت حاصل کرتے ہیں، دوسروں کو بھی دریائے نیل کو اپنے وجدان کا حصہ بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (1889 تا 1973)

دور حاضر میں طٰہٰ حسین کو جتنی شہرت اور جتنی مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور ادیب کو حاصل نہیں ہوئی۔ وہ ایک دانشور۔ ایک مفکر۔ ایک نقاد اور یونیورسٹی کے استاد تھے۔ ان کی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں اور علمی مصروفیتوں میں گذری۔ ادب کے ہر موضوع پر انھوں نے خامہ فرسائی کی۔ جاہلی شاعری اور عباسی شاعری کو خاص طور پر اپنا موضوع قلم بنایا۔ ان کی کتاب ''فی الشعر الجاہلی'' جب شائع ہوئی تو علمی اور ادبی حلقوں میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ انھوں نے کتاب میں بعض نازیبا باتیں بھی لکھیں اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو اساطیری شخصیت

قرار دیا، یہ لکھا کہ ان دونوں کا وجود تاریخ سے ثابت نہیں ہے اور صرف قرآن میں ان کے ذکر کا پایا جانا تاریخی ثبوت فراہم نہیں کرتا ہے۔ اس کتاب پر جتنا ہنگامہ ہوا شاید ہی کسی اور کتاب پر عرب دنیا میں ہوا ہو۔ اس کے علاوہ انھوں نے جاہلی شاعری کو وضع کردہ قرار دیا، یہ لکھا کہ یہ شاعری اموی اور عباسی دور میں کی گئی اور انھیں جاہلی ادب کے شاہکار کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس کتاب کے نسخے قاہرہ کی سڑکوں پر جلائے گئے اور متعدد کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب مصطفیٰ صادق الرافعی ''تحت رایۃ القرآن'' ہے۔ طٰہٰ حسین کی کتاب ''الایام'' ان کی خودنوشت سوانح ہے جس میں انھوں نے اپنے بچپن اور پھر طالب علمی کے زمانے کے حالات بہت موثر اور دلنواز انداز میں تحریر کیے ہیں۔ بچپن ہی میں ان کی بینائی ختم ہوگئی تھی۔ انھوں نے چشم دل سے دنیا کو اور اپنے سماج کو دیکھا۔ یہ سارا قصہ انھوں نے بہت طاقتور ادبی اسلوب میں اپنی خودنوشت سوانح الأیام میں بیان کیا ہے۔

بہت سے ادیبوں نے اپنی خودنوشت سوانح لکھی ہے۔ جس میں احمد امین کی ''حیاتی'' بھی شامل ہے۔ لیکن الأیام میں جو قوت وتأثیر ہے اور جو دلکشی اور بلاغت ہے وہ کسی دوسری خودنوشت سوانح میں موجود نہیں ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے کوئی بھی خودنوشت الأیام کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔ کتاب میں اطناب ہے۔ تفصیل ہے۔ گھر سے لے کر جامع ازہر تک کی منظر کشی ہے۔ اساتذہ اور ان کے طریقہ تدریس کا تذکرہ ہے اور ازہر کے طرز تعلیم پر تنقید ہے۔ طٰہٰ حسین نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی تھی، فرانس میں رہ کر ابن خلدون پر انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی اور اس سے پہلے مصر میں ابوالعلاء معری پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے ناول بھی لکھا ہے۔ جس کا نام ''دعاء الکروان'' ہے۔ متنبّی کی شاعری اور شخصیت پر ان کی پوری کتاب ہے جس کا نام ''مع المتنبی'' ہے۔ ان کی ادبی کتابوں میں ''حافظ وشوقی'' ہے۔ جس میں انھوں نے مصر کے دو معاصر شعرا احمد شوقی اور حافظ ابراہیم کے درمیان موازنہ کیا ہے۔ ادبی موضوعات پر ان کے مقالات کا مجموعہ ''حدیث الأربعاء'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ کتاب کا نام حدیث الاربعاء اس لیے رکھا گیا ہے کہ ہر یوم الاربعاء یعنی چہارشنبہ کو ان کے یہ مضامین اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ سیرت کے موضوع پر ان کی کتاب ''علی ہامش السیرۃ''

ہے جسے ادبی اور افسانوی اسلوب میں انھوں نے پیش کیا ہے۔ ابوالعلاء معری پر بھی ان کی دو کتابیں ہیں۔ ان کی ''دعاء الکروان'' کے علاوہ ایک اور ناول ''شہرزاد'' ہے۔ طٰہٰ حسین نے بہت سے اعزازات حاصل کیے۔ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ وزیر تعلیم ہوئے۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں لیکچر دیے۔ کئی یونی ورسٹیوں سے ان کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ انھوں نے یہ سارا علمی اور ادبی کارنامہ انجام دیا جبکہ وہ نابینا تھے۔ کتابیں پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بلکہ دوسروں سے سنتے تھے اور اپنے مضامین اور اپنی کتابیں املا کراتے تھے۔ ابوالعلاء معری ان کی ایک پسندیدہ شخصیت تھی۔ اس لیے کہ معری بھی طٰہٰ حسین کی طرح نابینا تھا۔ طٰہٰ حسین اپنی خوبصورت زبان اور سحر طراز اسلوب کی وجہ سے عربی زبان وادب کی دنیا میں آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی ان کا نام اور ان کے کام کو یاد کیا جاتا رہے گا۔

توفیق الحکیم (1898 تا 1987)

توفیق الحکیم کی پیدائش مصر میں اسکندریہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چھوٹے سے مدرسہ میں حاصل کرنے کے بعد اسکول میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے میوزک اور اداکاری سے بھی دلچسپی لینا شروع کی۔ ان کی ملاقات محمود تیمور اور ان نوجوانوں سے ہوئی جو اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھتے تھے۔ چنانچہ توفیق الحکیم نے اپنے لیے ڈرامہ نگاری کا میدان منتخب کیا۔ اسٹیج کے لیے انھوں نے شروع میں تین ڈرامے لکھے۔ ایک ''المراۃ الجدیدۃ'' (نئی عورت) اور ''الضیف الثقیل'' (ناخواندہ مہمان) اور تیسرا ڈراما انھوں نے ''علی بابا'' کے نام سے لکھا۔ توفیق الحکیم نے لاء کالج سے گریجویشن کیا اور آگے مزید تعلیم کے لیے وہ پیرس چلے گئے جہاں انھوں نے چار سال گزارے۔ لیکن ان کی زیادہ توجہ قانون کی تعلیم کے بجائے فرانسیسی لٹریچر۔ ناول وافسانوں اور ڈراموں کی طرف مبذول ہوگئی، میوزک سے ان کو خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے اپنے لیے ڈراموں اور افسانوں کا میدان منتخب کیا۔ انھوں نے ''عودۃ الروح'' کے نام سے کہانی لکھی اور جب توفیق الحکیم مصر واپس آئے ان کو وزارت تعلیم میں شعبہ تحقیقات کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ مصر میں لطفی سید اور طٰہٰ حسین کی طرح توفیق الحکیم کا بھی یہ خیال تھا کہ مصریوں کو ثقافت اور فن کے میدان میں ترقی کے لیے یونان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

توفیق الحکیم نے بہت سے ڈرامے لکھے ان ڈراموں میں ''اہل الکہف'' کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کہانی کا موضوع اصحاب کہف سے ماخوذ ہے جن کا قصہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں قوموں میں موجود ہے۔ توفیق الحکیم نے اہل الکہف کی کہانی میں پورے طور پر قرآن کے نقل کردہ قصے کی پیروی نہیں کی ہے۔ اس قصہ سے متعلق مسیحی روایات کو بھی انھوں نے سامنے رکھا ہے اور اس میں ان کا اپنا تخلیقی ذہن بھی کام کرتا رہا ہے۔ توفیق الحکیم نے اس ڈارامے میں اور اپنی بعض دوسری تخلیقات میں بھی یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کوئی غیبی طاقت ہے جو انسان کو کنٹرول کرتی ہے۔ وہ اس کائنات میں تنہا نہیں رہتا بلکہ قوت الٰہیہ ہر وقت اس پر سایہ فگن رہتی ہے۔ یہی قوت اس کو راستہ دکھاتی ہے۔ اس کے دل میں بات ڈالتی ہے اور دائیں بائیں چلنے کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس طرح سے توفیق الحکیم نے ایک صوفیانہ شعور اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

توفیق الحکیم نے ڈرامے کے اسلوب میں سیرت نبوی کے موضوع پر اپنی کتاب ''محمد'' شائع کی۔ اس میں سیرت کے واقعات کو ڈرامے کے فن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ توفیق الحکیم نے ایک کتاب مشرقی افکار ونظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے ''عصفور من الشرق'' لکھی اور مغرب کی مادہ پرستی کے مقابلے میں مشرق کے روحانی نظریات کی حمایت کی ہے۔ ان کی ایک کتاب ''یومیات نائب فی الأریاف'' ہے۔ جس میں انھوں نے گاؤں اور کھیت کھلیان اور وہاں کے لوگوں کی سادہ زندگی کی بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

توفیق الحکیم کے ڈراموں میں ایک بہت اہم تخلیق ''شہرزاد'' ہے۔ اس ڈرامے میں توفیق الحکیم نے الف لیلیٰ کی کہانیوں سے اکتساب فن کیا ہے۔ اس کہانی کا موضوع وہی ہے جو الف لیلیٰ میں ہے۔ یعنی ایران کے بادشاہ شہریار نے اپنی بیوی کو غلام کے ساتھ ملوث پایا تو اس پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ وہ ہر روز ایک لڑکی سے شادی کرتا اور صبح اپنے انتقامی جذبہ کے ساتھ اسے قتل کر دیتا۔ پھر شادی کے لیے قرعہ فال وزیر کی بیٹی شہرزاد پر پڑا۔ وہ بہت عقلمند۔ زیرک اور ہوشیار تھی۔ وہ ہر رات شہریار کو ایک بہت دلچسپ قصہ سناتی اور یہ قصہ جب اپنی دلچسپی کے عروج پر ہوتا تو صبح ہو جاتی اور اس طرح باقی قصے کو اگلی رات کے لیے ملتوی کر دیتی۔ بادشاہ شہریار شوق انتظار

میں قتل کرنے کے بجائے کہانی سننے کو ترجیح دیتا۔ شہرزاد کہانی سے ایک دوسری کہانی نکالتی اس طرح سے کہانی ایک ہزار ایک رات تک چلتی رہی۔ اس بیچ میں وہ شہریار کے بچے کی ماں بھی بن گئی اور آخر میں شہریار نے اسے زندہ رکھنے اور معاف کر دینے کا فیصلہ کیا۔

توفیق الحکیم کی دوسری کہانیاں بھی ہیں۔ ایک کہانی کا نام ہے ''سلیمان الحکیم'' اور دوسری کہانی کا نام ہے ''الملک اودیب''۔ ان کی ایک اور ٹریجڈی کہانی ہے جس کا نام ''پیچمالیون'' (Pygmalion) ہے۔ یہ ایک یونانی مجسمہ ساز کی کہانی ہے۔ جس نے بڑے خوبصورت مجسمے بنائے اور پھر اس نے یونانی معبود وینس یعنی ستارہ زہرہ سے اس میں روح پھونکنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ مجسمہ میں روح پھونکی گئی اور مجسمہ کو ایک زندہ عورت میں تبدیل کر دیا گیا۔

عہد الشیطان'' کے نام ان کی کہانیاں اخبارات میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں، توفیق الحکیم کو مصر میں ان کے فن کے اعتراف میں بہت سے اعزازات اور انعام دیے گئے۔

نجیب محفوظ (1911 تا 2006)

نجیب محفوظ قاہرہ کے ایک محلے الجمالیہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں انھوں نے اسکول کی تعلیم اور کالج کی تعلیم حاصل کی۔ وہ یونی ورسٹی میں اور پھر وزارت اوقاف میں ملازمت کرتے رہے۔ نجیب محفوظ صف اول کے ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی فنی خدمات کے اعتراف میں نوبل پرائز بھی دیا گیا۔ یہ انعام خاص طور پر ان کی کتاب ''اولاد حارتنا'' پر دیا گیا ہے۔ جسے مذہبی حلقے نے سخت ناپسند کیا۔ ایک خیالی اور تمثالی طور پر ایک مکان اور محلّہ کا ذکر ہے۔ اس میں اس مکان کے مالک کو جبلاوی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جس طرح سے پوری دنیا ایک مکان ہے اور اس کا ایک خالق ہے اسی طرح سے اس مکان کا بھی ایک خالق ہے۔ جس کا نام جبلاوی ہے۔ اس میں مختلف پیغمبروں کے نام کی معمولی تبدیلی کے ساتھ ذکر ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے لیے قاسم کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح اس میں حضرت عائشہ اور حضرت خدیجہ کا بھی ذکر ہے۔ چونکہ جنت سے سطح زمین پر آنے کے لیے ہمارے مذہبی لٹریچر میں آدم اور ابلیس کا تذکرہ ہے اسی طرح اولاد حارتنا میں ادریس اور ادہم کا تذکرہ ہے۔ دوسرے انبیاء کے استعاراتی نام بھی اس کتاب میں موجود ہیں اور کہانی کا اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ عقل و علم کا دور غالب آتا ہے۔

مذہب اور اس کے نمائندے کی شکست ہو جاتی ہے اور جبلاوی جو گھر کا مالک ہے مر جاتا ہے۔ اس ناول پر پوری دنیا میں ہنگامہ ہوا اور بالآخر مصر میں اس ناول پر پابندی لگا دی گئی۔ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ نوبل انعام نجیب محفوظ کو اسی لیے دیا گیا تھا کہ اس نے مذہب اسلام کو اور خدا کے عقیدہ کو مذاق اور استہزا کا شکار بنایا تھا۔ نجیب محفوظ نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی بھی پرزور حمایت کی تھی اور اسرائیل میں اس کا پرزور استقبال بھی ہوا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ نجیب محفوظ کو جو اتنا بلند مرتبت انعام ملا اس میں یہ عوامل بھی کارفرما ہیں۔

نجیب محفوظ کے ناولوں کی تعداد 31 ہے اور انھوں نے دس افسانے لکھے ہیں۔ ان کے ناول میں ایک طویل اور ضخیم ناول وہ ہے جسے ''ثلاثیات نجیب محفوظ'' کہتے ہیں۔ یہ ناول تین ناول کا مرکب ہے ایک کا نام ہے قصر الشوق اور دوسرے کا نام ہے بین القصرین اور تیسرے کا نام ہے ''السکریۃ''۔ یہ ضخیم ناول یا تین ناولوں کا مجموعہ تین نسلوں کی کہانی ہے۔ پہلی نسل سید احمد عبدالجواد کی ہے۔ جس کی عمر 45 سال ہے جو بظاہر قدیم تہذیب اور مشرقی اقدار کا علم بردار ہے۔ اس کی بہت بارعب شخصیت ہے لیکن اس شخصیت کا ایک دوسرا مخفی پہلو ہے۔ اس مخفی زندگی میں وہ بہت رنگین اور رقص وسرور کا دلدادہ ہے گویا وہ ایک منافقانہ زندگی گزارتا ہے۔ دوسرے ناول ''قصر الشوق'' میں احمد الجواد کے بیٹوں کا کردار ہے۔ یہ خاندان پرانے گھر سے قصر الشوق میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس نسل کے لوگ یورپ کے فلسفہ سے متأثر ہیں اور اس ناول کا تیسرا حصہ جو السکریہ کے نام سے ہے۔ اس میں بالکل نئی تہذیب اور نئے نظریات ہیں۔ بہت سے کردار ہیں جو اشتراکیت اور مارکسی فلسفہ کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہ نجیب محفوظ کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک ہی خاندان کے تین نسلوں کی کہانی پیش کی ہے اور افکار ونظریات اور تہذیب ومعاشرت میں جو تبدیلیاں رفتہ رفتہ داخل ہوتی رہیں ان کی فنکارانہ منظر کشی کی گئی ہے۔ نجیب محفوظ نے تاریخی ناول بھی لکھے ہیں۔ یہ ناول فرعونی عہد سے متعلق ہیں۔

نجیب محفوظ کا اسلوب وہ اسلوب ہے جو اچھے ناول کے شایان شان ہے۔ سادہ ہے لیکن موثر ہے وہ سلیس زبان میں سارے مکالمے اور قصے تحریر کرتے ہیں۔

مراجع باب سوم وباب چہارم

1۔ تاریخ الأدب العربی۔احمد حسن زیات
2۔ تاریخ الأدب العربی۔حنا فاخوری
3۔ اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث۔
4۔ عربی ادب کی تنقیدی تاریخ۔ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
5۔ تاریخ ادب عربی۔پروفیسر عبدالحلیم ندوی
6۔ تاریخ ادب عربی۔مرتضیٰ حسن ازہری
7۔ جدید عربی شاعری۔ڈاکٹر شمس کمال انجم

باب پنجم

فارسی زبان کے شعرا

موضوع کا تعارف

ایران میں اچھی فارسی شاعری اسلام کی آمد کے بعد شروع ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے 21 سال کے بعد ایرانیوں اور عربوں میں وہ مشہور جنگ ہوئی جسے عربوں نے ''فتح الفتوح'' کا نام دیا۔ یہ جنگ نہاوند کے مقام پر ہوئی، اس جنگ میں ساسانیوں کے بادشاہ یزدگرد نے بہت بڑی فوج جمع کرنے کے باوجود شکست کھائی اور اس طرح سے ایرانی سلطنت اسلامی خلافت کے تابع ہوگئی۔ اس کے بعد دوسو سال سے زیادہ عرصے تک عرب ایران پر حکومت کرتے رہے۔ ایران میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور بہت بڑے پیمانے پر لوگوں نے اس دین کو قبول کرلیا، اس طرح سے اسلام کا سیاسی غلبہ معنوی اور دینی غلبہ سے بدل گیا۔ ایرانیوں نے بھی عربوں کی تعلیم کو اپنے مزاج اور اپنے ذوق کے مطابق ڈھالنا شروع کیا، اپنے تمدن اور اپنے افکار سے عربوں کو متاثر کرنا شروع کیا اور جب اموی حکومت کے زمانے میں غیر عرب عربوں کے ظلم کا شکار ہوئے تو ایرانیوں نے مزاحمت کی اور ایک تحریک شروع کی جو شعوبی تحریک کہلاتی ہے اور اہل بیت یعنی آل علی رضی اللہ عنہ

بنی امیہ کی مخالفت کر رہے تھے اور حضرت حسین نے شہادت کا جامہ زیب تن کر لیا۔ اس لیے تمام ایرانی بنو امیہ کے مخالف اور آل علی کے طرفدار ہو گئے۔

عربی زبان ایران کے دیار و امصار پر پورے طور پر چھا گئی۔ ایرانیوں نے دین اسلام بھی قبول کیا اور عربی زبان سیکھ کر اس میں مہارت حاصل کی۔ چنانچہ بے شمار ایرانی عربی زبان کے ماہر ہوئے، بہت سے لوگ اسلامی علوم و فنون میں بھی ممتاز ہوئے۔ عبداللہ بن مقفع جس کی عربی ادب میں اتنی شہرت ہے۔ وہ ایرانی تھا۔ بشار ابن برد اور ابونواس جیسا شاعر ایرانی تھا۔ امام ابوحنیفہ جیسے فقہ کے زبردست عالم ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ سیبویہ جیسا نحوی ایران کا رہنے والا تھا۔ الغرض تھوڑے عرصے میں ایرانی عربی زبان کے ماہر بن گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بتدریج ایران میں فارسی زبان کا احیا ہوا۔ عربوں اور ایرانیوں میں رشتہ داریاں بھی قائم ہوئیں۔ ہارون رشید کے بیٹے مامون کی ماں ایرانی تھیں۔ اسلام کی آمد کے دو سو سال کے بعد ایران میں فارسی شاعری کو ترقی حاصل ہوئی اور ایران شعر و موسیقی کا گہوارہ بن گیا۔ کئی شاعر فارسی زبان کے منظر عام پر آئے۔ لیکن فارسی ادبیات کا عروج سامانی دور حکومت میں ملا۔

رودکی سمرقندی (858 تا 930)

ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب ایک قصبہ رودک میں پیدا ہوا۔ رودکی کو ایران کا سب سے پہلا بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے اشعار اس کی فضیلت اور بلند خیالی کو ثابت کرتے ہیں، بعد کے شعرا نے اس کی بہت تعریف کی ہے اور غزل کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ رودکی مادرزاد اندھا تھا۔ اس نے آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا اور پھر علم قراءت کی تکمیل کی اور اسی سن میں شعر کہنا شروع کیا۔ شاعری کے مشغلے کے تمام متداول علوم و فنون حاصل کیے۔ خوش قسمتی سے وہ بہت خوش آواز تھا، طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی اس وجہ سے شاہی دربار میں اسے ندیم کا منصب ملا، اسے ایسی جاہ و منزلت حاصل ہوئی کہ دوسرے اس پر رشک کرتے تھے۔ رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی۔ پند و موعظت اور حسن تأثیر ہے۔ عرب جاہلیت کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے انقلابات پیدا ہو جاتے تھے۔ رودکی نے عربی شاعری سے بھی کسب فیض کیا۔ مضامین کے لحاظ سے رودکی کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس

میں واقعہ نگاری بھی ہے۔ خیال بندی بھی ہے۔ موعظت و نصیحت اور عشق و محبت یہ ساری چیزیں ہیں اور صنائع بدائع کا استعمال بھی ہے۔ اخلاق و موعظت کا مضمون اسی طرح اس کے یہاں ہے۔ وہ کہتا ہے۔

زمانہ پندے آزاد وار داد مرا زمانہ را چونکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار بسا کسا کہ بروز تو آرزو مند است

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمھاری حالت پر رشک کرتے ہیں۔ اس لیے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں۔

رودکی کے کلام میں بادشاہ کی قصیدہ خوانی بھی پائی جاتی ہے۔ مدحیہ شاعری کے یہ نمونے اعلیٰ درجہ کے ہیں اور ان میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

شاہ کہ بروز رزم از راوی زریں نہد بہ تیر در پیکاں
تا کشتہ او ازاں کفن سازد تا خستہ او ازاں کند درماں

یعنی بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے کہ لڑائی میں جو تیر استعمال کرتا ہے اس کی پیکان سونے کی ہوتی ہے۔ جس سے یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکان کو بیچ کر اپنا علاج کر سکے اور اگر مر جائے یہ سونا تجہیز و تکفین کے کام آئے۔

رودکی نے مرثیے بھی بہت سے لکھے ہیں اور ان مرثیوں میں ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ وزیر اعظم کے بیٹے کی وفات پر اس نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ طویل ہے جس کے تین شعر یہ ہیں۔

اے آں کہ غمگینی وسزاواری واندر نہاں سر شک ہمی باری
رفت آن کہ رفت۔ آمد آں کہ آمد بود انچہ بود۔ خیرہ چہ غم داری
ہموار کرد خواہی گیتی را ؟ گیتی است کے پذیرد ہمواری

یعنی اے وہ شخص! جو غمزدہ ہے اور جسے غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے جو چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے اب غم کا کیا فائدہ۔ کیونکہ جسے جانا تھا وہ چلا گیا اور جسے آنا ہے وہ آئے گا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تم زمانے کو ہموار کرنا چاہتے ہو۔ زمانے کو کون ہموار کر سکتا ہے۔

دقیقی (1009)

فارسی زبان میں جو شاعری میں قابل فخر سرمایہ ہے وہ شاہنامہ ہے، شاہنامہ کی ابتدا دقیقی سے ہوتی ہے اور شاہ نامے کا ابتدائی خاکہ اسی کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہش مند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم تک عام زبانوں پر چڑھ جائے۔ لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ شعر کے قالب میں ڈھل جائے۔ جب دقیقی کی شہرت شاعری کے میدان میں ہوئی تو بادشاہ نے اسے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ یعنی بادشاہی کی تاریخ اسے لکھنے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ اس نے کئی ہزار شعر لکھے۔ بعد میں مشہور شاعر فردوسی نے بھی شاہ نامہ لکھا اور دقیقی اشعار بھی اپنے شاہنامے میں شامل کیے۔ فردوسی بہت بڑا شاعر ہے۔ وہ خدائے سخن ہے، اس کا شاہنامہ فارسی شاعری کی دامن کا گوہر بے بہا ہے۔ لیکن اس شاہنامے کی ابتدا دقیقی نے کی ہے۔ دقیقی نے مثنویاں بھی لکھی ہیں، اس نے غزل اور قصیدے کو بھی ترقی دی ہے۔ اس کے یہاں نیچرل شاعری بھی پائی جاتی ہے۔ اس نے ایک قصیدے میں بہار کا سما دکھایا ہے، اس نے خوش رنگ اور رنگ بہ رنگ پھولوں کی تصویر کھینچ دی ہے۔

عنصری (350ھ)

عنصری غزنوی خاندان کے محمود غزنوی کے دربار کا شاعر ہے۔ محمود غزنوی صرف فاتح اور کشور کشا نہیں تھا بلکہ علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک مستند کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ''جواہر مضیئہ'' ہے۔ اس نے ایک عجائب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ جس میں تمام دنیا کے نوادر تھے۔ ملک میں جو مشاہیر فن تھے ان کو بلا کر اس نے دربار میں جگہ دی تھی۔ چنانچہ اس کے دربار کی شخصیات میں۔ ابوریحان بیرونی بھی تھا۔ جو بوعلی سینا کا علوم وفنون میں ہم پایہ اور ہم سر تھا، عنصری کو بھی اس دربار میں جگہ ملی تھی۔ محمود غزنوی نے عنصری کو ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ عنصری کے علاوہ چار سو شاعر تھے۔ جو محمود کے خوان کرم سے بہرہ یاب ہوتے تھے، ان شاعروں کو محمود کی طرف سے حکم تھا کہ جو کچھ شاعری کریں وہ پہلے عنصری کو دکھلا دیں اور پھر بادشاہ کے سامنے پیش کریں۔ بادشاہ ہر شاعر کو بیس بیس ہزار درہم اور عنصری کو پچاس

ہزار درہم دیا کرتا تھا، ایک رباعی کہنے پر بادشاہ نے حکم دیا کہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ محمود غزنوی نے فردوسی سے شاہنامہ لکھوایا تھا۔ جس کی وجہ سے دنیا رستم وسہراب کو اور افراسیاب اور اسفندیار کو آج تک یاد کرتی ہے۔

عنصری کا پورا نام حسن بن احمد تھا۔ وہ بلخ کا رہنے والا تھا۔ اس کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ اس نے تمام متداول علوم وفنون حاصل کیے تھے۔ لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا۔ محمود غزنوی کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو مالا مال کر دیا، جب وہ سفر کرتا تو اس کا ساز وسامان جو طلائی اور نقرئی ہوتا چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا۔ عنصری کے اشعار کی تعداد بیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ جس میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں۔ قصائد کے علاوہ متعدد مثنویاں بھی اس نے لکھی ہیں۔ اس کے یہاں غزلیہ مضامین بھی پائے جاتے ہیں۔ مناظر قدرت اور چیزوں کے اوصاف بھی اس نے بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ مثلاً موسم بہار پر اس کے اشعار ہیں جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے اور درخت کانوں میں سونے کے بندے ڈال دیتے ہیں۔

ابر نوروزی ہمی دربار دو بت گر شود — تاز صنعش ہر درختے لعبتے دیگر شود
باغ ہمچوں کلبہ بزاز پر دیبا شود — باد ہمچوں طبلہ عطار پر عنبر شود
روے بند ہر زمینے حلہ چینی شود — گوشوار ہر درختے رشتہ گوہر شود

فرخی (1248 تا 1318)

محمود غزنوی کے دربار کے ممتاز اور مشہور شعرا میں فرخی ہے، اس کا پورا نام علی کنیت ابوالحسن ہے۔ یہ سیستان کا رہنے والا تھا۔ فرخی کو قدرت نے ذوق لطیف۔ فطری صلاحیت اور دلکش آواز سے خوب نوازا تھا۔ رباب و چنگ بھی خوب بجاتا تھا۔ شعر اور خاص کر قصیدہ خوب کہتا تھا، اس فن میں اس نے ایک خاص طرز ایجاد کی تھی۔ محمود غزنوی کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے فرخی سیستان میں پیشہ زراعت سے وابستہ تھا۔ اس نے ابوالمظفر احمد چغانی کے انعام واکرام کی شہرت سنی تو اس کے دربار کے ارادے سے ایک کارواں کے ساتھ ہو گیا۔ امیر کی مدح میں اس نے ایک قصیدہ لکھا۔ وہ چغانیہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر اپنے گھوڑوں کو داغ دینے کے لیے داغ گاہ

گیا ہے۔ اسے داغ گاہ لے جایا گیا اور اس نے داغ گاہ کی خوبصورتی اور پر لطف آب وہوا کے بارے میں قصیدہ لکھا، شاعر کو انعام سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے بعد فرخی سلطان محمود غزنوی کے دربار میں پہنچا اور یہاں بھی سلطان محمود نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور اس نے دولت اور عزت جلد حاصل کر لی اور مقرب بارگاہ بن گیا۔ اس نے نہایت فراغت وآرام کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اس کی عمر ساز و چنگ۔ نغمہ وشعر گوئی، حسن وعشق کی فضا میں گونجی۔ فرخی کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں، ان میں قصیدے بھی ہیں غزلیں بھی ہیں اور رباعیاں بھی ہیں۔ نثر میں اس کی کتاب ''ترجمان البلاغۃ'' ہے۔ لیکن اب ناپید ہے۔ غزل میں اس کی تصویریں بہت لطیف ہیں۔ اس کے بیشتر اشعار سادہ اور شیریں ہیں۔ اس نے اپنے قصیدوں میں ممدوح کو بلند اوصاف اور پاکیزہ اخلاق کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کا ممدوح سخن ور ہے۔ سخن فہم اور انسانیت نواز ہے۔ سخی ایسا ہے کہ اس کی نظر میں سونا خش وخاشاک کے برابر ہے۔ اس کے قصیدوں کی ابتدا میں بہار کی زیبائش اور فطری مناظر، شراب کی تعریف اور معشوق کا وصف بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ابر وباد کی اس نے بڑی خوبصورت سے تعریف کی ہے۔

ابر آمد نیلگوں ابری زروی نیلگوں دریا　　چورائی عاشقاں گردان چوطبع بیدلاں شد
چو گردان گشتہ سیلابی میان آب آسودہ　　چوگردان گردبادی تندگردی تیرہ اندروا
بیارید وذہم بگسست وگرداں گشت برگردوں　　چو پیلان پراگندہ میاں آبگوں صحرا
تو گفتی گرد زنگارست بر آئینہ چینی　　تو گوئی موئی سنجابست بر پیروز گون دیبا

شاعر نے ان اشعار میں فطرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ابر کے ٹکڑے گویا عاشقوں اور دلسوختوں کی طرح سرگرداں پڑے پھر رہے ہیں۔ پھر انھیں پانی میں اٹھنے والی موجوں سے ہوا میں اٹھنے والے بگولوں سے دریا کے مرغزار ساحل پر پرواز کرنے والے بچہ گان عنقا سے تشبیہ دی ہے۔ دلکش فطری مناظر کی عکاسی کے ساتھ فرخی کے اشعار تشبیہوں۔ استعاروں اور کنایوں سے خالی نہیں۔ اس نے اپنے اشعار میں رات کو زنگی سے اور صبح کو چاند سے۔ شراب کو عقیق سے۔ صبح کے اجالے کو چادر سے قد کو سرو سے بید کو طوطی کے پر سے۔ ارغوان کو لعل بدخشانی سے اور باغ کو بوقلموں سے تشبیہ دی ہے۔ فرخی نے تغزل میں عجیب رنگا رنگ پھول کھلائے اور اس میں نادر رنگ آمیزی کی

ہے اور فطرت کی مستی کو اپنے کلام میں سمو دیا ہے۔

منوچہری (432ھ)

منوچہری کا وطن دامغان تھا۔ احمد نام تھا، ابوالنجم کنیت تھی، منوچہری تخلص تھا۔ نہایت دولتمند تھا اور منوچہر کے امیر کے دربار میں ملازم تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے کے دربار میں اس کی آمد و رفت تھی اور جب مسعود تخت سلطنت پر جلوس افروز ہوا تو اس نے اس کی شان میں قصیدے لکھے۔ اس نے سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا ہے۔ اس کے دیوان میں تین ہزار شعر موجود ہیں۔ فرانس میں اس کا دیوان بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرا عرب کی تقلید کرتا ہے۔ اس نے امیر کی مدح میں قصیدے لکھے۔ وہ امیر کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

شنیدم کہ اعشی بہ شہر یمن شد　　سوئے سودہ بن علی الیمانی
برو خواند شعرے بالفاظ تازی　　بہ شیریں معانی وشیریں زبانی

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ شاعر اعشی جس کا تعلق شہر یمن سے ہے۔ وہ سودہ بن علی الیمانی کے پاس گیا اور اس نے عربی زبان میں تعریف میں شعری قصیدہ کہا اب یہ قصیدہ الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے بہت شیریں تھا۔ فارسی کے دوسرے شعرا کے برخلاف منوچہری کو عرب شعرا کے دیوان حفظ تھے۔ وہ اپنے ایک شعر میں حاسد کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر　　تو ندانی خواند الاھبی بصحنک فاصبحین

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے عربوں کے بیسوں دیوان زبانی یاد ہیں اور تو سبع معلقہ کا ایک قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ یہاں بصحنک فاصبحین سے مراد سبع معلقہ کا یہ شعر ہے۔

الاھبی بصحنک فاصبحینا　　ولاتبقی خمور الأندرینا

اس کے کلام میں عربی تلمیحات بہت کثرت سے ملتی ہیں اور عربی اشعار میں جن معشوقوں کے نام آتے ہیں۔ جیسے: لیلیٰ۔ سلمیٰ۔ رباب ان سب کا وہ تذکرہ کرتا ہے۔ اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی۔ روانی اور شستگی ہے۔ اس کی ردیفیں بہت شگفتہ اور سامعہ نواز ہوتی ہیں۔ اس نے مناظر قدرت کا نقشہ بھی نہایت خوبی سے کھینچا ہے۔ صحرا۔ بادل۔ سیلاب اور ہوا کا

تذکرہ اس کے قصیدوں میں بہت ملتا ہے۔ ایک قصیدے میں وہ بارش و بادل کا تذکرہ کرتا ہے۔ بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہے اور کبھی ننی ننی پھوہار پڑتی ہے۔ کبھی جھڑی لگ جاتی ہے۔ سبزے پر مختلف قسم کے پھولوں پر تالاب کی سطح پر۔ بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر ایک کا الگ الگ سماں ہوتا ہے۔

فردوسی (329 تا 411ھ)

فردوسی کا نام حسن بن اسحاق تھا۔ فردوسی تخلص تھا۔ وطن اس کا طبرستان کے گرد و نواح میں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا وطن طوس تھا۔ خاندان کا پیشہ زمینداری تھا۔ معاش کی طرف سے فارغ البال تھا اور اطمینان کے ساتھ علمی مشغلوں میں زندگی بسر کرتا تھا اور کتب بینی اس کی عادت تھی۔ جب فردوسی محمود غزنوی کے دربار میں گیا اور بادشاہ پر اس کی شاعری کا جوہر کھلا تو اسے شاہنامے کی تصنیف پر مامور کیا گیا۔ بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے کیونکہ شاہنامے کی تصنیف میں 35 برس صرف ہوئے اور سلطان محمود کی مدت سلطنت 31 برس ہے۔ فردوسی کے شاہنامے کا آج ہر جگہ چرچہ ہے اور ایران کی تاریخ کا ایک قابل لحاظ حصہ اس کتاب میں آ گیا ہے۔ فردوسی کو سلطان محمود غزنوی نے بلایا۔ فردوسی ہرات سے چل کر غزنی آیا۔ فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھ کر سلطان متاثر ہوا اور شاہنامے کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی، حکم ہوا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا گیا جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ اور آلات جنگ اور شاہان عجم کے مرقعوں اور تصویروں سے اسے سجایا گیا۔ ایک ایک شعر پر ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا، حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جائیں۔ فردوسی کے سلطان سے تعلقات بعد میں کشیدہ ہو گئے تھے، اس شاہنامے کی تصنیف کا انعام بھی اسے اس قدر نہیں ملا جتنی کہ اس نے توقع کی تھی، تعلقات کی کشیدگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ فردوسی نے غزنی سے واپس جاتے ہوئے سلطان محمود کے نام ایک لفافہ بھیجا جس میں اس کی ہجو تھی۔ شاہنامے کی وجہ سے ایران کی شاہنشاہیت اور وہاں کے مشہور شخصیات کا نام زندہ ہو گیا۔ اس میں نوشیرواں اور اردشیر اور دیگر بادشاہوں اور سلاطین کا تذکرہ ہے۔ گویا ایران کی تاریخ اس میں سمٹ آئی ہے۔ اگرچہ عجم نیست و نابود ہو گیا لیکن شاہنامے کی وجہ سے ایران کی شخصیات زندہ اور پائندہ

ہیں۔شاہنامے میں ایران کے ہیرو افراسیاب اور اس کی بیٹی منیرہ اور اسی کے ساتھ بہارو مرغزار سب کی تصویر شاعرانہ کمال کے ساتھ کی ہے۔اس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

همه بیشه و باغ وآب رواں یکے جایگاں از در پہلواں
زمیں پر نیان وہوا مشک بوے گلا بست گوئی مگر آب جوی
خم آوردہ از بار شاخ سمن صنم شد گل و گشت بلبل سمن

حکیم سنائی (467 تا 529ھ)

ان کا پورا نام ابوالمجد مجدد دین آدم السنائی ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے بڑے شاعر تھے۔ اوائل جوانی میں غزنوی دربار سے انساب رکھتے تھے، انھوں نے اس خاندان کے بعض بادشاہوں کی جیسے بہرام شاہ وغیرہ کی اپنے اشعار میں مدح کی ہے۔انھوں نے حج بیت اللہ کیا اور خراسان کے اکثر شہروں کی سیاحت کی ۔ درویشوں سے اور صوفیا کرام سے ملاقاتیں کیں۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ سنائی کے دیوان میں اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔لیکن دیوان سنائی کے اب جو نسخے ملتے ہیں ان میں بارہ ہزار یا اس سے زیادہ اشعار ملتے ہیں۔ان میں قصائد۔ غزلیات اور رباعیات ہیں۔ یہ سب نہایت رواں ۔محکم اور پختہ کلام ہے۔ان کو ایران کا سب سے بڑا صوفی شاعر سمجھا جاتا ہے۔اقبال نے بھی اپنے شعر میں تعریف کی ہے اور کہا ہے۔

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوے لالا

سنائی کے کلام میں ہمیں تزکیہ نفس۔ترک غرور اور ترک ظاہر کی تعلیمات ملتی ہیں، یہ پیغام ملتا ہے۔کہ جاہ و مال کا بندہ نہ بن اور یہ درس ملتا ہے کہ مال سخاوت اور بخشش کے لیے ہے۔ انھوں نے انصاف کرنے کی تلقین کی ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر عمر جاوداں کی خواہش ہے تو جسمانی زندگی کی ہوس مت کر، اگر زہرہ کی طرح اوج آسمان پر جلوہ گر ہونا چاہتا ہے تو علم و دانش حاصل کر۔ دیوان سنائی میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں لوگوں کی ظاہر داری اور ریاکاری اور بے وفائی کی مذمت کی گئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ انسان کے لیے بہترین رہنما اس کی عقل ہے۔

عقل در راہ حق وکیل تو بس عقل ہر جا یگہ خلیل تو بس

عقل خود کارہا ی بذنکند ہر چہ آن ناپسند خود نکند
عقل در ہیچ دل ستم نکند بطمع قصد مدح وذم نکند

تشبیب اور قصائد میں ان کے یہاں اگر چہ کوئی جدت نہیں ہے لیکن پختگی۔ برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے۔ قصیدے کے چند اشعار دیکھیے۔

دوش سرمست گاری من آں طرفہ پسر با یک پیر ہنے با گلہے طرفہ بہ سر
از سر کوچہ فرود آمد متواری وار کردہ از غایت دل تنگی صد گونہ بطر

کہ خیالات اور طرز ادا میں کہیں جدت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً کمر بر وسحر بر وشجر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں ایک قطعہ بند ہے۔

در زینت ودر رنگ کلاہ و کمر خویش زحمت چہ کشتی در طلب گوہر زر بر
ایں اشک من ورنگ رخ من ببرائے شوخ ایں را بکلاہ بر زن وآں را بہ کمر بر

یعنی اے معشوق اپنے کمر بند اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ میرا آنسو اور میرے چہرے کا رنگ لے کر کلاہ اور کمر پر لگالے کہ زر و گوہر کا کام دیں گے۔ آنسو گوہر اور چہرہ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے۔

جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے کم شعرا میں پائی جاتی ہے۔ فارسی شعرا میں مولانا روم کے یہاں جوش وسرمستی موجود ہے۔ لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیش رو ہیں۔ دو شعر ان کے ہیں۔ مضمون اور انداز بیان جوش سے لبریز ہے۔

یا برو ہمچوں زناں رنگے وبوی پوش گیر یا چو مرداں اندر آئے وگوی درمیاں فگن
چوں دو عالم زیر پایت قطع شد پای بکوب چوں دوکوں اندر دوستست جمع شد دستی بزن

چند شعر اور ملاحظہ ہوں۔

طلب اے عاشقان خوش رفتار طرب اے شاہدان شیریں کار
تا کے از خانہ ہاں رہ سہرا تا کے از کعبہ ہیں در خمار
در جہاں شاہدے وما فارغ در قدح جرعہ وما ہشیار

فریدالدین شیخ عطار(1146تا1221)

شیخ فرید الدین مشہور بہ عطار صوفی شاعروں میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ وہ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔انھوں نے لمبی عمر پائی۔انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ اہل دل اور مشائخ اور شاعروں پر اثر ڈالا۔ان کی طبیعت نہایت رواں اور ان کی فکر نہایت بلند پرواز تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے،انھوں نے اپنی تمام تصانیف میں صوفیانہ مسائل بیان کیے۔شیخ فریدالدین عطار کی مثنویاں متعدد ہیں۔لیکن ان کی سب سے بڑی یادگار قصائد اور غزلیات کا دیوان ہے۔ جس میں دس ہزار کے قریب شعر ہیں۔ان کتابیں ''منطق الطیر'' اور ''تذکرۃ الاولیاء'' ہیں۔ان کے دیوان میں عارفانہ اشعار ہیں۔عطار نے لوگوں کی مدح سرائی سے اپنا دامن بالکل بچا کے رکھا ہے۔ان کے عارفانہ اشعار کے نمونے یہ ہیں۔

ندار د دردما درماں دریغا — بماندم بے سروسامان دریغا
دریں حیرت فلکہا نیز دیریست — کہ می گرد ند سر گردان دریغا
رہے بس دورمی بینم درین راہ — نہ سر پیدا و نہ پایاں دریغا
چو نہ جاناں بخواہد ماند نہ جان — زجان درد او از جاناں دریغا

اسدی(999تا1072)

اس شاعر کا پورا نام ابونثر علی بن احمد طوسی ہے۔ یہ شاعری اسدی کے نام سے مشہور ہے، پانچویں صدی ہجری کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔شاعر نے فردوسی کے شاہ نامے کو سامنے رکھ کر ایران کی ایک پرانی داستان پر طبع آزمائی کی اور اس میں اپنی شاعرانہ قابلیت کا اظہار کیا۔ یہ نظم بھی شاہنامے کے طرز اور اسی وزن میں لکھی گئی ہے اگر چہ کہ زیبائی سخن پختگئی فکر اور روانی میں کمال فردوسی کا حصہ ہے لیکن بلا شبہ اسدی نے بھی فردوسی کی ماہرانہ پیروی کی ہے۔شاہنامے کا ہیرو رستم ہے اور اسدی نے اپنی داستان کا ہیرو گرشاسب کو بنایا۔اس داستان میں پہلوانوں کے قصے۔راویوں کی داستانیں اور دوسرے حالات وواقعات شاہنامے ہی کی طرح لکھے گئے ہیں۔ اس شعری داستان میں استعارے۔مجاز۔کنایہ اور تشبیہ کی فراوانی ہے۔اس سے کام لیا گیا ہے۔ اس منظوم داستان کے بہترین اور بلند پایہ اشعار وہ ہیں جن میں نصیحتیں کی گئی ہیں۔اس داستان

میں داستان کی دلکشی اور لطافت کے سوا ایک کام کی چیز یہ ملتی ہے۔ کہ اس میں اس عہد کے فارسی کے بہت سے کارآمد الفاظ ملتے ہیں۔ اسدی نے قصیدے بھی لکھے ہیں، اس کے چار مناظرے بھی ہیں ان مناظروں کے نام یہ ہیں۔ مناظرہ آسمان وزمین۔ مناظرہ شب وروز۔ مناظرہ نیزہ وکمان۔ اس کی نصیحت کے دو شعر یہ ہیں۔

پس ازمن چناں کن کہ پیش خدائے بناز وروانم بدیگر سرای
نگر تا گناہد نہ باشد بسی بہ یزدان زر بخت نہ نالد کسی

اسدی نے ۴۶۵ ہجری میں وفات پائی۔

ناصر خسرو (1004 تا 1088)

ناصر خسرو فارسی کا مشہور شاعر ہے۔ اس کا پورا نام حکیم ناصر خسرو بن حارث قبادیانی 394 ہجری میں بلخ کے قریب پیدا ہوا۔ اس نے ہر طرح کے علوم وفضائل اور ایام تاریخ۔ عقائد اور ایران وعرب کی شاعری کا مطالعہ کیا اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کی۔ اس نے سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی کے دربار بھی دیکھے۔ اس کے بعد انھیں سلجوقی دربار میں دبیر کا عہدہ ملا۔ اس نے ہندوستان افغانستان اور ترکستان کے سفر کیے۔ اس کے مذہبی عقائد کی وجہ سے علما اور فقہا نے اس کی حکومت سے شکایت کی۔ چنانچہ اس کو فرار ہو روپوش ہو جانا پڑا، پھر اس نے ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کیں۔ اپنے بعض اشعار میں اس نے اپنی غریب الوطنی اور روپوشی کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔

آزردہ کرد کژوم غربت جگر مرا گوئی زبوں نیافت زگیتی مگر مرا
درحال خویشتن چو ہمی ژرف بہ نگرم صفرا ہمی بر آید زاندہ بہ سر مرا

اس کی ایک کتاب ''زادالمسافرین'' کے نام سے ہے۔ اس میں عقائد کے بارے میں اس نے فلسفیانہ خیالات پیش کیے ہیں۔ انھیں اپنے عقائد کی وجہ سے لعن طعن کا ہدف بننا پڑا۔ اس کی تصنیفات متعدد ہیں، اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار تھے۔ لیکن اس وقت بارہ ہزار سے زیادہ اشعار نہیں۔ قصیدے میں ناصر خسرو کی استادی مسلم ہے، مثنوی میں بھی انھیں درک اور کمال حاصل ہے۔ ان قصائد میں انھوں نے مادی دنیا کی تحقیق کی ہے، ظاہر سے باطن کی طرف رجوع

کرنے کی دعوت دی ہے۔اس کے اشعار تغزل اور مدح سرائی سے خالی ہیں۔اس کا ایک قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

نکو ہش مکن چرخ نیلو فری را برون کن زسر باد خیرہ سری را

ناصر خسرو ایک صاحب نظر ایماندار شاعر تھا۔روحانی اور اخلاقی امور اس کا مدار فکر تھا۔ اس کے اشعار میں ایک طرح کا ایمان اور معنوی قوت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی فکر رسا ہے۔اس لیے اس کی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے۔جو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

قطران (1009 تا 1072)

قطران سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں تھا۔اس کی پیدائش تبریز میں ہوئی تھی اور یہیں سے اسے شہرت ملی۔ناصر خسرو جیسے شاعر نے قطران کی تعریف کی ہے اور اس کے اشعار کو پسند کیا ہے۔قطران کے بہت سے سلاطین کی مدح بھی کی ہے۔قطران کا شمار فارسی کے درجہ اول کے قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔اس نے زیادہ تر خراسان کے شاعروں کی پیروی کی ہے۔قطران کے قصیدے نہایت متین اور عمدہ ہیں،اس نے صنائع و بدائع سے بھی کام لیا ہے اور منظر نگاری میں بھی اسے کمال حاصل ہے۔جامی جیسے مشہور شاعر نے قطران کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے۔

بود قطران نکتہ دانی سحر ساز قطرہ از کلک او دریائے راز

مسعود سعد سلمان (1046 تا 1121)

مسعود سعد کا شمار غزنوی اور سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔اس کا خاندان ہمدان کا رہنے والا تھا۔لیکن یہ ہندوستان کے مشہور شہر لاہور میں چار سو چار (404) ہجری میں پیدا ہوا۔اس کے اجداد اہل علم و ادب تھے۔چنانچہ وہ فخر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اگر رئیس نہ ام یا عمید زادہ نیم ستودہ نسبت واصلم زدودہ فضلاست

مسعود کے باپ سعد اور اس کے دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے عالموں میں ہوتا ہے۔جب سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے محمود کو ہندوستان کی حکومت عطا کی تو مسعود سعد اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور جب تک کہ خاص لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔پھر انقلاب زمانہ سے وہ دربار سے نکالا گیا اور تین سال تک ایک قلعہ میں اسے قید رکھا گیا۔اس نے اپنی شکستہ

دلی اور پریشانی اور زنداں کی قید کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ وہ بہت اچھا قصیدہ گو شاعر بھی ہے۔ اس کا ایک قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

شگوفہ باطرب آورد شاخ عشرت بار کہ بوی نصرت وفتح آید از نسیم بہار

مسعود کی شاعری میں خراسان کے شاعروں کی بہ نسبت معشوق وشراب اور فطرت کی تعریف کم ملتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اشعار میں پاکیزہ اور شیریں تغزل موجود ہے۔ مثلاً اس کے یہ دو شعر۔

یک شب از تو بہار وقت سحر باد بر باغ کرد راہ گذر
غنچہ گل پیام داد ہمی گفت من آمدن بباغ اندر

مسعود فارسی کے قصیدہ گو شعرا میں صف اول کا شاعر ہے۔ اس نے اپنی دردناک زندگی کی حکایت بھی اپنے اشعار میں سنائی ہے۔ اس کے شعر دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ اکثر اشعار میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس شاعر کے پنجابی کلام کے نمونے بھی دستیاب ہیں اور جمیل جالبی کا خیال ہے کہ اس نے اردو میں بھی بعض اشعار کہے ہوں گے۔

عمر خیام (1048 تا 1131)

شاعر کا پورا نام ابوالفتح عمر بن ابراہیم ہے۔ اس کا شمار ایران کے بہت بڑے شاعروں اور دانشمندوں میں ہوتا ہے۔ وہ سلجوقی دور میں بہ مقام نیشاپور پیدا ہوا۔ اس نے خراسان کے مختلف شہروں طور، بلخ، بخارا، مرو کی سیاحت کی تھی۔ وہ بغداد بھی گیا تھا، ایک روایت کے مطابق اس نے حج بھی کیا تھا۔ اس کا شمار اپنے زمانے کے بڑے علما وفضلا میں کیا جاتا ہے۔ امام غزالی اور خواجہ نظام الملک طوسی سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ ہر جگہ اس کی عزت تھی۔ علم نجوم ہیئت اور حکمت میں اسے بڑی مہارت تھی۔

لیکن عمر خیام کی شہرت کی بنیاد اس کی رباعیاں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ علم حساب۔ نجوم۔ طب اور حکمت کے مسائل کی تحقیق سے تھک جاتا تھا تو بوجھ کو ہلکا کرنے کے کیے وہ شعر گوئی کا سہارا لیتا تھا۔ لیکن اس نے شاعری میں بھی بلند افکار کو نہایت سادہ اور شیریں زبان میں ادا کیا ہے۔ اس کی اکثر رباعیاں عبارت کے لحاظ سے مختصر ہیں۔ لیکن مطالب ومعانی کا سمندر ہیں۔ وہ

بیکراں اور بلندترین فضاؤں میں اڑتا ہے، عقل خرد کو شعر و تخیل کے پر لگا دیتا ہے۔ خیام کی رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم زبان کے لحاظ سے سادہ لیکن معانی کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ شاعر کا خیال یہ ہے۔ کہ انسان بے خبر اور نادان ہے۔ آفرینش کا راز اسے معلوم نہیں۔ دنیا کے معمے اس کے بس کے باہر ہیں۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں اور انسانی زندگی کی بھول بھلیوں میں مایوس اور دل گرفتہ ہے۔ کیوں بھٹکتا پھرتا ہے۔

دوری کہ درو آمدن ورفتن ما ست　　اورا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزندو می دریں معنی راست　　کیں آمدن از کجا ورفتن بکجاست
زآوردن من بنو دگردون راسود　　وزبرون من جاہ وجلالش نفزود
وزہیچ کسی نیز دو گوشم نہ شنود　　کاوردن وبردن من از بہر چہ بود

شاعر کو غم ہے اور وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ انسانی زندگی کا درخت کیوں سرسبز نہیں ہوتا، خشک ہو کر کیوں پامال ہو جاتا ہے۔ تندرستی بیماری سے۔ جوانی بڑھاپے سے اور زندگی موت سے بدل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آدمی تک آخر کار ایک مشت خاک کے سوا اور کچھ نہیں رہتے۔

پیش ازمن وتو لیل ونہاری بوداست　　گردندہ فلک نیز بکاری بودست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی　　کان مردمک چشم نگاری بودست

ہرسبزہ کہ بر گزار جوئی رستست　　گوئی زلب فرشتہ خوئی رستست
پابر سر سبزہ تا بخواری ننہی　　کان سبزہ زخاک ما ہروئی رستست

شاعر نے زمانے کی گردش کی شکایت کی ہے۔ انسان کی ناکامی اور اس کے غم اور اس کے عمر کی بے مقداری اور ناپائیداری کا ذکر کیا ہے۔ عمر خیام کو آج ساری دنیا شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن وہ فلسفہ میں ابوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم وفن ادب اور تاریخ میں امام فن تھا۔ اس کی بہت ساری تصنیفات ہیں لیکن یہاں صرف اس کی شاعری اور رباعیات کا ذکر آئے گا۔ یہ شاعر ایک معمولی بات کو بھی لیتا ہے اور ایسے دلکش اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب رشک کرنے لگتے ہیں۔ سننے والوں کو محسوس ہوتا ہے کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی۔ بقول شاعر ؎

خوبی ہمیں کرشمہ وناز خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ خوش دلی کی ترغیب بھی دی ہے اور شراب کی تعریف بھی کی ہے۔ توبہ واستغفار کا مضمون بھی اس کی شاعری میں موجود ہے۔ وہ خدا سے کہتا ہے۔ کہ اے خدا! اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہوگی اور اگر گناہ کیا تو کیا اس سے تیرا کچھ نقصان ہوگا؟ اے خدا! مجھ کو چھوڑ دے اور گرفت نہ کر مجھ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے اور جلد چھوڑ دیتا ہے۔

من بندہ عاصیم راضائے تو کجا است تاریک دلم نور صفائی تو کجا است
ما را تو بہشت تو اگر بطاعت بخشی آں بیع بود لطف وعطای تو کجا است

دیکھیے کس شاعرانہ انداز سے شاعر مغفرت چاہتا ہے کہتا ہے کہ اے خدا! اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دے گا تو یہ تو خرید وفروخت ٹھہری۔ جو سوداگروں کا کام ہے۔ نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں سیکڑوں برس دانستہ گناہ کروں گا۔ مجھ کو یہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے یا تیری رحمت۔ یعنی میں دیکھوں گا کہ دونوں میں کون غالب آتا ہے۔

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو صد سالہ ستدم سالہ بناز درنعمت تو
صد سال بہ امتحاں گناہ خواہم کرد تا جرم من است بیش یا رحمت تو

پھر وہ کہتا ہے کہ صحیح ہے کہ بہشت میں جسمانی آرام وعیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملیں گی۔ اگر وہاں بھی یہی سب ہوگا تو اگر ہم نے دنیا ہی میں ان چیزوں کو پیشگی اختیار کر لیا تو کیا برا کیا۔

زاہد گوید بہشت با حور خوش است من می گویم شراب انگور خوش است
ایں نقد بگیر ودست از آں نسیہ بدار آوازہ دہل شنیدن از دور خوش است

خیام کا آدھا کلام شراب کے ذکر وتعریف میں ہے۔ خواجہ حافظ نے انھیں مضامین کو اور زیادہ شوخ کر دیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بے خودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ خواجہ حافظ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔

من بے مے ناب زیستن نتوانم بے ام کشیدہ بار تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید یک جام دیگر بگیر ومن نتوانم

یعنی شاعر کہتا ہے کہ میں بغیر شراب کے زندہ نہیں رہ سکتا اور جام کو اٹھائے بغیر جسم کا بوجھ سنبھال نہیں سکتا اور میں وہ بندہ ہوں کہ ساقی کہتا ہے کہ ایک جام اور ہاتھ میں اٹھالو لیکن اپنی سرمستی کی وجہ سے اٹھا نہیں سکتا۔ پھر شاعر ایک دوسری رباعی میں کہتا ہے۔ کہ شراب کی وہ حالت پسندیدہ ہے کہ انسان مست ہوجائے اور یہ ناپسندیدہ ہے کہ مطلق اثر نہ پڑے، مستی اور ہوشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہے اور میں اسی کا غلام ہوں۔

چوں ہوشیارم طرب زمن پنہا است　　درمست شوم۔ درخردم نقصان است
حالے است میان مستی وہوشیاری　　من بندۂ آں گہ زندکانی آن است

خیام کے یہاں فلسفۂ اخلاق بھی پایا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ اخلاق مختصر ہے۔ لیکن جس قدر ہے اس مختصر سی دنیا کے لیے کافی ہے۔ اس نے غیبت سے اور دوسروں کی دل آزاری سے روکا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

غیبت مکن ودل کساں را مآزار　　درعہدۂ آں جہاں منم بادہ بیار

انوری (1126 تا 1189)

شاعر کا پورا نام اوفدالدین محمد انوری تھا۔ انوری اس کا تخلص ہے۔ انوری کو سب سے زیادہ عروج سلطان سندر کے دور حکومت میں حاصل ہوا۔ سلطان سے تقرب کا سبب اس کا ایک قصیدہ تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

گر دل دوست بجروکاں باشد　　دل دوست خدایگاں باشد

اس میں کوئی شک نہیں کہ انوری ایران کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ انوری سے پہلے بھی شعرا نے قصیدے لکھے تھے لیکن انوری نے اس فن میں کمال حاصل کیا۔ انوری کے زمانے میں آسمان ادب کے ستارے ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ بڑے بڑے شعرا اور نامی گرامی علما اور نثر نویس اس کے ہم عصر تھے۔ شاعری کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا۔ انوری کی شاعری میں فن قصیدہ عبارت وترتیب کے لحاظ سے پختگی اور معانی کی گہرائی کے لحاظ سے اپنے پورے کمال تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے یہاں طرز ادا کی دلکشی ہے، صنائع اور بدائع کا استعمال ایک خاص بانکپن کے ساتھ ہے۔ اس نے قصیدے میں بادشاہ کے جاہ وجلال کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے اور دشمن کو ریشم کے

کیڑے سے جو اپنی نوک زبان سے اپنا کفن بنتا ہے۔ایک قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں ۔

باز ایں چہ جوانی و جمالست جہاں را دیں خال کہ نوگشت زمیں را و زماں را
مقدار شب از روز فزوں بود بدل گشت ناقص ہمہ ایں را شدو کامل ہمہ آں را
ہم جمرہ بر آورد فرد بردہ نفس را ہم فاختہ بگشاد فروبستہ زباں را
در باغ چمن ضامن گل گشت زبلبل آں روز کہ آوازہ فکندند خزاں را

انوری کی غزل کا رنگ بھی خوب ہے۔اس نے بڑی اچھی غزلیں کہی ہیں۔غزل میں اس کا مرتبہ متقدمین شعرا اور اس دور کے بعد آنے والے شعرا سے کم نہیں۔

نظامی (1141 تا 1209)

شاعر کا نام الیاس یوسف تھا۔نظام الدین لقب اور تخلص نظامی تھا۔قم کے رہنے والے تھے۔نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا۔اس کے بھائی قوامی مشہور شاعر تھے۔نظامی کی طبیعت درویشانہ تھی۔لیکن گھر میں شاعری کا چرچہ تھا۔اس لیے درسی علوم سے فارغ ہو کر جب تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا تو حرف موزوں زبان سے نکلنے لگے۔مشق روز بہ روز بڑھتی گئی اور کلام شہرہ دور دور پہنچا۔یہاں تک کہ سلاطین نے ان کی قدر دانی کی اور فرمائش کر کے ان سے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں۔چنانچہ نظامی نے ''مخزن اسرار'' کے نام سے کتاب بہرام شاہ کے نام سے لکھی، صلہ میں اس کو پانچ ہزار اشرفیاں دی گئیں۔نظامی کے زمانے میں سلطان طغرل بن ارسلان فرمارواتھا۔اسی زمانے میں نظامی نے شیریں خسرو کی داستان شعر کی زبان میں مرتب کی۔جسے ''مثنوی شیریں خسرو'' کہتے ہیں۔نظامی نے بادشاہ کے دربار میں شیریں خسرو کا منظوم قصہ سنایا، انعام میں بادشاہ نے ان کو جاگیر عطا کی۔پھر نظامی نے سلطان غیاث الدین کی فرمائش سے ''حق پیکر'' جس میں بہرام بور کا قصہ ہے۔اس کے بعد نظامی نے منظوم کتاب ''سکندر نامہ'' کے نام سے لکھی۔سلاطین وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی ان کے بیٹے سے بیاہ دی اور نظامی کے صاحبزادے ولی عہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کیے گئے۔جب کسی شخص کو کسی بھی فن میں دست گاہ حاصل ہو جاتی ہے اور اسے درجہ کمال حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی اسی طرح سے قدر دانی کی جاتی ہے جس طرح سے کہ قدر دانی نظامی کی باشاہوں کے دربار

میں ہوئی۔اسی لیے فارسی شاعر نے کہا ہے۔

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

نظامی کی متعدد مثنویاں ہیں اور ہر مثنوی کسی فرماں روا کے نام پر ہے۔لیکن انھوں نے کسی کی زیادہ مداحی نہیں کی ہے۔انھوں نے قصیدے لکھے لیکن زیادہ مداحی کے بغیر۔زیادہ تر شعرا جب قصیدے لکھتے ہیں تو مداحی کے انداز میں لکھتے ہیں۔نظامی کی شاعری میں جامعیت ہے۔زور کلام ہے۔ استعارہ اور تشبیہات میں جدت ہے۔خیال انگیزی ہے۔نظامی کی شاعری میں بہت سے دوسرے شعرا سے زیادہ الفاظ کی شان وشوکت ہے اور ترکیبوں کی چستی ہے۔انھوں نے عہد شباب کی حسرت کا تذکرہ ان اشعار میں کیا ہے۔

چو باد خزانی در افتد بہ باغ　　زمانہ دہد جائے بلبل بہ زاغ
بود برگ ریزان چو شاخ بلند　　دل باغباں زاں شود درد مند
بنال اے کہن بلبل سا نخورد　　کہ خسارۂ سرخ کل گشت زرد
دو تاشد سہی سر و آراستہ　　کد یورشد از باغ برخاستہ

جمال الدین اصفہانی (1279 تا 1326)

جمال الدین اصفہانی نظامی اور خاقانی کا ہم عصر یعنی چھٹی صدی ہجری کا شاعر ہے، اس نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ وہیں بسر کیا۔اس کے بعد اس نے آذربائجان اور گنجا کا بھی سفر کیا۔ جمال الدین کا شمار مشہور قصیدہ گو اور غزل سرا شاعروں میں ہوتا ہے۔اس نے اپنے زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔اس کا کلام رواں ہے اور تعقید اور تکلف سے پاک ہے۔اس کے پر اثر قصیدے وہ ہیں جو دنیا کی ناپائداری اور لوگوں کی بے وفائی پر لکھے گئے ہیں۔ جمال الدین کی شاعری میں حکیم سنائی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔دیکھیے سنائی کا شعر ہے۔

ای خداوندان مال الاعتبار الاعتبار　　ای خداخوانان قال الاعتذار الاعتذار

اور اب جمال الدین کا شعر دیکھیے۔

الحذار ای غافلاں زیں وحشت آباد الحذار　　الفرار ای عاقلاں زیں دیو مردم الفرار

جمال الدین کے پاس مبالغہ آمیز مضامین کی کمی نہیں ہے۔ان میں طاقت بھی ہے اور

ادبی دلکشی بھی ہے۔ اس نے بڑے دلچسپ نکتے بھی پیش کیے ہیں۔ مثلاً اس عہد کی ایک بڑی شخصیت خواجہ رکن الدین رحمۃ اللہ کے بارے میں جو شعر کہے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے:

''تیرے قلم کی گردشیں شریعت کے چہرے کے خال ہیں۔ تیرے اخلاق کی بو کو عقل سمجھتی ہے۔ تیری بلند پایہ ہستی کے آگے آسمان پست ہے۔ تیری انگشت مانی میں علم کا لوہا موم ہے۔ تیرے مرتبے کے آگے آسمان کے نو دائرے بھی ایک نقطۂ موہوم سے بڑھ کر نہیں''۔

شاعر نے خواجہ قوام الدین کی مدح میں مضمون اس طرح باندھا ہے:

''وہ بحر علوم۔ کوہ وقار۔ سپہر مجد۔ کان سخا۔ گنج کرم اور معدن حیاء ہے۔ اس کا لطف و کرم نسیم سحر۔ اس کا خلق۔ پھولوں پر چلنے والی ہوا۔ اس کا فرمان پہلوئے قدر اور اس کا حکم زانوئے قضا ہے۔ اس کا غصہ انسان کو دام جہل سے اسی کی دُر بار ہتھیلی فقر سے نجات دلاتی ہے۔ وہ آسمان کا ہم عناں ہے۔ قسمت کا ہم رکاب ہے اور عقل اس کی ہم نشین''۔

اس شاعر کے سب سے زیادہ پر اثر اور دل سے نکلے ہوئے اشعار وہ ہیں جو زمانے کی گردش اور لوگوں کی بے رخی۔ دوستوں کے تغافل اور اپنی سوختہ سامانی اور دل توڑنے والے صدموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بازم ز دور چرخ جگرخوں ہمیں شود　　کارم ز روزگار دگرگوں ہمی شود

شاعر کے بعض قصیدوں سے اس کی طبیعت کے استغنا اور بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو سونے اور چاندی پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ عزت نفس اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسے اپنا ایمان اور اپنا ضمیر کسی قیمت پر بیچنا نہیں چاہیے۔

ایں ہمہ لاف مزن گرچہ ترا سیم وزر است　　کہ زر وسیم بر اہل خرد مختصر است

دل میندار خردی برسیم وزرت　　کہ زور سیم جہاں ہیچوں جہاں درگزر است

شاعر کے دیوان میں پند آمیز اشعار بھی موجود ہیں۔ ان میں ایک وہ نصیحت بھی ہے جو اس نے ماں باپ کی عزت اور ان احترام کے موضوع نظم کی ہے۔

بشنواز من نصیحتی کہ ترا کاہر دو جہاں شود بنظام
بدنخواہی کہ باشد ت ہر گز بد مکن خاصہ با اولی الارحام
حق مادر نگاہد ارو بترس زایزد ذو الجلال والاکرام
کانکہ بابادر وپدر بد کرد بنود سبز تایشہ دشمن کان

خاقانی شیروانی (1120 تا 1190)

افضل الدین بدیل بن علی خاقانی کا شمار ایران کے مشہور ترین اور صف اول کے قصیدہ گوشعرا میں ہوتا ہے۔ وہ عباسی خلیفہ مکتفی باللہ (530 تا 555ھ) کا ہم عصر تھا۔ شاعر کی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر ہوئی تھی۔ پہلے تو اس کی زندگی باپ کی کمائی پر بسر ہوئی، باپ کے انتقال کے بعد ماں نے محنت مزدور کر کے اس کی پرورش کی۔ شاعر کو فراغت حاصل نہ تھی اور اس کا دل شاد نہ تھا۔ وہ مونس اور ہمدم دوستوں سے بھی محروم تھا۔ وہ مفلسی اور تنگ دستی کی مصیبتیں سہتا رہا۔ وہ دوستوں کی آرزو میں ماتم گسار رہا۔ جب اس کی عمر کا آفتاب ڈھلنے کو آیا۔ تو اس کا جواں سال بیٹا رشید الدین بیس سال کی عمر میں مر گیا اور باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ اس نے اپنی آزاد منشی کی بدولت خدمت سلطانی اور مدح سلطانی سے بھی گریز کیا۔ اس کے بارے میں اس کی غزلوں میں اشارے ملتے ہیں۔

گفتی نہ کنی خدمت سلطاں نکنم نی یک لحظہ فراغت بدو عالم نفروشم

یعنی شاعر کہتا ہے کہ تو مجھ سے کہتے ہو کہ تم نے سلطان کی حاشیہ نشینی اور خدمت نہیں اختیار کی۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ میں دو عالم کی دولت کے بدلے ایک لحظہ کی فراغت کو فروخت کرنا نہیں چاہتا۔

خاقانی کا شمار ایران کے درجہ اول کے قصیدہ گوشعرا میں ہوتا ہے۔ خاقانی خیام نظامی اور ایسے دوسرے شعرا یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایران کے ہر حصے میں خواہ وہ خراسان ہو کہ آزر بائجان ادب کے پھول کھل سکتے ہیں۔ پھل پھول سکتے ہیں اور نئے شگوفے پیدا کر سکتے ہیں۔ خاقانی کی شاعری نہایت محکم اور استوار ہے اور الفاظ و معنی کے لحاظ سے غیر معمولی اور نہایت بلند و لطیف ہے۔ اس کی شاعری کی بہت سی بنیادی خوبیوں میں ایک ادبی خوبی یہ ہے کہ وہ عام سطح سے

بلند اور عام ڈگر سے الگ ہے۔ یعنی ایسے دقیق اور گہرے معانی کو جو ہر شخص کے خیال میں نہیں آ سکتے۔ نہایت جامع اور فصیح الفاظ کے قالب میں ادا کرتا ہے۔ خاقانی کی شاعری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان کی طرح عربی زبان پر بھی کامل عبور رکھتا ہے۔ ان دونوں زبانوں کے الفاظ اور ترکیبیں اسے متحضر ہیں۔

شاعر کے کلام میں منظر نگاری اور جلوۂ فطرت کی عکاسی بھی بہت ہے۔ وہ جلوۂ صبح اور طلوع آفتاب کی عکاسی اپنے اشعار میں بار بار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا شعر ہے ؎

دست صبا بر فروخت مشعلۂ نوبہار　　مشعلہ داری گرفت کو کبۂ شاخسار
زآتش خورشید شد نافہ شب نیم سوخت　　قوت ازاں یافت روز خوشدم ازاں شد بہار
خامہ ما نیست طبع چہرہ کشائے جہاں　　نایب عیسی است ماہ رنگزر اخسار

خاقانی کی شعری خصوصیات اور اس کے اخلاق کے ذکر میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے وطن ایران میں جو واقعات پیش آ رہے تھے۔ ان کی عکاسی بڑے مہارانہ انداز میں کرتا ہے۔ ان واقعات میں ترکوں کے ہجوم کرنے کا خونی حادثہ بھی ہے۔ جو پانچ سو انچاس 549 ھجری ولایت خراسان میں پیش آیا تھا۔ اس حادثے نے ملک کو ویران کر دیا اور بے شمار جانیں اس میں ضائع ہوئیں۔ امام محمد یحییٰ جیسے بزرگ اس راستے میں شہید ہوئے۔ ان جانگداز مصائب سے شاعر کا دل بہت متأثر ہوا۔ بے اختیار لب پر نالہ آ گیا۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر اس نے قصیدہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد　　واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

شیخ سعدی شیرازی (606 تا 691ھ)

ان کی عمر کی مدت عام تذکروں میں 102 برس کی لکھی ہے، ان کی سوانح لکھنے والوں نے یہ لکھا ہے کہ انھوں نے بغداد میں ابن جوزی سے تعلیم حاصل کی۔ لیکن ابن جوزی کی وفات 597ھ لکھی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تو ابن جوزی سے ان کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ابن جوزی کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں شیخ سعدی کی ولادت 589 ہجری مذکور ہے۔ اس اعتبار سے ابن جوزی کی وفات تک ان کی عمر صرف نو برس کی ہوگی۔

شیخ سعدی کا لقب مصلح الدین اور سعدی تخلص تھا۔ شیخ کے والد نے ان کی تربیت کے لیے ایک عالم دین کو مقرر کیا۔ جنھوں نے ان کو روزہ۔ نماز اور وضو کے آداب وسنن سمجھائے۔ بعد میں انھوں نے مدرسہ نظامیہ بغداد میں تعلیم حاصل کی، تحصیل علم سے فارغ ہوکر بیس برس تک دنیا کے ملکوں کی سیاحت کی۔ ان کی ذہانت اور علمیت اور شعری کمال نے ان کو ایک ممتاز حیثیت دے دی ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ صوفی بھی تھے۔ فقیہ بھی تھے۔ واعظ بھی تھے اور رند شوخ طبع بھی تھے۔ انھوں نے تصوف کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

مرا پیر دانائے فرخ شہاب دو اندر زفرمود بر روئے آب
یکے آں کہ برخویش خود بیں مباش دگر آں کہ بر غیر بد دیں مباش

شیخ کا شمار صوفیائے کبار میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی کوئی سوانح نہیں لکھی لیکن گلستاں اور بوستاں میں انھوں نے مختلف موقعوں پر اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان سے ان کے اخلاق وعادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ان کی تصنیفات متعدد ہیں۔ گلستاں اور بوستاں کے علاوہ مطائبات۔ رباعیات۔ قصائد فارسیہ اور قصائد عربیہ اور ملمعات وغیرہ وغیرہ۔ ان کی مختلف کتابوں کے اور خاص طور پر گلستاں اور بوستاں کے انگریزی، فرانسیسی میں، جرمنی میں، روسی میں اور ترکی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

فارسی کے ایک بڑے شاعر نے اپنے اشعار میں یہ کہا ہے کہ شاعری کی شریعت کے تین پیغمبر ہیں۔ ایک فردوسی اور دوسرے انوری اور تیسرے سعدی ؎

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات وقصیدہ وغزل را فردوسی وانوری وسعدی

امیر خسرو نے بھی شیخ کی غزل گوئی کی بہت تعریف کی ہے۔

شیخ مصلح الدین سعدی نے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ انتہائی دل دوز ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

آسماں راحق بودگر خوں ببارد برزمیں برزوال ملک مستعصم امیر المؤمنیں

اے محمد! گر قیامت سر بروں آری ز خاک سر بروں آرد قیامت درمیان خلق بیں
نازنینان حرم را موج خون بے دریغ زاستاں بگذشت و ما را خون دل از آستیں

گلستاں اور بوستاں میں پند و نصیحت سے بھری ہوئی بے شمار حکایتیں ہیں۔ ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا اور اس کو قید کر دیا۔ اس کے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلاف مصلحت تھی۔ درویش نے جواب دیا۔

رسانیدن امر حق طاعت است زز نداں نہ ترسم کہ یک ساعت است

یعنی سچی بات کا پہنچا دینا عین طاعت و ثواب ہے۔ میں زنداں سے نہیں ڈرتا ہوں کہ اس کی مدت بس ایک ساعت ہے۔

کسی نے بادشاہ کو یہ خبر پہنچائی۔ بادشاہ نے کہا کہ اسے پوری عمر قید خانہ میں رہنا ہوگا۔ درویش نے جواب میں کہا۔

کہ دنیا ہمیں ساعتے بیش نیست غم وخورمی پیش درویش نیست

یعنی دنیا کی زندگی ایک ساعت سے زیادہ نہیں اور جو غموں کو جھیلنے کے لیے تیار نہیں وہ درویش نہیں ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ درویش نے کہا: مجھ کو اس کی بھی پرواہ نہیں۔ مجھ کو جس سے کہنا سننا ہے وہ بولے بغیر میری بات سمجھتا ہے۔

من از بے زبانی ندارم غمے کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

اسی قسم کی بیشمار اور پر اثر اور دل میں اتر جانے والی حکایتیں شیخ سعدی کی کتابوں میں بھری ہوئی ہیں۔ انھوں نے قناعت کی تعلیم دی ہے، بادشاہ کو یہ تعلیم دی ہے کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اس قدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے متمتع ہو۔ اس سے زیادہ کا اس پر کوئی حق نہیں۔ انھوں نے توکل کی بھی تعلیم دی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ کسب اور جدو جہد کو توکل پر ترجیح حاصل ہے۔ شیخ سعدی قدسی پیکر اور سرتا پا تصوف اور زہد شاعر تھے۔ لیکن ان کے یہاں رنگین اور عشقیہ کلام کی بھی کمی نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

زن نوکن اے دوست در ہر بہار کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مجموعی حیثیت سے شیخ سعدی کا کلام فلسفہ اخلاق سے لبریز ہے۔ غیبت، کبر، حسد وغیرہ

خبائث انسانی سے انھوں نے لوگوں کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ وہ معمولی واقعات سے جو دن رات صاحبِ دل لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔ نہایت دقیق نقطے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار نصیحت موعظت کے لیے آج بھی اچھے خانوادوں میں پڑھے اور سنائے جاتے ہیں۔ صحبت کی کیا تاثیر ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ان کے یہ اشعار آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں ؎

گلے خوشبوے در حما م روزے فتاد از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوی دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہما ں خاکم کہ ہستم

یعنی محبوب کے ہاتھ سے ایک دن حمام میں مٹی میرے ہاتھ آئی جو بہت خوشبودار تھی۔ میں نے اس مٹی سے پوچھا کہ وہ مشک ہے یا عنبر کہ تیری دل آویز خوشبو سے میں مست ہو گیا ہوں۔ وہ مٹی بولی میں وہی حقیر اور ناچیز مٹی ہوں لیکن ایک مدت تک پھول کے پاس میرا رہنا ہوا ہے۔ سچ یہ ہے کہ جمال ہم نشیں نے مجھ پر اثر ڈالا ہے۔ ورنہ میری ہستی کیا میں تو وہی مٹی ہوں۔

شیخ سعدی کے کلام میں معرفت اور مشاہدۂ حق کے اشعار ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں سرسبز وشاداب درختوں کے پتے اہل عقل وخرد کے نزدیک معرفت کی تعلیم دیتے ہیں اور بنانے والے اور پیدا کرنے والے کی معرفت کا ایک پورا دفتر ہے۔ جو ہر پتہ میں پوشیدہ ہے ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتر ست معرفت کردگار

ایران کے تمام شاعروں میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کو غزل کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے، غزل وہ صنف سخن ہے جس میں عشق ومحبت کی خوشبو ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر تم سعدی کے مرنے کے ایک ہزار سال کے بعد بھی اس کے قبر کی مٹی کو سونگھو گے۔ تو اس میں تم کو عشق کی خوشبو محسوس ہوگی ؎

زخاک سعدئ شیراز بوئے عشق می آید
ہزار سال پس از مرگ او گرش بوئے

امیر خسرو(1253 تا 1325)

امیر خسرو کے والد کا نام سیف الدین محمود تھا۔ وہ ترکستان کے رہنے والے تھے اور بلخ کے امرا میں سے تھے۔ جب چنگیز خاں کا فتنہ اٹھا تو سیف الدین محمود ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کافروں سے لڑ کر شہید ہوئے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کے بیٹے امیر خسرو کی عمر سات برس کی تھی۔ امیر خسرو نے مکتب میں تعلیم حاصل کی اور خوش نویسی سیکھی۔ ان کو بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ جو کچھ کہتے وصلیوں پر اس کی مشق کیا کرتے۔ جب دہلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن جلوس افروز ہوا تو امیر خسرو کو اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، انھوں نے بادشاہ کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے۔ جب سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا تخت نشیں ہوا تو اس وقت تک امیر خسرو کی شاعری کا چرچہ دور دور تک ہو چکا تھا۔ ایک جنگ میں امیر خسرو تاتاریوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ دو برس کے بعد ان کو رہائی ملی، پھر امیر خسرو کی زندگی میں جلال الدین خلجی تخت پر بیٹھا۔ وہ بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اسی کے ساتھ صاحب مذاق بھی تھا اور رنگین طبع بھی تھا، شعر بھی کہتا تھا۔ اسی کے زمانے میں امیر خسرو کو دربار میں ندیم کی حیثیت سے متعین کیا گیا۔ کیونکہ امیر خسرو عالم و فاضل بھی تھے۔ مغنی اور مطرب بھی تھے اور شاعر بھی تھے۔

امیر خسرو نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات کا منظوم تذکرہ لکھا ہے، کتاب کا نام ''تاج الفتوح'' رکھا ہے، پھر اسی زمانے میں امیر خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے انتقال کے بعد جب خود ان کا انتقال ہوا تو ان کے قبر کو حضرت نظام الدین اولیاء کے قدموں کے نزدیک جگہ ملی ان کو حضرت نظام الدین اولیاء سے بے پناہ محبت تھی۔ ایک بار حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ امیر خسرو بھی حاضر تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا۔

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

اس وقت خواجہ نظام الدین اولیاء کے سر پر ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ امیر خسرو نے برجستہ دوسرا مصرع کہا۔

ما قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

دونوں مصرعے کا مطلب یہ ہوا کہ خواجہ صاحب نے فرمایا ہر قوم کے لیے ایک طریقہ عبادت۔ایک دین اور ایک قبلہ گاہ ہے۔جواب میں امیر خسرو نے دوسرا مصرع کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کج کلاہ کی جانب رخ کر کے ہم نے اپنا قبلہ درست کر لیا ہے۔

امیر خسرو موسیقی کے بھی بہت ماہر تھے اور ان کی تصانیف کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ان کی کتابوں میں ایک ''قران السعدین'' ہے۔یہ مثنوی ہے جو انھوں نے چھتیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔پھر ان کی کتاب ''مطلع الانوار'' ہے۔جس میں 3310 شعر ہیں اور اس میں تصوف کے مضامین ہیں۔ان کی کتاب ''شیریں خسرو'' اور ''لیلیٰ مجنون'' ہے اور ''اعجاز خسروی'' ہے۔اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد کتابیں ہیں۔وہ ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ان کے یہاں وصف نگاری بھی ہے اور غیر معمولی تشبیہات بھی ہیں۔

حافظ شیرازی (727ھ تا 793ھ)

خواجہ حافظ شیرازی کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے، بعد میں شیراز آ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔خواجہ حافظ شیرازی کے والد کا نام بہاء الدین تھا۔انھوں نے شیراز میں تجارت شروع کی اور ان کی تجارت کو خوب فروغ ہوا۔خواجہ صاحب کا داخلہ مکتب میں ہوا۔وہاں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔اس زمانے میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچہ تھا۔محلّہ میں ایک تاجر رہتا تھا۔وہ سخن سنج اور موزوں طبع تھا۔اس لیے اہل ذوق اس کی دکان پر آتے اور شعر و سخن کے چرچے ہوتے۔خواجہ صاحب نے بھی شاعری شروع کی۔شروع میں طبیعت موزوں نہ تھی اس لیے بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا۔خواجہ حافظ اس سے غمگین ہوئے، ایک بزرگ کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو ایک لقمہ کھلا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جاؤ تم پر تمام علوم کے دروازے کھل جائیں گے۔انھوں نے کسی سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت علیؓ ہیں۔صبح اٹھے تو یہ غزل لکھی جس کا مطلع ہے۔

دوش وقتے سحر از غصہ نجاتم دادند دندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

یعنی کل وقت سحر انھوں نے مجھے کرب اور تکلیف سے نجات دلائی اور رات کی تاریکی میں انھوں نے ہمارے منہ میں آب حیات ٹپکایا۔

حافظ جب لوگوں سے ملے تو لوگوں نے ان سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے وہی تازہ غزل سنائی۔ لوگوں کو یقین نہیں آیا اور سمجھے کہ کسی سے یہ لکھوائی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے ان کا امتحان لیا اور غزل کہنے کے لیے طرح دی۔ انھوں نے طرح میں عمدہ غزل لکھی۔ چنانچہ اس خواب کی بدولت ان کو کمال حاصل ہوا، اس غزل کے چرچے دور دور پھیلنے لگے۔ سلاطین اور امرا نے ان کو بلانے کے لیے خطوط بھیجے۔ شیراز میں جو فرمارواں تھا وہ علم وفن کا قدرداں تھا۔ چنگیز خاں کے پوتے کے زمانے میں غازان خاں کی طرف سے محمد شاہ فارس اور شیراز کا حکمراں مقرر ہو کر آیا تھا، اس کے خاندان میں سے ایک فرد شاہ ابو اسحاق بہت قابل و فاضل لیکن لہو ولعب کا دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں شیراز باغ ارم بن گیا، خواجہ حافظ کی مستانہ غزلیں اس فضا میں گونجنے لگیں۔ اس کے بعد شاہ ابو اسحاق قتل کر دیا گیا اور مظفر نے شیراز کو فتح کر لیا۔ حافظ شیرازی کو اس کا غم ہوا اور انھوں نے ابو اسحاق کے لیے پورا قطعہ کہا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

یعنی ابو اسحاق کی انگوٹھی کا نگیں راستی ہے۔ لیکن یہ ابو اسحاق روشن تو خوب ہوا۔ لیکن اس کی چمک اور ضیا بخشی کا زمانہ بہت مختصر رہا۔

محمد بن مظفر شیراز کا حاکم تھا تو وہ نہایت متقشف تھا۔ تخت نشین ہونے کے ساتھ ہر جگہ واعظ اور محتسب مقرر کیے اور تمام میخانے بند کرا دیے خواجہ حافظ نے اسی واقعہ پر ایک غزل کہی جس کے تین شعر یہ ہیں ؎

اگر چہ بادہ فرح بخش و باد گلر یز است بہ بانگ چنگ مخورے کہ محتسب تیز است
در آستیں مرقع پیالہ پنہا ں کن کہ ہم چوں چشم صراحی زمانہ خوں ریز است
زرنگ بادہ بشوئید خرقہا از اشک کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

اگر چہ شراب فرحت بخش اور ہوا پھول لٹا رہی ہے۔ لیکن ساز کی آواز پر تم شراب نہ پیو کہ محتسب کی نگاہ بہت تیز ہے۔ اپنے آستین میں شراب کا پیالہ چھپا لو۔ کہ چشم صراحی کی طرح سے زمانہ خوں ریز ہے۔ شراب کی طرح اپنے خرقے کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دو۔ کہ یہ تقویٰ کا موسم ہے اور پرہیز گاری کا زمانہ ہے۔

خواجہ حافظ کے دیوان اوران کے اصناف کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی دانی کے ساتھ ان کو عربی زبان وادب پر بھی کمال حاصل تھا، انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل بڑی جدوجہد کے ساتھ کی تھی، فارسی تو ان کی مادری زبان تھی لیکن عربی پر بھی ماہرانہ اور عالمانہ قدرت تھی۔ ذیل کے اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

الا اے ساربان محمل دوست — **الی رکبانکم طال اشتیاقی**
درد نم خوں شد از نادیدن بار — **الا نفیاً لا یام الفراق**
بیا ساقی بدہ رطل گرانم — **سقاک اللہ من کاس رھاق**
نھانی الشیب من وصل العذاری — **سوی تقبیل خدوا عتناق**
سلام اللہ من کر اللیال — **علی ملک المکارم و المعال**
فحبک راحتی فی کل حین — **وذکرک مونسی فی کل حال**
سبت سلمی بصدغیھا فوادی — **وروحی کل یوم لی تنادی**
گر تیغ بارد در کوے آں ماہ — گردن نھادیم **والحکم للہ**
الصبر مروالعمر فان — **یالیت شعری حتام القاہ**

حافظ شیرازی کے اشعار سے اور ان کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اور سادگی اور آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے۔ لیکن اظہار تقدس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت صاف دل اور بے تکلف تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ کوئی برائی کرتے تو ریاکاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے۔ رکن آباد ایک چشمہ اور شیراز کی ایک سیرگاہ ہے بیٹھ اس کے کنارے بیٹھ کر ساحل کا لطف اٹھاتے۔ انھوں نے اس ساحل کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔ ایک شعر یہ ہے ؎

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت — کنار آب رکن آباد وگل گشت مصلا را

یعنی ساقی جو باقی شراب ہے وہ مجھے دے کہ جنت میں بھی تم نہ پاؤ گے رکن آباد کا یہ حسین کنارہ اور ''مصلا'' کا گل گشت چمن۔

خواجہ حافظ شیرازی کی زیادہ شہرت ان کی غزلوں کی وجہ سے ہے۔ لیکن انھوں نے

قصائد بھی کہے ہیں اور مثنویاں بھی کہی ہیں۔ ان کو شاعری کے تمام اصناف پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خصوصیت جوش وخروش ہے۔ ایسا جوش وخروش کہیں اور غزل کی شاعری میں نظر نہیں آتا ہے۔ چنانچہ ان کے دو شعر دیکھیے ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم فلک را سقف بہ شگافیم وطرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیز د کہ خون عاشقاں ریزد من و ساقی بہم سازیم و بنیادش بر اندازیم

یعنی آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالے میں ڈالیں۔ آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بناڈالیں۔ اگر غم عاشقوں کے مقابلے کے لیے فوج تیار کرے تو ہم اور ساقی دونوں متحد ہو کر اس کی جڑ اکھاڑ پھینکیں۔

غزل کے دو شعر اور دیکھیے کیسی مستی اور کیسا جوش ہے ؎

ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
مادر پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم اے بے خبر زلذت شرب مدام ما

یعنی اے ساقی شراب کے نور سے میرے جام کو فروزاں کر دے اور اے مطرب و مغنی غزل گاؤ کہ میری تسکین سے دنیا کا کام اور کاروبار پورا ہوتا ہے۔ میں پیالہ شراب کے اندر رخ یار کا عکس دیکھتا ہوں۔ میری مسلسل شراب نوشی کی لذت سے تجھے کیا خبر۔

جامی (1414 تا 1492)

شاعر کا پورا نام نورالدین عبدالرحمٰن جامی ہے۔ جامی اس لیے کہتے ہیں کہ صوبہ خراسان کی ولایت جام کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا نام نظام الدین دشتی تھا، دادا کا نام شمس الدین دشتی تھا۔ آپ اپنے والد کے ساتھ ہرات اور پھر سمرقند گئے۔ اس زمانے میں یہ مقامات اسلامی علوم اور ایرانی ادب کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ آپ نے یہاں علم وادب کی تحصیل کی اور سلسلہ نقش بندیہ میں خلیفہ سعدالدین کاشغری سے آپ کو خلافت ملی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامی نویں صدی ہجری کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر ہیں، اتنے بڑے صوفی شاعر ہیں کہ ان کا نام انوری۔ سعدی۔ مولانا روم۔ حافظ۔ خیام اور فردوسی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کی طرح جامی بھی کثیر التصنیفات شاعر ہیں۔ نظم ونثر سے متعلق ان

کے دواوین اور کتابوں کی تعداد 54 ہے۔ اس کی غزلیں بہت مغز اور بامعنی ہوتی ہیں۔ وہ ایک حساس اور پرسوز قلب آتشیں کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ریزم زمژہ کوکب بی ماہ رخت شبہا　　تاریک شمی دارم بایں ہمہ کو کبہا
چوں از دل گرم من بگذشت خدنگ تو　　از بوسہ پیکانش شد آبلہ ام لبہا
از بسکہ گرفتاراں مردند بکوے تو　　بادش ہمہ جاں باشد خاکش ہمہ قالبہا
از تاب وتب ہجراں گفتم سخن وصلت　　بود ایں ہذیاں آری خاصیت آں تبہا

عرفی شیرازی (1555 تا 1591)

شاعر کا پورا نام محمد جمال الدین اور عرفی تخلص تھا۔ والد کا نام زین الدین تھا۔ عرفی کے والد شیراز کے دارالحکومت میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ عرفی کی تعلیم وتربیت شراز میں ہوئی۔ اس نے مصوری اور نقاشی بھی سیکھی۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو پورا ایران علم وہنر کی نمائش گاہ بنا ہوا تھا۔ شعروشاعری زوروں پر تھی۔ عرفی نے وہاں کے شعرا کی نقل میں غزلیں لکھی اور جب مشاعروں میں ان کو پڑھا تو لوگوں نے غزلوں کی تعریف کی۔ عرفی کی قدردانی ایران میں ضرور ہوئی۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جس میں ایران سے بھی زیادہ ہندوستان میں اہل کمال کی قدردانی ہورہی تھی اور ایران سے اہل فن ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ عرفی بھی ہندوستان آیا۔ وہ شہزادہ سلیم پر فریفتہ تھا۔ تعلقات اور دوستی کے لیے اس نے فیضی کا انتخاب کیا، اکبر کے دربار کے نورتن سب کے سب موجود تھے۔ عرفی کو حکیم ابوالفتح کی صحبت حاصل ہوئی، اس نے اس فیض صحبت سے بہت ترقی کی اور پھر اسے خانخاناں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور خانخاناں کی تعریف میں اس نے اشعار کہے جس میں ایک شعر یہ ہے ؎

یک منعم ویک نعمت ویک منت ویک شکر　　صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

خانخاناں نے بھی عرفی کے ساتھ بے حد فیاضیاں کیں، اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدے پر ستر ہزار روپے دلوائے۔ اس نے بادشاہ اکبر کی مدح میں بھی متعدد قصائد لکھے۔ لیکن اکبر کے دربار میں ابوالفضل اور فیضی کے آگے کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔ عرفی کا انتقال صرف 36 سال کی عمر میں ہوا۔ لیکن اس عمر میں بھی اس نے اپنے اعجاز سخن۔ حسن بیان اور

ماہرانہ غزل گوئی کا سکہ بٹھا دیا۔ اس کی کلیات اور غزلیات سے ایک دیوان مرتب ہو گیا ہے۔ جس میں چھبیس قصیدے، 270 غزلیں 700 شعر کے قطعات اور رباعیات ہیں۔ یہ سارا کلام دور اخیر کا کلام ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے۔ چھے ہزار شعر کہے تھے۔ جو بدقسمتی سے ضائع ہو گئے۔ چنانچہ اس کے ماتم میں اس نے ایک پر درد غزل کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام　　عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
ساقی مصطبہ لطفم و می ریختہ ام　　طائر باغچۂ قدسم و پر باختہ ام
العطش می زند از تشنہ لبی ہر مویم　　کہ قدح ہائے پر از خوں جگر باختہ ام

اس کے کلام میں زور سخن ہے۔ جو وجدان کی شدت سے وجود میں آتا ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت بندش کی چستی۔ فقروں کا در و بست۔ مضامین کا زور یہ سب زور بیان کے عناصر ہیں اور یہ سارے عناصر عرفی کے کلام میں موجود ہیں۔ جیسے اس کے یہ شعر ؎

چمن آید بہ چمن بہر تماشاے جمال　　بلبل آید بر بلبل بہ تمناے غزل
بر سر مویش اگر باز شگافی بخرد　　سو مناتے ست کہ چیدست در ولات و ہبل

وہ اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے کہ حکم کا سوار میدان میں آ گیا اور بولا کہ آفتاب یہ گیند ہے جس سے میں کھیل رہا ہوں ؎

فارس حکمش بہ جولاں رفت و گفت　　آفتابم گوست۔ چوگاں می زنم

پھر ممدوح کے دبدبے نے کہا کہ زمانے میں اب میں سما نہیں سکتا اس لیے اخلاق اور عناصر کو چاک کیے دیتا ہوں ؎

گفت جاہش دہر بر من تنگ شد　　چاک در افلاک وارکاں می زنم

عشقیہ شاعری بھی عرفی کے کلام کی خصوصیت ہے۔ وہ عشق و محبت کی ایک ایک ادا سے واقف ہے۔ اس نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کے اسرار اور واردات بیان کیے ہیں، یہ اسرار و معاملات بہت دقیق ہیں۔ شوق دیدار میں عاشق ہمہ تن نظارہ بن جاتا ہے۔ اس حالت کو یوں بیان کرتا ہے ؎

چگونہ مانع نظارہ ام شوی کہ مرا　　ز شوق روے تو سر تا قدم نگہ خیز ست

عشق کی حالت میں اگر کوئی دنیوی صدمہ بھی پیش آتا ہے۔ تو وہ بھی غم کے مزے میں

اضافے کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود　　بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

پھر وہ کہتا ہے۔ معشوق جس حد تک پسند کرے اسی حد تک نظارہ کرنا چاہیے۔ اپنے شوق کے موافق نظارہ بازی بے ادبی میں داخل ہے ؎

قبول خاطر معشوق شرط دیدارست　　بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی ست

شاعر کے یہاں مذہبی وسیع المشربی بھی ہے۔ وہ عرفان کو اسلام یا کفر میں محدود نہیں سمجھتا ؎

عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر　　پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

پھر وہ ایک جگہ نصیحت کرتا ہے کہ اپنے کو بہت قیمتی اور عزیز الوجود نہ سمجھو دنیا کا کارخانہ تم پر بند نہیں ہے ؎

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت　　ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

نظیری نیشاپوری (1021ھ/1612ء)

شاعر کا نام محمد یٰسن نظیری تخلص اور نیشاپور وطن تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں عبد الرحیم خانخاناں کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ چنانچہ دوسرے شعرا کی طرح نظیری نے بھی ہندوستان کا قصد کیا اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا۔ نظیری نے خانخاناں کے ذریعہ اکبر کے دربار تک بھی رسائی حاصل کی۔ جب وہ دربار میں پہنچا تو جہانگیر کے بیٹا پیدا ہونے کا جشن تھا۔ اس نے وہاں قصیدہ پیش کیا۔ جس میں اس نے یہ بھی بتایا کہ شہر میں اس کے بہت سے حاسد بھی پیدا ہو گئے ہیں اور اس کے شعری کمال پر نقد کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے ؎

جماعتے زسفیہان تیرہ طبع دنی　　مدام در پیش افتادہ اند ہمچو وبال

زبے تمیزئ ایں ناقدان کم مایہ　　گہر بقدر خزف گشتہ زر سر سفال

نظیری نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے قائم رکھا اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی۔ چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا اور ایک قصیدہ لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کیا، اس میں شاعرانہ طریقہ سے مصارف سفر کی درخواست کی۔ خانخاناں نے سفر کا سامان کر دیا۔ چنانچہ جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظّمہ کو روانہ ہوا اور حج و زیارت سے بہرہ ور ہوا۔

نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستاں بوسی کی لیکن اس کا اصلی تعلق خانخاناں

کے دربار سے تھا۔ اس زمانے میں شہزادہ مراد سے بھی اس کو دلی محبت تھی اور اس نے شہزادہ مراد کی موت پر دلدوز مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں ؎

اے بزم تیرہ، رخ چون ارغوان کجاست — وے رزم! درہمی شہہ گیتی ستاں کجاست
شوق سجود وحرمت تعظیم کمتر ست — آن ناز صدر وسرکشی آستاں کجاست
برگ وشگوفہ ریخت ثمراز کجا خورم — بشکست شاخ برگ مرا آشیاں کجاست
کس را سرود درخور ایں تعزیت نبود — پیدا کنید کاول این داستاں کجاست
خلقے بہ شیون اند۔ وگویند حال چیست — صبر سخن شنیدن وتاب بیاں کجاست

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعث الم مردوزن شدہ

طالب آملی (996 تا 1034ھ)

طالب آملی آمل کا رہنے والا تھا۔ جو ایران کا ایک شہر ہے۔ بچپن میں درسی علوم وفنون کی تعلیم پائی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اس نے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کر لی۔ اس نے ایران کے ایک وزیر میر ابوقاسم کی مدح میں متعدد قصائد لکھے۔ ایک قصیدے کا یہ مطلع ہے ؎

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ زپیشانی — زند دم از دم عیسی نسیم بستانی
سحر کہ طرۂ پیچان مشک سائی نسیم — برطرف عارض گلبن کند پریشانی

طالب آملی پہلے مرو آیا اس کے بعد اس نے قندھار کا سفر کیا۔ اس نے دلی۔ لاہور۔ ملتان۔ سرہند کے مقامات کی بھی سیر کی۔ ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمن حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا۔ خوش قسمتی سے حسینوں نے بھی اپنے پہلو میں اس کو جگہ دی۔ چنانچہ جب ہندوستان چھوڑ کر قندھار جانے لگا ہے تو جس گرم جوشی سے ان فتنہ گروں نے اس کو روکا ہے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے ؎

نگاران لاہور و خوبان دہلی — بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم — یکے بوسہ دادے بزلف عنانم
فشاندی یکے در بغل یاسمینم — نہاد یکے در دہاں برگ پانم

غزالان ملتان بہ نیرنگ سازی کہ بند ند از غمزہ دست ودہانم
من از جملہ چون نکہت گل گریزان کہ خود بہ بزم ہمایوں رسانم

طالب آملی کی اعتماد الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ اعتماد الدولہ نے اس پر خاص توجہ کی اور اسی کے وساطت سے جہانگیر کے دربار میں رسائی ہوئی۔ جہانگیر کے سامنے اس نے طالب کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا۔ لیکن طالب نے اپنی حماقت سے چلتے وقت ایسی دوا کا استعمال کیا جس سے اس کے حواس جاتے رہے۔ جہانگیر نے مہربانی سے باتیں کرنی چاہیں لیکن طالب آملی پتھر کی تصویر تھا۔ طالب جب گھر واپس آیا تو معذرت میں اس نے فی البدیہہ ستاون شعروں کا ایک قطعہ لکھا۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

چہ لطفہا کہ نمودی دمی نمائی نیز بہر غریب ومسافر علی الخصوص بمن
نخست آن کہ چودر غربتم نظر کردی بہ مہر بردی از خاطرم ہوائے وطن
چہارم آن کہ بہ بزم شہنشہم بروی چو دل بہ پہلوی خود ساختی مرا مسکن

جہانگیر کے دربار میں اس نے اخیر زندگی تک نہایت عزت واحترام سے بسر کی صرف ایک موقع ایسا پیش آیا کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہوگیا اور طالب چند روز تک شرف حضور سے محروم رہا۔ ایک قصیدے میں اس وقعہ کو نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس کے شروع کے تین شعر یہ ہیں ؎

بہ نسبت گہرم دادہ بودی از کف خویش ترا وجود زیانے چنیں ہزار افتاد
چو روشدم زکفت چرخم از ہوا بر بود بہ گرمی کہ زمانم بزینہار افتاد
یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام بد ید کز عرقش موج بر عذار افتاد

مجھ کو موتی سمجھ کر تو نے پھینک دیا تھا۔ سخاوت کی وجہ سے تو نے ایسے نقصان بہت اٹھائے ہیں۔ جب تو نے مجھ کو پھینک دیا تو آسمان نے اٹھالیا۔ اس گرم جوشی کے ساتھ جب خود میں پناہ مانگنے لگا۔ تھوڑی دیر تک آسمان نے میرے آئینہ کو آفتاب کے سامنے رکھا اور دیکھا کہ آفتاب کے چہرے پر پسینہ آ گیا۔

طالب آملی نے 1036 ہجری میں یعنی جہانگیر کے مرنے کے ایک سال پہلے عین

شباب میں وفات پائی۔ وہ نہایت زود نویس شاعر تھا۔ دو تین گھنٹے میں پچاس ساٹھ شعروں کا قصیدہ تیار کر لیتا تھا اس کی شاعری میں ندرت تشبیہ اور لطیف استعارہ بہت ہے اور یہ استعارے بہت لطیف نازک ہیں۔

ابو طالب کلیم (990 تا 1061ھ)

یہ شاعر ہمدان میں پیدا ہوا لیکن کاشان میں زیادہ قیام رہا۔ آغاز جوانی میں شیراز جا کر علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا۔ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جا بہ جا خاک چھانی۔ وہ دکن بھی آیا اور بیجاپور گیا۔ رفتہ رفتہ شاہ جہاں کے دربار میں رسائی ہوئی اور ملک الشعرا کا خطاب اس کو ملا۔ 1044 ہجری میں جب شاہ جہاں نے کروڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا اور آگرے میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی۔ تو کلیم نے قصیدہ لکھا۔

خجستہ مقدم نو روز وغرۂ شوال فشاندہ اند چہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہ جہاں نے اس کے صلہ میں اسے روپے کے برابر تلوایا۔ چنانچہ پانچ ہزار پانچ سو روپے وزن میں آئے اور اس کو عطا کیے۔ کلیم نے شاعری کی تمام صنفوں کو لیا ہے۔ قصائد کثرت سے ہیں۔ کئی مثنویاں ہیں۔ غزلوں کا دیوان الگ ہے۔ جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں کلیم کے یہاں اس کی اس قدر بہتات ہے کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے۔ وہ خیالی مضمون آرائی کر کے۔ ایک طلسم باندھ دیتا ہے۔ اس کے یہاں خوبصورت ترکیبیں۔ روزمرہ کی صفائی۔ محاورات کی برجستگی۔ شستگی اور روانی بھی بہت ہے۔ اس کے تین شعر دیکھیے ؎

درآستان جلالش عصائے درباں را فلک زسدرۂ رضواں زشاخ طوبی داد
کف سخاش غلط بخش نیست ہمچو سحاب سحاب ہر چہ بدریا فشاند بیجا داد
فراستش بخبر گیری ممالک رفت چو باز گشت خبر ز آشیاں عنقا داد

کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے اور اس کا خاص مضمون خیال بندی اور خیال آفرینی ہے۔ یعنی اس کے کلام میں نیا استعارہ یا نئی تشبیہ ہوتی یا کوئی انوکھا مبالغہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

بس کہ زدیدہ ریختم خو ن دل خراب را گریہ گرفت در حنا پنجہ آفتاب را
می نہم دزیر پائے فکر کرسی از سپر تا بکف می آورم یک معنی بر جستہ را
سپہردوں درفیض آنچناں بست ست درعالم کہ سیلاب بہار ترنم ساز د لب جورا

یعنی میں اس قدر خون آنکھوں سے بہایا کہ میرے آنسوؤں نے آفتاب کے پنجہ میں مہندی لگادی۔فکر کے پاؤں کے نیچے آسمان کی کرسی رکھ لیتا ہوں۔تب ایک برجستہ مضمون ہاتھ میں آتا ہے۔ آسمان نے فیض کا دروازہ اس طرح بند کرلیا ہے کہ بہار کا سیلاب نہر کے لب کو بھی ترنہیں کرسکتا۔

جلال الدین رومی (1207 تا 1273)

محمد نام تھا۔لقب جلال الدین تھا۔شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے۔ آپ کا نسب والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے اور والدہ کی جانب سے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے۔مولانا آبائے کرام بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے۔مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی۔مولانا کے والد کا نام بھی محمد اور لقب بہاءالدین تھا۔حضرت بہاءالدین بہت بڑے عالم تھے۔آپ کے علم وفضل کی کیفیت یہ تھی کہ اقصائے خراسان سے آپ ہی کے پاس آتے تھے۔آپ کی مجلس کا انداز بادشاہوں کا سا تھا۔سلطان العلماء خطاب بھی تھا۔جلال الدین رومی کے اتالیق سید برہان الدین ترمذی تھے۔ جو ان کے والد کے مرید تھے۔مولانا والد ماجد کا اثر جب بہت زیادہ بڑھا اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہوگئی تو بہت سے علمائے ظاہر آپ سے حسد کرنے لگے اور سلطان سے شکایت کی۔ یہ شکایت خوارزم شاہ کے دل میں بیٹھ گئی۔ چنانچہ اسی کی ایما سے انھوں نے رخت سفر باندھا۔بلخ والوں کو جب معلوم ہوا تو شہر میں ایک تہلکہ برپا ہوگیا۔ خوارزم شاہ نے رک جانے کی درخواست کی مگر آپ نے قبول نہ کیا۔پھر خوارزم شاہ نے یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح جائیں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو۔ ورنہ سخت فتنہ برپا ہوجائے گا۔مولانا روم سلطان روم علاءالدین کیقباد کی درخواست پر قونیہ تشریف لے گئے سلطان نے خود استقبال کیا۔آپ نے مدرسہ قونیہ میں قیام فرمایا۔سلطان مع اکثر امرا کے مرید ہوگیا۔اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے زندگی میں انقلاب عظیم برپا کردیا اور یہ واقعہ شمس تبریز سے ملاقات اور ان کی ذات سے شگفتگی اور فنائیت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریز کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقیقت کی نئی دنیا عطا کی۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

شمس تبریزی بما راہ حقیقت بنمود ما زفیض قدم اوست کہ ایماں داریم

شمس تبریز کے غائب ہونے سے مولانا کو سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے شمس تبریز کی محبت میں۔ بہت اشعار کہے۔ ہر شعر سے ان کی محبت اور درد کا اظہار ہوتا ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

روسر بنہ ببالین تنہا مرارہا کن ترک من خرابے شب گرد مبتلا کن

مائیم وموج سودا شب تابروز تنہا خواہی بیا بنخشا خواہی بر وفا کن

از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی بگزیں رہ سلامت ترک رہ بلا کن

مائیم آب دیدہ در کنج غم خزیدہ برآب دیدۂ ما صد جائے آسیا کن

مولانا کا سارا کلام عشق ومحبت سے لبریز ہے اور عشق ہی سے تمام روحانی امراض کو شفا ملتی ہے۔ چنانچہ وہ عشق کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت وناموس ما اے تو افلاطون وجالینوس ما

علامہ اقبال (1877 تا 1938)

علامہ اقبال اردو کے علاوہ فارسی کے بھی بہت بڑے شاعر تھے اور فارسی زبان میں ان کے اشعار کے کئی مجموعے ہیں جن میں اسرار خودی۔ رموز بیخودی۔ جاوید نامہ۔ پیام مشرق۔ زبور عجم اور ارمغان حجاز کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں کئی جگہ جلال الدین رومی سے اپنے گہرے تأثر کا اظہار کیا ہے اور ان کے خیام میں رازی کے مقابلے میں رومی کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ اقبال ایک پیامبر شاعر تھے۔ ان کا سارا کلام اصلاح وتجدید کا پیغام ہے اور وہ رومی کی اتباع کرتے ہوئے عشق کی طاقت کے قائل اور معترف ہیں۔ اسی لیے انھوں نے رومی کو اپنا مرشد بنایا ہے، ہر جگہ عشق کی تعریف کی ہے، عشق کے مقابلے میں عقل اور علم دونوں کو کم رتبہ قرار دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

عقل اندر حکم دل یزدانی است چوں زدل آزاد شد شیطانی است

اوراسی طرح سے انھوں نے کہا ہے ؎

علم بی عشق است از طاغوتیاں علم باعشق است از لاہوتیاں

عقل کے لیے لازم ہے کہ ادب خوردۂ دل ہو۔ جب ایسا ہوتا ہے تو عقل اور عشق ایک دوسرے کی توثیق کرتے ہیں اور عقل وعشق کی ہم آہنگی تجدید حیات وکائنات کا باعث بنتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

زیر کی از عشق گردد حق شناس کا رعشق از زیر کی محکم اساس

خیز و نقش عالم دیگر بنہ عشق را بازیر کی آمیز دہ

اقبال نے فارسی شاعری کو اس لیے اختیار کیا کہ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر ایران اور ان ملکوں کے مسلمانوں کو خطاب کر سکیں جو فارسی سمجھتے ہیں۔ اقبال کے یہاں پیغام ہے۔ دعوت عمل۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جوش اور وفور شوق بہت ہے، اس وفور شوق کے اظہار کے لیے ان کو اردو سے زیادہ فارسی زبان سازگار نظر آتی ہے۔ فارسی کی بہت سی نظموں میں اقبال کا جوش اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور جذبہ کی شدت اپنی انتہا پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے فارسی کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ا بر بہاری خیمہ اندر وادی وصحرا صدائے شاخساراں از فراز کوہسار آمد

بہ مشتاقاں حدیث خواجہ بدر وحنین آور تصرف ہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

دگر شاخ خلیل از خون ما نمناک می گردد ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد

سر خاک شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم کہ خونش بانہال ملت ما سازگار آمد

خوبصورت منظر۔ لب جو مرغ زار اور نباتات کی دنیا ہر شاعر کو متاثر کرتی ہے لیکن کشمیر میں یہ ساری خوبصورتی بہت زیادہ دل نواز اور اثر کن ہو جاتی ہے۔ شاعر نے جب سرسبز وشاداب درختوں کو اور خوبصورت پھولوں کو اور ان کے درمیان جوئے آب کو رواں دیکھا تو اس کا دل سراپا جوش بن گیا۔ کشمیر میں بہار کی آمد پر یہ اشعار لکھے گئے ہیں ؎

رخت بہ کاشمر کشا کوہ وتل ودمن نگر سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

باد بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج صلصل وساز زوج زوج بر سر نارون نگر

لالہ زخاک بر دمید موج بہ آبجو تپید خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر
زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگیں بریز قافلہ بہار را انجمن انجمن نگر

اقبال الفاظ درو بست اور بندش سے اور ان کی حرکی قوت سے زیر و بم اور جوش پیدا کرتے ہیں۔ زبور عجم کے یہ اشعار پیش ہیں ؎

اے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز کاشانہ ما رفت بتاراج غماں خیز
از نالہ مرغ چمن از بانگ اذاں خیز ازگرمی ہنگامۂ آتش نفساں خیز
ازخواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

گلچین گیلانی (1910 تا 1972)

یہ بیسویں صدی کا شاعر ہے۔ فارسی ادب اور شاعری نے جدید دور میں داخل ہونے کے بعد نیا لباس زیب تن کر لیا قدیم پوشاک سے دستبرداری اختیار کی۔ اب نئے شعرا میں کئی نام ہیں گلچین گیلانی کا نام ہم نے جدید نمائندہ شاعر کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ یہ بیسویں صدی کا مشہور و معروف شاعر ہے۔ اس کی تعلیم انگلستان میں ہوئی۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ انگلینڈ اور فرانس میں گذرا۔ مغربی شاعری کا اس کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور وہ اس سے متاثر بھی بہت ہے۔ اس کے فکر اور اسلوب دونوں پر مغربی اثر نمایاں ہے۔ اس کی شاعری بڑی حد تک تاثرات اور کیفیات کی شاعری ہے۔ وہ وطن سے دور یورپ کے ملکوں میں رہا لیکن یاد وطن اسے تڑپاتی رہی اور یہ درد اس کی نظموں میں زیریں لہر بن کر پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ لندن میں ایک ایسے گھر کو دیکھ کر جس پر بمباری کی گئی تھے اسے اپنا ویران گھر یاد آتا ہے وہ کہتا ہے ؎

ازتوئ دلم زسوزش جاں
آواز جگر خراش برخاست
ایں خامۂ تار و خیمہ ویراں
آئینہ زندگانی ماست

طرز بیان کی تازگی اور مضامین نو کے فنکارانہ اظہار میں گلچین کو مہارت حاصل ہے، اکثر و بیشتر اس کے پاس ایک نیا احساس وادراک ملتا ہے۔اس کی کئی پرتاثیر اور دردانگیز نظمیں ہیں اس کا ایک شعری مجموعہ ''نہفتہ'' لندن سے چھپا ہے۔اس کی بیشتر نظمیں ''سخن'' میگزین میں شائع ہوئی ہیں اور اسی سے ایران میں اس کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔وہ گیلان میں پیدا ہوا۔تعلیم اس کی تہران میں ہوئی۔لندن میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔اب گلچین بیسویں صدی کا صاحب طرز شاعر ہے۔اس کے شعر میں غنائیت ہے اور ایک خاص آہنگ ہے باران کے عنوان سے اس نے نظم کہی ہے اور وہ اس طرح شروع ہوتی ہے

باز باراں باترانہ
با گہرہائے فراواں
میخورد بر بام خانہ
من بہ پشت شیشہ تنہا ایستادہ
در گذر راہ جویہا راہ او فتادہ

باب ششم

فارسی کے ادیب اور نثر نگار

موضوع کا تعارف

فارسی ادب میں شعر و شاعری کو اسلام کے آنے کے بعد چار چاند لگے۔ اسی طرح سے فارسی نثر کو بھی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں بہت ترقی حاصل ہوئی اور بہت سے ادیب پیدا ہوئے ان ادیبوں نے مختلف علوم وفنون میں اپنی تصنیفات پیش کیں اور فارسی نثر کے بعض شاہکار جیسے تاریخ بیہقی۔ چہار مقالہ۔ کلیلہ ودمنہ۔ تذکرۃ الاولیا وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور کی نثر سادہ اور رواں ہے۔ یعنی تکلفات اور مصنوعی انشا پردازی سے عاری ہے۔ یہ نثر پختہ شستہ اور بلیغ فصیح ہے۔ البتہ عربی زبان وادب کے اثرات سے اس دور کی نثر میں عربی کے الفاظ اور اشعار کثرت سے آ گئے ہیں۔ اس کے بعد جب مغلوں اور تیموریوں کا عہد آتا ہے تو ایران کے ادب میں اور ترقی ہوتی ہے۔ مغلوں کے غلبے کے زمانے میں ایرانی ادبیات و ایرانی تمدن دونوں اپنے کمال پر پہنچ چکے تھے اور بڑے بڑے اہل علم نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کر لیا تھا۔ اس کے بعد جب صفوی دور آتا ہے تو نثری ادب میں تاریخی کتابیں منظر عام پر آتی ہیں، بہت سے تذکرے

اور سوانح کے موضوع پر کتابیں سامنے آتی ہیں۔ مذہب اور فلسفہ کے موضوع پر بھی لٹریچر تیار ہوتا ہے۔ فارسی لغت پر کئی کتابیں منظر عام پر آتی ہیں۔

ابوالحسن غزنوی (352 تا 425ھ)

شیخ ابوالحسن غزنوی ہجویری کی مشہور کتاب ''کشف المحجوب'' ہے۔ یہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی۔ یہ اولین مشہور ترین کتاب ہے جو مشائخ صوفیہ کے حالات اور احوال پر نہایت فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف شیخ ابوالحسن غزنوی ہجویری غزنہ کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ کتاب کا موضوع تصوف ہے۔ لیکن یہ فارسی نثر کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف مفید اور اخلاقی اقوال وحکم آ گئے ہیں۔ بلکہ اس میں عربی اشعار اور مختصر عربی جملے بھی نقل ہوئے ہیں۔ جو تصوف سے متعلق ہیں۔

شیخ ابوسعید (967 تا 1049)

شیخ ابوسعید کی کتاب کا نام ''اسرار التوحید'' ہے۔ یہ صوفیانہ تصانیف میں ایک اہم کتاب ہے، نہایت شیریں فارسی نثر میں لکھی گئی ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے نصف دوم میں لکھی گئی ہے اور کشف المحجوب کے تقریباً ایک سو سال کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں شیخ ابوسعید کی کرامات اور ان کے احوال ومقامات کا تذکرہ ہے۔ کتاب کے اصل مصنف محمد ابن منور ہیں۔ جو شیخ ابوسعید کے اولاد میں ہیں لیکن یہ پوری کتاب شیخ ابوسعید کے اقوال وملفوظات اور حیات سے متعلق ہے اور اس عہد کے دوسرے علما اور مشائخ کا تذکرہ بھی اس کتاب میں آ گیا ہے۔

شیخ فریدالدین عطار (1146 تا 1221)

شیخ فریدالدین عطار جس طرح بہت بڑے شاعر تھے۔ اسی طرح بہت بڑے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی کتاب ''تذکرۃ الاولیاء''۔ کشف المحجوب کی طرح تصوف اور بزرگان تصوف سے متعلق ہے۔ صوفیہ کرام کے اقوال اور ان کی عبادات اور عادات کا تذکرہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مفید نصیحتیں۔ دل پسند حکایتیں اور عبرت انگیز واقعات کو تفصیل کے ساتھ بہت موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اور کشف المحجوب میں معانی اور اسلوب دونوں لحاظ سے بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کی ابتدا کی تصنیف ہے۔

ابوسعید عبدالحی بن ضحاک (433ھ)

شیخ ابوسعید عبدالحیٔ کی مشہور کتاب ''زین الاخیار'' ہے۔ اس کتاب میں مؤلف نے اپنے عہد تک کی ایران کی مختصر تاریخ اور ظہور اسلام کا حال اور خلفا کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ یہ کتاب محمود غزنوی کے بیٹے عبد الرشید کے دور حکومت یعنی 440 ھجری تا444 ہجری میں تالیف ہوئی ہے۔ غزنویوں کی تاریخ کے لیے قرب زمانی کے لحاظ سے اس تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب بھی فارسی نثر کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔

ابوالفضل بیہقی (995 تا1077)

ابوالفضل بیہقی کی کتاب ''تاریخ بیہقی'' فارسی نثر کے اعتبار سے اور تاریخ کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ غزنوی خاندان کے تاریخی واقعات اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ابوالفضل بیہقی نے اکثر واقعات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کا شمار اپنے زمانے کے بہترین نثر نگاروں میں تھا۔ اس نے انیس سال تک غزنوی دربار کے دیوان رسائل میں منشی کی خدمت انجام دی تھی۔ اس لحاظ سے اس نے اپنی یہ کتاب نہایت شستہ۔ فصیح اور ادبی فارسی میں لکھی ہے۔ واقعات کے ذکر کے ضمن میں اس نے مناسب اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور بہت سے عالموں اور ادیبوں کے نام لیے ہیں۔ اس لیے یہ کتاب فارسی نثر کے شاہکاروں اور بہترین نمونوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی اصل میں تیس جلدیں تھیں۔ اب صرف چند جلدوں کے سوا جو ''تاریخ بیہقی'' کے نام سے مشہور ہے۔ باقی سب جلدیں ناپید ہوگئی ہیں۔ جو جلدیں باقی رہ گئی ہیں ان میں سلطان مسعود کے دور حکومت کا حال درج ہے۔ اس کتاب کے مطالب سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ ابوالفضل بیہقی ایک اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیک اور حق پرست انسان تھا۔ اس نے واقعات کے بیان کرنے میں نہایت انصاف اور چھان بین سے کام لیا ہے۔

ابوالحسن علی بن زید بیہقی (499 تا565ھ)

ابوالحسن علی بن زید بیہقی کی مشہور کتاب ''مجمل التواریخ والقصص'' ہے۔ یہ دنیا کی ایک عام مختصر تاریخ ہے۔ اس میں ایران کا خصوصی ذکر ہے۔ اس کتاب میں ابتدائے عالم سے 520 ہجری

یعنی کتاب کی تالیف کے سال تک کے واقعات درج ہیں۔ واقعات کے ضمن میں بہت سے قصے اور داستانیں بھی اس میں آ گئے ہیں۔ اس کتاب کا فارسی نثر کے گراں بہا آثار میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں بیہق کی تاریخ اور اس علاقے کے بزرگوں اور دانشمندوں کے حالات بھی آ گئے ہیں۔

ابوبکر محمد راوندی (559 تا 603ھ)

ابوبکر محمد راوندی کی کتاب کا نام ''راحت الصدور'' ہے۔ یہ کتاب سلجوقیوں کی پوری تاریخ ہے، فارسی کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں ایران کے سلجوقیوں کی ابتدا سے لے کر خوارزم شاہیوں کے ہاتھوں حکومت کے زوال تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ راحت الصدر کا مصنف ابوبکر محمد راوندی کا شان سے قریب مقام راوند کا رہنے والا تھا۔ اس نے خود سلجوقی دربار دیکھا تھا اور عراق کے سلجوقیوں کے آخری حکمراں طغرل بن ارسلان کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنی کتاب چھٹی صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے۔ راحت الصدور کو نہ صرف سلجوقیوں کی تاریخ ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے بلکہ اس سے ادبی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے مؤلف نے بہت سے شاعروں اور علما و فضلا کے نام لیے ہیں اور ان کے اشعار اور قصیدے بھی نقل کیے ہیں۔ اس میں بہت سے عربی امثال کا بھی اندراج ہے۔ اس کتاب میں مصنف کے کئی قصیدے بھی ہیں۔ وہ ایک نثر نگار کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔

خواجہ ابوالعلی حسن بن علی نظام الملک طوسی (1018 تا 1092)

خواجہ ابوعلی حسن بن علی نظام الملک طوسی کی مشہور کتاب سیاست نامہ ہے۔ یہ اولین مشہور فارسی کتاب ہے۔ جو آداب معاشرت اور بادشاہوں اور حاکموں اور وزیروں اور قاضیوں کے اخلاق و سیاست پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں بہت سے اسلامی تاریخ کے فرقوں کا ذکر آ گیا ہے۔ اس لیے تاریخی نقطہ نظر سے اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ سیاست نامے کا طرز انشاء سادہ شیریں اور متین ہے۔ اس کتاب کے مصنف ایرانی وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ سلطان الب ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں منصب وزارت پر فائز رہے۔ انھوں نے یہ کتاب ملک شاہ کی درخواست پر لکھی اور چار سو چوراسی میں اسماعیلیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کچھ پہلے ہی یہ تصنیف مکمل ہوئی۔

امیر کیکاؤس بن اسکندبن قابوس (412ھ)

امیر کیکاؤس کی کتاب کا نام ''قابوس نامہ'' ہے۔مصنف نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لیے پندونصیحت کی غرض سے چوالیس فصلوں میں یہ کتاب لکھی تھی۔ امیر کیکاؤس حکمراں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت سچا نیک اور پارسا انسان تھا۔قابوس نامہ آداب معاشرت۔رسوم دوستی والفت۔ترتیب زندگانی۔کسب فضائل اور تہذیب خصائل پر لکھی گئی ہے۔یہ کتاب 475 ہجری میں یعنی مصنف کی وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے لکھی گئی ہے۔امیر کیکاؤس شاعرانہ ذوق بھی رکھتا تھا۔اس نے اچھے شعر بھی کتاب میں لکھے ہیں۔

امام غزالی(1058ء تا 1111ء)

حجۃ الاسلام امام غزالی نے پانچویں صدی ہجری کے آخر میں ''کیمیائے سعادت'' کے نام سے فارسی زبان میں یہ کتاب تصنیف کی۔یہ کتاب ان کی مشہور زمانہ عربی کتاب ''احیاءالعلوم'' کے بہترین مطالب کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔اس کتاب میں اسلام کی اخلاقی تعلیم کے اصول کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے۔دنیا کے بہت سے ملکوں میں دینی خانوادوں میں ابھی کچھ پہلے تک یہ کتاب بہت اہتمام کے ساتھ۔پڑھی جاتی تھی۔اب جن خانوادوں میں فارسی زبان ختم ہوگئی اب وہاں اس کتاب سے استفادہ بھی بند ہوگیا۔

ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید (555ھ)

ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید کی کتاب ''کلیلہ ودمنہ کا عربی سے فارسی ترجمہ'' ''کلیلہ ودمنہ'' مشہور زمانہ عربی ادب کی کتاب ہے۔جو پہلے سنسکرت زبان سے پہلوی زبان میں منتقل ہوئی۔اس کے بعد عبداللہ بن مقفع نے اس کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔اصل سنسکرت کتاب بھی ناپید ہوگئی اور اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ بھی معدوم ہوگیا۔صرف عربی کتاب کلیلۃ ودمنۃ رہ گئی۔اس ترجمہ میں کہا جاتا ہے کہ کچھ حکایتیں بڑھادی گئی ہیں۔اس کتاب کا فارسی ترجمہ ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید نے کیا ہے۔یہ شخص اپنے زمانے کے عالموں اور ادیبوں میں شمار ہوتا تھا،اس نے یہ ترجمہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں بہرام شاہ غزنوی کے دور حکومت میں مرتب کیا۔نصراللہ نے اس کتاب کو بہرام شاہ کے نام معنون کیا،اس میں فارسی اور عربی امثال اور اشعار کا اضافہ کیا۔اس

نے اس کتاب میں بہت عمدہ نثر لکھی ہے۔اس لیے یہ کتاب فارسی کی ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔نصر اللہ خود شاعر بھی تھا۔اس نے اس کتاب میں عربی اور فارسی اشعار بھی لکھے ہیں۔

ابوالحسن احمد سمرقندی (560ھ)

ابوالحسن احمد سمرقندی جن کا لقب نظامی عروضی ہے۔ایک اہم کتاب ''چہار مقالہ'' کے مصنف ہیں۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔یہ کتاب چار مقالوں پر محتوی ہے۔جس میں علم شعر۔علم نجوم۔ علم طب اور علم دبیری پر مقالات مشتمل ہیں۔ابوالحسن احمد سمرقندی نہ صرف فارسی انشاء اور بلاغت کا استاد تھا بلکہ وہ علم ادب میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا،خود بھی شعر کہتا تھا۔اس کتاب میں اس نے اپنے اشعار بھی لکھے ہیں۔یہ کتاب 550 ہجری میں تصنیف ہوئی اور اس کتاب کو غزنوی شہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام معنون کیا گیا ہے۔ یہ کتاب حسن انشاء طرز سخن اور اسلوب عبارت کے لحاظ سے فارسی نثر کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہے،اس لحاظ سے اس کا پایہ تاریخ بیہقی اور کلیلہ ودمنہ کے برابر ہے۔اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اس زمانے کے بہت سے شاعروں اور دانشوروں کے حالات اور آثار بھی آ گئے ہیں۔اس لحاظ سے اس کتاب کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔خاص طور پر ان شاعروں اور عالموں کے حالات کے لیے جو مصنف کے قریب العہد تھے۔جیسے فردوسی۔عمر خیام وغیرہ۔

رشید الدین محمد وطواط (1088 تا 1182)

رشید الدین محمد وطواط کا شمار چھٹی صدی ہجری کے مشہور شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کی بہت مشہور کتاب ''حدائق السحر فی دقائق الشعر'' ہے۔یہ کتاب شعری صنائع اور بدائع پر لکھی گئی ہے۔یہ کتاب اس موضوع پر قدیم ترین کتاب ہے۔جو اس عہد تک پہنچی ہے۔جبکہ فرخی کی کتاب ''ترجمان البلاغۃ'' اب ناپید ہو چکی ہے۔یہ کتاب بہت بلیغ نثر میں لکھی گئی ہے،اس میں عربی اور فارسی نظم ونثر کے امثال وشواہد بہت کثرت سے آئے ہیں۔اس کتاب کے مصنف کا شمار چھٹی صدی ہجری کے مشہور شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ بلاغت شعری کے موضوع پر یہ بہت اہم کتاب ہے۔جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔

حمید الدین ابوبکر بن محمود (559ھ)

حمید الدین ابو بکر بلخی کی مشہور کتاب مقامات حمیدی ہے۔ یہ مسجع فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس عہد تک عربی ادب کی مشہور کتابیں مقامات حریری اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی بڑی شہرت تھی، ان کے پڑھنے اور پڑھانے کا رواج تھا۔ حمید الدین بلخی نے انھیں کتابوں کو سامنے رکھ کر مقامات حمیدی'' کے نام سے فارسی زبان میں کتاب تصنیف کی ۔ اس کتاب میں 23 مقامات ہیں، یہ کتاب ادبی مضامین۔ مباحثات اور مناظرات پر مشتمل ہے۔ مصنف کے پیش نظر فارسی زبان میں مقالہ نویسی کے طرز کو رواج دینا ہے۔ اس نے بہت مسجع عبارتوں سے کتاب کو مزین کیا ہے۔ مصنف کا شمار مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وصف میں لکھی گئی ہے اور انوری جیسے شعرا نے اپنے کلام میں اس کتاب کی تعریف کی ہے۔

منشی سعد الدین وراوینی

منشی سعد الدین وراوینی آذر بائجان کے رہنے والے تھے انھوں نے ''مرزبان نامہ'' کے نام سے کتاب تصنیف کی ۔ یہ کتاب داستانوں ۔قصوں، حکایتوں اور افسانوں پر مشتمل ہے اور کلیلہ ودمنہ کی طرح بیش تر حیوانوں کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ یہ کتاب بہت فصیح ادبی فارسی میں ہے، فارسی ادب میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔

شیخ سعدی شیرازی (1203 تا 1291)

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ لیکن نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کی حیثیت کسی سے کم نہیں ہے۔ ان کی نثر بہت شیریں رواں ہے اور ان کی نظم کے ہم پلہ ہے۔ ان سے پہلے کسی نے ایسی خوبصورت نثر نہیں لکھی۔ سعدی کی نثر مسجع ہے، اس کا سب سے اچھا نمونہ ان کی کتاب '' گلستاں'' ہے۔ جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کہ وہ ایرانی ادبیات کا گل سرسبد ہے۔ اس شاہکار تصنیف میں سعدی نے صنعت سجع کی خوب داد دی ہے۔ انھوں نے الفاظ کے حسن انتخاب وحسن وزن اور تناسب کو فارسی عبارت میں خوب بٹھایا ہے، اس طرح اپنے پیش رو شجع کہنے والوں جیسے شیخ فرید الدین عطار وغیرہ کے دفتر پر گویا خط بطلان کھینچ دیا ہے۔ شیخ سعدی کی خوبصورت نثر کے آگے پہلے لکھنے والوں کی نثر ماند ہو کر رہ گئی ہے۔ صاحب کلیلہ دمنہ ابوالمعالی

نصر اللہ جیسے نثر کے استاذوں کا اعجاز شیخ سعدی کی نثر کے آگے بے چراغ ہو گیا ہے۔ عام طور پر مسجع عبارتیں تصنع کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی کی مسجع نثر مصنوعی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ان کی عبارتیں آب رواں کی طرح رواں اور آہنگ جاناں کی طرح شیریں اور دل فریب ہیں۔

گلستاں درحقیقت پند و نصیحت اور تہذیب و اخلاق پر لکھی ہوئی کتاب ہے، اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب۔ تربیت اور تہذیب نفس ہے۔ ان کی دوسری کتاب بوستاں کا موضوع بھی تربیت ہے، انھوں نے بہت ہی اہم حقائق جو سودمند ہیں حکایتوں کے پیرایے میں بیان کر دیے ہیں۔

علاء الدین عطا ملک جوینی (623 تا 681ھ)

عطا ملک جوینی کی فارسی کی مشہور کتاب ''تاریخ جہاں کشا'' ہے۔ عطا ملک جوینی مغل امرا، خاص کر ہلاکو خاں کا درباری ملازم تھا، ان کی طرف سے عراق۔ عرب اور دوسرے صوبوں کی حکومت پر مقرر تھا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے، اس کے مصنف نے مغلوں کی عادات و اخلاق۔ ان کی فتوحات۔ ان کے بادشاہوں کے حالات اور خاص کر چنگیز خاں کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ فارسی زبان کی تاریخی کتابوں میں اس کتاب کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ بعد کے تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے اس کتاب کے مضامین نقل کیے ہیں۔

ابو عمر عثمان منہاج الدین (589ھ)

ابو عمر عثمان منہاج الدین جور جان کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہندوستان میں زندگی بسر کی، تین بار ہندوستان کے سلاطین کا سفیر بن کر ایران کا سفر کیا اور اس زمانے کے بہت سے اہم واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ اس کی مشہور کتاب ''طبقات ناصری'' ہے جو فارسی زبان میں ایک اچھی تاریخ کی کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کتاب کے بہترین مضامین وہ ہیں جو ہندوستان کے حکمراں خاندانوں کے حالات پر لکھے ہیں، خود تاریخ ایران بہت سے اہم واقعات جن کا مصنف عینی شاہد رہا ہے بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کا اسلوب متین اور باوقار اور رواں ہے۔

حکیم نصیر الدین طوسی (557 تا 672ھ)

حکیم نصیر الدین طوسی ایران کا مشہور دانشمند اور صاحب قلم ہے اس نے یہ کتاب اسماعیلیوں کے

حاکم ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور کی فرمائش پر لکھی تھی۔ کتاب کی تصنیف میں اس کی پیش نظر ابن مسکویہ کی کتاب طہارۃ الاخلاق فی تہذیب الاخلاق تھی۔ اس عربی کتاب کا یہ آزاد ترجمہ اور خلاصہ ہے اور نصیر الدین طوسی نے اس میں بہت سے اضافے بھی کیے ہیں۔ یہ کتاب 633ھ کے قریب تصنیف کی گئی ہے۔ یہ فارسی کتاب ادب اور انشاء کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ فارسی ادب میں اس کتاب کے علاوہ بھی کئی کتابیں ہیں جو اخلاق فاضلہ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں اور جو انشا پردازی کا نمونہ ہیں جیسے اخلاق جلالی۔ اس کتاب کے مصنف جلال الدین دوانی (متوفی 908ھ) ہیں اور کتاب اخلاق محسنی ہے جس کے مصنف حسین واصف کاشفی ہیں پھر اسی طرح ایک کتاب انوار سہیلی ہے اس کتاب میں بھی اصول اخلاق بیان کیے گئے ہیں اس کتاب کی اصل کلیہ ودمنہ ہے اس کے مصنف بھی ملا حسین واعظ کاشفی ہیں یہ کتاب بھی فارسی ادب کی مشہور کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اس کتاب میں مصنف نے فارسی ادب پر اپنی قدرت اور مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

شرف الدین یحییٰ منیری (661 تا 786ھ)

احمد نام شرف الدین لقب اور مخدوم الملک خطاب تھا۔ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا۔ آپ کا خاندان ہاشمی قریشی ہے۔ آپ کے پردادا مولانا محمد تاج فقیہ اپنے زمانے کے بڑے علما اور مشائخ میں سے تھے۔ جو شام کے شہر الخلیل سے ہجرت کر کے بہار کے مقام منیر میں قیام پذیر ہوئے۔ بعض مصنفین آپ کو شہاب الدین غوری کا ہم عصر بتایا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں یعنی بہار میں حاصل کی، اس کے بعد مولانا شرف الدین ابوتوامہ سے تلمذ حاصل کیا۔ جو شمس الدین التمش کے عہد میں علم و تدریس کے نظام شمسی کے ایک روشن ستارہ تھے۔

آپ کا مطالعہ اور اسباق میں اتنا انہماک تھا اور وقت کی اتنی قدر تھی کہ طلبا اور حاضرین کے ساتھ کھانا اس لیے تناول نہیں فرماتے کہ اس میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ مولانا شرف الدین ابوتوامہ نے یہ انظام کیا تھا کہ آپ کا کھانا آپ کی خلوت گاہ میں پہنچ جایا کرے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے روحانی تربیت کے لیے شیخ نجیب الدین فردوسی سے بیعت کی اور تصوف وعرفان کے مراتب طے کیے۔ خواجہ نجیب الدین فردوسی سے بیعت کے بعد وہ اپنے وطن واپس آ رہے تھے کہ ان کو اپنے شیخ کے انتقال کی خبر ملی۔

تصوف اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند اور علمی اعتبار سے وہ کثیر التصنیف بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات فارسی زبان میں ہیں، اتنی زیادہ ہیں کہ صوفیہ کے حلقے میں کم بزرگ ہیں۔ جن کی اتنی زیادہ تصنیفات پائی جاتی ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول دو کتابیں ہیں ایک مکتوبات صدی اور دوسرے مکتوبات سہ صدی۔ ان مکتوبات کا علمی۔ تربیتی اور ادبی پایہ بہت بلند ہے، معارف وحقائق کے پورے اسلامی ذخیرہ میں۔ خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس میں مجتہدانہ علم ونظر کی ایک پوری دنیا موجود ہے۔ شریعت کی حمایت بہت مؤثر طریقہ سے کی گئی ہے۔

علوم ومعارف کے علاوہ یہ مکاتیب زور قلم۔ قوت بیانی اور حسن انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ان کے بہت ٹکڑے اس قابل ہیں کہ دنیا کے بہترین ادبی نمونوں میں شامل اور ادب عالیہ میں شمار کیے جائیں۔ دنیا کی اکثر زبانوں اور علم وادب کے بارے میں یہ زیادتی کی گئی کہ صرف انھیں شخصیتوں کو ادیب اور انشا پرداز تسلیم کیا گیا ہے جنھوں نے ادب وانشاء کو اپنا پیشہ بنایا اور اظہار کمال کے طور پر منتخب کیا۔ حالانکہ بیشمار تحریریں ایسی ہیں جن کا خاص موضوع شعر وادب کے بجائے اصلاح وتربیت یا تاریخ وسیرت رہا ہے۔ لیکن زبان دانی اور انشا پردازی اور حسن اظہار کے اعتبار سے ان کی تحریریں کسی ایسے ادیب سے کم نہیں ہیں۔ جنھوں نے صرف شعر وادب کے موضوع کو اظہار خیال کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ بڑی کم نگاہی اور بے بصری ہوگی کہ ایسے انشا پردازوں سے صرف نظر کیا جائے جنھوں نے شعر وادب کے سوا کسی اور موضوع کو اختیار کیا اور اس میں نثر کی روانی اور انشاء کی جولانی کا نمونہ پیش کیا۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (971 تا 1034ھ)

حضرت مجدد صاحب نسباً فاروقی ہیں، آپ کا سلسلہ نسب اکتیس واسطوں سے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب تک پہنچتا ہے۔ آپ کی ولادت سرہند میں ہوئی اور شیخ احمد آپ کا نام رکھا گیا تھا، صغر سنی ہی سے آپ میں رشد وسعادت کے آثار نمایاں تھے۔ آپ نے دہلی کے بہت مشہور بزرگ اور مرشد روحانی خواجہ باقی باللہ سے بیعت اور استفادہ کا تعلق قائم کیا۔ اکتساب فیض اور تکمیل کے بعد حضرت مجدد نے سرہند میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ آپ کا فیض عام

ہوا اور طالبین کی تکمیل وارشاد کا کام آپ نے شروع کیا۔ پھر آپ کی طرف رجوع عام ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں جلال الدین اکبر کے بعد نورالدین جہانگیر تخت سلطنت پر بیٹھا تھا۔ اقتدار کے ایوان میں اسلام کی بیخ کنی کے منصوبے پر عمل کیا جارہا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ بیحد مضطرب تھے۔ چنانچہ آپ نے تجدید واصلاحی کام کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بہت سے وزرا اور امرا سلطنت کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجنے شروع کیے۔ ان مکتوبات کی زبان فارسی ہے۔ لیکن بہت موثر اور دلوں کے اندر اتر جانے والی زبان ہے۔ ان مکاتیب کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ یہ مکتوبات بہت انقلاب انگیز ہیں، ان کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ کا دھارا بدل گیا، انھوں نے ہندوستان کو اسلام کے لیے دوبارہ بازیاب کیا۔ اسی لیے مجدد سرہندی کے بارے میں اقبال نے یہ کہا۔

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

مجدد الف ثانی نے اپنا یہ تجدیدی کارنامہ تربیت واصلاح کے ذریعہ اور مکتوب نگاری کے ذریعہ انجام دیا۔ ان مکتوبات کا موضوع توحید اور حقائق دینی کا اثبات اور نبوت کے کارناموں کا اظہار اور صفائی نفس ہے۔ لیکن یہ مکتوبات اچھی انشاء کا بھی نمونہ ہیں، اسی لیے آج بھی ان مکتوبات کو پڑھتا ہے وہ لازمی طور پر ان سے متاثر ہوتا ہے۔ ان مکتوبات کے ترجمے بھی موجود ہیں جس طرح سے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے ترجمے موجود ہیں، جو لوگ زبان فارسی میں مہارت نہیں رکھتے ہیں وہ ان مکتوبات کے ترجموں سے آج بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ادب وانشاء کے ذریعہ جن لوگوں نے تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے ان میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور مجدد الف ثانی کا نام بہت اہم ہے۔

بزرگ علوی (ولادت 1970)

جدید فارسی ادب میں بزرگ علوی کا نام لیا جاتا ہے دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح فارسی ادب میں بھی مغربی ادب کے زیر اثر نئے اصناف سخن در آئے ناول، افسانے اور ڈرامے۔ ناول نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے بزرگ علوی کا نام مشہور ہے۔ اس نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کے تین مجموعے سامنے ہیں ایک ''چمدان'' اور دوسرے ''ورق پارہ زنداں''

اور ''نامہا''۔علوی نے مختصر کہانی کی تکنیک کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔علوی اپنے فن کے ذریعہ سماج کی اخلاقی گراوٹ کو دور کرنا چاہتا ہے۔وہ شاعر اور ادیب کو سماج کا رہنما سمجھتا ہے۔ اس نے انگریزی فرانسیسی اور روسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے فن کی نئی تکنیک سے وہ پورے طور پر واقف تھا۔اس کی وہ کہانی جو بہت مشہور ہوئی ہے وہ ''عروس ہزار داماد'' ہے یہ لفظ حافظ شیرازی کے اس شعر میں آیا ہے ۔

مجو درستی عہد از جہان مست نہاد
کایں عجوز عروس ہزار داماد است

باب پنجم اور ششم کے مراجع اور مصادر

1۔حیات سعدی الطاف حسین حالی
2۔ سخندان فارس محمد حسین آزاد
3۔ شعر العجم علامہ شبلی نعمانی
4۔ تاریخ ادبیات ایران ڈاکٹر رضازادہ شفق

اردو زبان وادب، عربی زبان وادب اور فارسی زبان وادب کی تاریخ، ان میں سے ہر ایک پر کتابیں موجود ہیں۔ لیکن اب تک کوئی کتاب ایسی نہیں تھی۔ جس میں سارے جلوے ایک جگہ جمع ہو گئے ہوں اور تینوں زبانوں کی ادبیات کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اسی صورت کی تکمیل کے پیش نظر پروفیسر محسن عثمانی نے ''مشاہیر ادبیات مشرقی'' تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں اردو، عربی اور فارسی کے تقریباً دو سو سے زائد شعرا و ادبا کا تذکرہ ہے۔ مذکورہ کتاب اردو، فارسی اور عربی نظم ونثر کے آغاز وارتقا، لسانی، موضوعاتی اور نظریاتی مباحث وغیرہ کے حوالے سے مزین ہے۔ محسن عثمانی نے اردو، عربی اور فارسی کے نمائندہ شاعروں اور نثر نگاروں کا عمدہ انتخاب کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ''مشاہیر ادب مشرقی'' سے مشرقی ادب کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے، ہر زبان کے ادب کے لیے نظم اور نثر دونوں کا تذکرہ الگ الگ باب میں کیا گیا ہے، اس کتاب سے نظر میں وسعت پیدا ہوگی اور کسی زبان کے شاعر اور ادیب کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے علم کا سمندر ہے ساتھ ساتھ یہ کتاب مشرق کی تین بڑی زبانوں کے شاعروں اور نثر نگاروں کے حوالے سے اہم معلوماتی دستاویز بھی ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی معروف صاحب قلم ہیں اور ان کی پچاس کتابیں مختلف موضوعات پر منظر عام پر آچکی ہیں۔ اردو ادب سے متعلق ان کی کتاب ''نقد شعر وادب'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اور ''کلیم احمد عاجز، وہ ایک شاخ نہال غم'' ہدیٰ پبلیکیشن حیدرآباد نے شائع کی ہے۔ وہ سہ ماہی مطالعات (دہلی) اور سہ ماہی کاروان ادب (لکھنؤ) کے مدیر بھی ہیں۔ ''مشاہیر ادبیات مشرقی'' اپنی نوعیت کی ایک دلچسپ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک سنگم بھی ہے جس میں تینوں دریا آکر ملتے ہیں۔ چونکہ یہ تینوں مشرقی زبانیں ایک دوسرے سے قریب ہیں اس لیے ان تینوں زبانوں کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے یہ کتاب معلومات کا خزینہ ثابت ہوگی۔

ISBN 978-93-87510-72-2
9 789387 510722
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی-110025

قیمت -/105 روپے